# تیمور پولاتوف

# دوسرا سفر

ہردلعزیز سوویت ادیب تیمور
پولاتوف ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے
ہیں۔ ان کی پہلی تصنیف پچیس
سال کی عمر میں منظر عام پر
آئی۔ اس کے بعد سے اب تک
اس مجموعے کا مصنف اپنی کئی
کتابیں شائع کر چکا ہے جو
ماہرانہ انداز بیان اور
دلچسپ پلاٹوں کی بنا پر قارئین
کی توجہ اپنی طرف مبذول
کراتی ہیں۔

تیمور پولاتوف

# دوسرا سفر

**تین ناولٹ**

دارالاشاعت ترقی • تاشقند شاخ
۱۹۷۹ء

## ترتیب

کچھ مصنف کے بارے میں

جنگل میں مجھے آواز دو

دوسرا سفر

نگراں چوکیاں

ترجمہ: منظر سلیم
ڈیزائن اور خاکے:
لی الیکسانڈر

ТИМУР ПУЛАТОВ

**ВТОРОЕ ПУТЕШЕСТВИЕ КАИПА**

Романтические повести

*На языке урду*

ТЕМУР ПЎЛАТОВ

**ҚАИПНИНГ ИККИНЧИ САФАРИ**

سوویت یونین میں شائع شدہ

© اردو میں ترجمہ۔ باتصویر۔ جملہ حقوق بحق
دارالاشاعت ترقی تاشقند شاخ محفوظ۔ ۱۹۷۹ء

П $\frac{70303-172}{016(01)-79}$ 774—79 4702570200

## کچھ مصنف کے بارے میں

بخارا جہاں تیمور پولاتوف ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے، زمانۂ قدیم ہی سے مختلف نسلوں اور قومیتوں کا شہر رہا ہے۔ انقلاب سے قبل جب یہ بخارا امارت کا صدر مقام تھا، یہاں تاجک، ازبیک اور ترکمان لوگ رہتے تھے...

پولاتوف خاندان کو تاجک زبان (فارسی) آتی تھی جو فردوسی، عمر خیام اور سعدی کی زبان ہے۔ خاندان میں ازبیک زبان بھی بولی جاتی تھی جو عظیم نوائی* کی زبان ہے۔ تیمور پولاتوف اس شہر اور اس خاندان میں پیدائش کی بدولت بچپن ہی میں کئی زبانوں سے واقف ہو گئے۔ بعد میں ان کی تعلیم شروع ہوئی تو انہیں روسی بھی آ گئی۔ یہی زبان ان کی آرزوؤں اور امنگوں کی تکمیل کی زبان بن گئی: اس زبان میں مہارت حاصل کرکے انہوں نے روسی کے ساتھ ہی ساتھ عالمی ادبیات کی دنیا میں بھی قدم رکھا اور انہیں فرانسیسی، برطانی، جرمن، امریکی اور دوسری قوموں کے ادیبوں کی بہترین تصانیف کے روسی ترجمے پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ اسی زبان کے ذریعے گارسیا لورکا، سینٹ ایکزیوپری، کامو، ہیمنگوئے، پبلو نرودا، یاروسلاو گاشیک، برتولد برخت، ریمارک میتس‌کیوچ، لیو تالستائی، انتون چیخوف، میخائیل شولوخوف اور ایمانوئیل کزاکیوچ کے افکار و خیالات سے روشناس ہوئے۔ نتیجتاً تیمور پولاتوف کو روسی زبان

* عظیم ازبیک شاعر اور مفکر (۱۴۴۱ء — ۱۵۰۱ء)۔ اڈیٹر۔

نرودوف" ("اقوام کی دوستی") میں ان کا ایک اور ناولٹ "دوسرا سفر" شائع ہوا جو ادبی طور پر ان کی زبردست ترقی کا شاھد ہے۔ اس میں تیمور پولاتوف کا اسلوب نگارش متوازن اور اختصارپسند ہے... گہرا پانی وحشی کوہستانی ندیوں کے پانی کے بہ‌نسبت ظاہر ہے کہ زیادہ پرسکون ہوتا ہے۔ اسلوب کی اس اختصارپسندی ہی سے زندگی اور موت اور لوگوں کے خیالات و اقدامات کے متعلق مصنف کے غوروفکر کی گہرائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہی فلسفیانہ طرز بیان ہے جسے مشرقی ادب کی خاصیت تصور کیا جاتا ہے۔ تیمور پولاتوف کا یہ ناولٹ سعدی کی جاوداں حکایات "گلستان" کی فلسفیانہ روایت کا آئینہ‌دار ہے۔ مصنف نے اس روایت کو بڑی حد تک پوشیدہ رکھتے ہوئے اپنے خاص کردار کے غیرمربوط اور اکثر بھولے بھالے خیالات کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی کی سات سو سال قبل لکھی ہوئی حکایات ایک قدیم روایت کے نمونے ہیں جن میں آج کے قارئین کو کچھ فرسودگی سی نظر آتی ہے۔ تیمور پولاتوف کی تخلیقات میں اس روایت کا امتزاج اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ انہوں نے سعدی کی تقلید کی ہے یا وہ سعدی کی تحریروں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ دراصل انہوں نے سعدی کی فنی روایت کو نئے انداز میں پیش کیا ہے جو زندگی کے رنگارنگ دھارے کی ترجمانی کی فکر کا نتیجہ ہے کیونکہ بخارا کے اس ادیب کو بچپن ہی سے اس کی فکر تھی۔ یہی صلاحیت بعد میں مصنف کی کامیابی میں معاون ثابت ہوئی اور اس نے ان کے فن کو متاثرکن قوت عطا کی۔

تیمور پولاتوف کے ناولٹ "دوسرا سفر" میں جب ہم طوفانی لہروں‌والے بحیرۂآرال میں بوڑھے قائپ کے کشتی پر سفر کے متعلق پڑھتے ہیں تو ہمیں بےاختیار ارنسٹ ہیمنگوئے کے ناول "بوڑھا اور سمندر" کے واقعات یاد آ جاتے ہیں۔ ہیمنگوئے کے فن کی یہ آمیزش بھی اس بات کا ثبوت نہیں کہ پولاتوف نے ان کی تقلید کی ہے۔ مشابہت دراصل کرداروں کی ذاتی خصوصیات کی بنا پر نظر آتی ہے کیونکہ قائپ کے ازبیک مچھیرا ہونے پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔

تخلیقی دنیا میں تیمور پولاتوف کے سفر کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ مستقبل میں انہیں ثمردار وادیوں، ڈھلواں پہاڑی راستوں،

اتنی زیادہ پسند آئی کہ انہوں نے اسی زبان میں سوچنا شروع کر دیا۔ بخارا میں اساتذہ کے تربیتی انسٹی‌ٹیوٹ سے فارغ‌التحصیل ہوکر ایک اسکول میں روسی پڑھانے لگے اور تھوڑے ھی دنوں بعد اپنا پہلا ناولٹ "راستے کے کنارے کنارے نہ چلو" بھی روسی ھی میں لکھا۔

ماسکو کے رسالوں نے تیمور پولاتوف کے اس ناولٹ کو شائع نہیں کیا کیونکہ اس کا موضوع فرسودہ اور گھسے پٹے پرانے سکے جیسا تھا: ایک ازبیک طالب علم ایک روسی لڑکی سے محبت کرتا ھے اور ان کے رشتے‌دار ان محبت کرنے‌والوں کی شادی کے خلاف ھیں۔ تیمور پولاتوف نے اس دور کے مقبول‌ترین ادبی معیاروں کو اپنانے کی کوشش کے بجائے زندگی کا منہ چڑھانے کی ھمت کی تھی تو وہ اس موضوع کو بھی اسلوب کے لحاظ سے نئے رنگ و آھنگ کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔

لیکن ایک مبتدی ادیب کی حیثیت سے ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ ان کو تو صاف کاغذ کا ھر ورق اتنا ھی چکنا نظر آتا تھا جتنی پہلی بار اسکیٹنگ کرنے‌والے کو برف چکنی نظر آتی ھے!

تیمور پولاتوف کی زیر نظر کتاب میں ان کا یہ پہلا ناولٹ شامل نہیں ھے۔ یہ کتاب تخلیقی دور کے اعتبار سے مصنف کے دوسرے ناولٹ "جنگل میں مجھے آواز دو" سے شروع ھوتی ھے جو کم‌سن لڑکے مغدی، اس کی ماں نورا، باپ انور اور "چچا" ایرکن کے بارے میں ھے۔ اس کی کہانی سات‌سالہ مغدی کی زبان سے بیان کی گئی ھے جو لوگوں کے پیچیدہ‌ترین تعلقات اور کرداروں کو جنہیں وہ نہیں سمجھ پاتا، دل سے محسوس کرتا اور غصے، جوش اور سادگی سے ان کا اندازہ لگاتا ھے۔ مغدی کا طرزگفتگو اکھڑا اکھڑا اور بےربط سا ھے اس لئے قارئین کو اس کی باتوں پر غور کرنے اور ان کا اصلی مفہوم سمجھنے کا موقع ملتا ھے۔

ناولٹ "جنگل میں مجھے آواز دو" جو ۱۹۶۶ء میں ماسکو میں شائع ھوا تھا، مصنف کے ابتدائی دور کی تخلیق ھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ھی ساتھ تیمور پولاتوف بھی ذھنی ارتقا کی منزلیں طے کرتے رھے۔ ۱۹۶۹ء میں ماسکو کے رسالے "دروژبا

# جنگل میں مجھے آواز دو

ریگ‌زاروں، فلک‌بوس پہاڑوں کی برف‌پوش چوٹیوں اور تیان‌شان کے تیز دریاؤں کے بارے میں لکھنا ہوگا۔ زیر نظر کتاب ان کی پہلی کتاب ہے۔ سوویت یونین کے ایک نوجوان ادیب کی حیثیت سے انہیں سارے ملک میں کامیابی اور ان تمام قارئین میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے جنہیں روسی زبان آتی ہے۔

یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تیمور پولاتوف کے ناولٹ رومانی احساسات سے سرشار ہیں۔ مصنف اپنے کرداروں کو کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ افراد کی ذاتی خصوصیات کا نمائندہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرز فکر کی روشنی میں ان کے کردار کسی حد تک فرضی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کرداروں کو بھولے بھالے، سیدھے سادے لوگوں کے جذبات و احساسات عطا کئے ہیں۔ یہ کردار سوچتے رہتے ہیں کہ انسان کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے؟ قدیم زمانے کے مصوروں نے درختوں کو سرخ اور دریا کے پانی کو سبز رنگ کیوں دیا؟ وہ اور بھی بہت سی چیزوں اور باتوں پر غور و خوض کرتے ہیں... قدیم مشرقی مصنفین کے برعکس تیمور پولاتوف اپنے قارئین کو کچھ سمجھانے سکھانے اور کوئی مخصوص طریقہ اپنانے کا مشورہ دینے میں عجلت نہیں برتتے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ قارئین کو اپنے کرداروں کے ساتھ زندگی کی فکر کرنے، کسی بات پر بحث کرنے، کسی کا مذاق اڑانے اور کچھ اعتراف کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

یہی ان کی اس کتاب کی خاصیت ہے لیکن یہ خیال غلط ہوگا کہ تیمور پولاتوف کے کردار خود ان کے خیالات اور امنگوں کے آئینہ‌دار ہیں۔ تیمور پولاتوف میں جو ہمارے ہم‌عصر، ایک ٹیچر اور مصنف ہیں اور ریگستان میں رہنےوالے ولی بابا میں جو ناولٹ "نگراں چوکیاں" (۱۹۶۹ء) کا کردار ہے، یا بوڑھے مچھیرے قائپ میں کیا ہم‌آہنگی ہو سکتی ہے؟

میرا خیال ہے کہ تیمور پولاتوف کی تخلیقی آواز سوویت یونین کے کثیر قومی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ظاہر ہے اصلی قابلیت کا آغاز عام کرداروں سے تو نہیں ہوتا۔

وادیم لوکاشیوچ

## ۱

میرے ہم‌عمروں کو یہ ظاہر کرنے کا بڑا شوق ہے کہ وہ جنگ کے زمانے کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ان کے پاس کئی اہم جواز بھی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ انہیں جنگ* کا پہلا دن یاد ہے۔

ویسے سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی لمحے کو جھیلنے کے وقت یہ لوگ بہت ہی چھوٹے تھے۔ ان میں سے پچاس فیصد نے بولدان پر بیٹھ‌کے پاخانہ کرنا ابھی ابھی سیکھا تھا اور باقی اپنے پوتڑوں میں پیشاب کرکے زور زور سے رونے چلانے کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن یہ بات نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ بنیادی بات تو ماؤں اور دادیوں کی کہانیوں سے یہ جان لینے کی ہے کہ جنگ کے پہلے دن یعنی ۲۲ جون کو کس نے کیا کیا تھا۔ اور بس۔ خود کو زمانۂ جنگ کی نسل کا فرد کہنے کے لئے یہ بہت کافی ہے...

ان سبھوں کے لئے ذاتی پنشن مقرر کی جاتی تو مجھے پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی۔ محض اس لئے کہ مجھے جنگ کا پہلا دن یاد ہی نہیں۔ جانے کیوں میرے ننھے سے دماغ میں اس پہلے دن کی یاد محفوظ نہ رہ سکی۔ پنشن مقرر کرنے‌والے کمیشن کے سامنے میں

---

* جرمن فسطائیت کے خلاف سوویت لوگوں کی آزادی کی عظیم جنگ (۱۹۴۱ء - ۱۹۴۵ء)۔ اڈیٹر۔

ہمارے گھر میں چار کمرے ہیں۔ تین چھوٹے چھوٹے کمروں میں ہم تینوں الگ الگ سوتے ہیں۔ چوتھا بڑا کمرہ سردیوں میں بہت ہی ٹھنڈا اور خالی پڑا رہتا ہے۔ گرمیوں میں البتہ امی اس کی دیوار پر کوئی دو سو سال پرانا قالین ٹانگ دیتی ہیں۔ یہ ہمیں خالہ‌جان کی خالہ سے ورثے میں ملا ہے اور اس میں کچھ نہیں تو دو سو سوراخ تو بہرحال ہوں‌گے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر سال ۳۱ دسمبر کو کوئی شخص جان بوجھکے اس میں ایک نئے سوراخ کا اضافہ کر دیتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ قالین کمرے کی آرائش و زیبائش کا باعث بنا رہتا ہے۔

گرمیوں میں اسی کمرے کے ایک گوشے میں ایک صندوق بھی رکھا رہتا ہے۔ اس پر ایک دو نہیں، تیس رضائیاں تلے اوپر کچھ یوں ڈھیر رہتی ہیں کہ سب سے اوپروالی رضائی چھت سے گلے مل جاتی ہے۔ انہیں کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہ تو محض کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ اور اس بات کا انتظار کرتی رہتی ہیں کہ کبھی نہ کبھی بیک وقت تیس مہمان آئیں‌گے اور ہر ایک کو الگ الگ رضائی میں سونے کا موقع میسر ہوگا۔

ہمارے گھر میں صرف ایک ہی خرابی ہے: ساری کی ساری کھڑکیاں صحن ہی کی طرف کھلتی ہیں۔ سڑک پر جو کچھ ہوتا ہے اس کا گھر کے اندر سے پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ صحن کاھے کو ہے، یوں سمجھئے کہ "علی بابا، چالیس چور" کی کہانی‌والا قلعہ ہے۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا اور غیروں کی نگاھوں سے پوری طرح محفوظ۔ کوئی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرے تو ناک ہی سے ھاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ہمارا ہی کیا، سارے ھمسایوں کے مکانات اسی قسم کے ہیں۔ ویسے میں بحث کرکے آپ کو قائل کر سکتا ہوں کہ آپ سارا شہر چھان ماریں تب بھی ہمارے گھر جیسا دوسرا گھر کہیں نظر نہ آئےگا۔

شاید بہتر ہی ہوگا کہ میں اپنے محلے کے حالات پر روشنی نہ ڈالوں۔ ویسے بھی میں اس چیز کا تذکرہ کبھی نہیں کرتا جو مجھے ناپسند ہو۔ اس کے علاوہ میرے لئے تمام باتوں کو یکے بعد دیگرے بیان کر دینا ضروری کیوں ہو؟ کتنا مضحکہ‌خیز ہوگا یہ اقدام!

میں پڑوسیوں کے متعلق بھی کچھ نہ بتاؤں‌گا۔ وہ سب بالغ افراد

لاکھ جھوٹ بولتا، کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوتا۔ سوا اس کے کہ مجھے دروازے سے باہر نکال دیا جاتا۔

جنگ مجھے اکتالیسویں دن سے یاد ہے لیکن اس سلسلے میں بھی پنشن کے نام پر کچھ بھی تو ہاتھ نہ لگتا: ہاں تو جنگ کا وہ اکتالیسواں دن...

میرا نام مغدی ہے۔ یکم ستمبر کو میری عمر کے سات سال پورے ہونے میں کوئی دس ہی دن باقی رہ جائیں گے لیکن ان دس دنوں کی کمی ہی کی وجہ سے اسکول میں غالباً میرا داخلہ نہ ہو سکے گا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی الجھن یہی ہے۔

میری امی ڈاکٹرنی ہیں۔ ان کے چہرے مہرے سے ہمیشہ ہی ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے دنیا میں ساری چیزیں بہت ہی عمدہ اور شاندار ہوں۔ سبب غالباً پڑوسیوں کی یہ رائے ہے کہ میری امی محلے کی سب سے خوبصورت اور دلکش خاتون ہیں۔

رہے ابو، تو نانا کا خیال ہے کہ انہیں کسی نہ کسی دن ضرور قید کر لیا جائے کیونکہ وہ بقول نانا اپنے ماتحتوں سے "ضرورت سے زیادہ نرمی" سے پیش آتے ہیں۔ ابو دراصل چھوٹے سے افسر ہیں۔ ان کی ماتحتی میں دس آدمی کام کرتے ہیں جو دن بھر بجلی کے کھمبوں پر چڑھ چڑھ‌کے فیوز ہونے‌والے بلب بدلتے رہتے ہیں۔

خود نانا نے کوئی خلص کارنامہ نہیں انجام دیا۔ گاؤں میں رہتے اور نہایت ہی خوش‌ذائقہ سردے پیدا کرتے ہیں۔ بڑے مسخرے اور کسی حد تک چالاک آدمی ہیں۔ ان کے متعلق تو جانے کتنی ہی دلچسپ باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن اس قصے کو کسی دوسرے موقعے کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

نانی کبھی ان کی بیوی تھیں لیکن بے‌چاری خدا کو پیاری ہو چکی ہیں۔ مرتے وقت وصیت کر گئی تھیں کہ انہیں حتی‌الامکان کم سے کم یاد کیا جائے تاکہ قبر میں وہ سکون کے ساتھ لیٹی رہیں۔

میرے ایک ماموں بھی ہیں جن پر فخر کرتا ہوں۔ وہ یہاں سے جانے کتنی ہی دور محاذ پر لڑ رہے ہیں۔ جنگ ختم ہوگی، وہ واپس آئیں‌گے اور میں ان کے ساتھ مل‌کر ایک بار پھر وہ گیت چھیڑوں‌گا جس کے بول ہیں: "آزور جزائر پر جہاں مسرت ہی مسرت ہے، ہریالی ہی ہریالی..."

بالغوں کے متعلق چند ہی الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں انہیں پوری طرح سمجھ ہی نہیں پاتا۔ ہاں، یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ اچھے لوگ ہیں۔ بری بات صرف یہ ہوئی ہے کہ جنگ چھڑ گئی...

... تو یہ جنگ کا اکتالیسواں دن ہے...

سورج کی کرنیں میری بائیں آنکھ پر پڑیں اور اسے گدگدانے لگیں تو میں فوراً ہی جاگ اٹھا۔ احتیاط کے ساتھ ہاتھ کو چہرے پر پھیلایا، کرنوں کو مٹھی میں سمیٹا اور انگلیوں کو ٹیوب کی شکل میں جماکر سورج کو دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے کرنوں کی نیلی، سرخ اور پیلی سوئیاں میرے ہاتھ میں ناچنے لگیں۔ لیکن اچانک اس ٹیوب میں ایک سیاہ دھبے کو دیکھکر سہم گیا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے پہلے پلنگ میں اور پھر کمرے میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز گونجی اور انگور کی بیل پر لٹکے ہوئے چھوٹے سے لاؤڈ اسپیکر پر ابو کی تحکمانہ آواز سنائی دی:

"صبح کی ورزش کے لئے کھڑے ہو جاؤ! ہاتھ کولھوں پر رکھو! پیروں کو برابر کرو!"

"ارے، یہ تم کہاں چل دئے؟" میں نے امی کی آواز سنی۔ "آؤ، آؤ، ورزش سے نہ گریز کرو!"

میں تیزی سے لپکتا ہوا باہر نکلا اور دروازے کو زور سے بند کر دیا۔

سیاہ دھبا تو ڈاکیے کا سر ثابت ہوا۔ خط آیا ہے، خط! ہمارے لئے خط آیا ہے۔ ڈاکیے کا خوشخبری لےکے ہمارے یہاں آنا کتنی اچھی بات ہے! مجھے کتنا پسند ہے!

... مرات، میں نے تمہارے والد کو پہلے پہل اسی روز دیکھا۔ وہ اپنے تھیلے کو زمین پر رکھے ہوئے کھڑے تھے اور ان کا چہرہ بےحد اداس تھا...

"ارے، تمہارے ماموں کہاں ہیں؟" انہوں نے کچھ عجب انداز سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ماموں؟ ماموں تو محاذ پر لڑ رہے ہیں... انہی کا خط ہے کیا؟ لائیے مجھے دے دیجئے۔ اسے کھوؤں گا تھوڑی۔"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مجھے اپنے قریب کھینچ کے

ٹھہرے، ان کے متعلق کچھ بتانا ھی ھو تو محلہ کمیٹی کے صدر بتائیں۔ اور آپ یقین کیجئے کہ وہ بتائیں گے بھی۔ بتائیں گے کہ کون چغل‌خور ھے، کون کس سے جھگڑتا ھے، کس نے کس سے شادی کر لی اور کس نے کس کو "بخارا بھر کا بےوقوف" قرار دیا۔

میں اپنے محلے کے بارے میں اگر کچھ بتاؤں‌گا بھی تو صرف اپنے ھم‌عمروں کے متعلق۔ ان میں چھ... نہیں نہیں، سات لڑکیاں شامل ھیں اور مجھے چھوڑکے دو لڑکے۔ سب کے سب بالکل میری ھی عمر کے۔ لڑکیوں کے لڑکوں سے دوستی کرنے کا سوال ھی نہیں اٹھتا۔ والدین اس کی اجازت ھی کب دیتے ھیں۔

میں اپنے محلے کے بارے میں اگر کچھ بتاؤں‌گا بھی تو صرف لڑکے بس دو ھی ھیں۔ ایک کا نام بہرام ھے جسے میں نے صرف دو بار دیکھا ھے۔ بےچارہ آنت اترنے کے مرض میں مبتلا ھے اور شاید ھی کبھی باھر نکلتا ھو۔ دوسرے کا نام قادر ھے جس سے میری دوستی بھی ھوئی اور جھگڑا بھی۔ اس نے میرے ابو کو بزدل اور فوجی بھگوڑا کہا۔ ڈینگ ماری کہ میرے ابو کی تو محاذ پر جانے کی ھمت نہیں پڑتی اور خود اس کا باپ بہادر ھے، تلوار سے دائیں بائیں وار کرکے جرمنوں کے سر قلم کر رھا ھے۔ میں نے اسے دوستانہ اور مخلصانہ انداز سے سمجھانے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ احمق اپنی بات پر ڈٹا رھا۔ آخر مجھ سے نہ رھا گیا اور اپنے مکوں سے اس کی خبر لے لی جس سے اس کی آنکھ کے نیچے نیل پڑ گئے۔ مگر وہ تو لڑکیوں جیسی حرکت پر اتر آیا اور میری ناک نوچ لی۔ اب آخر اس کے بعد بھی اسے دوست کیسے کہہ سکتا ھوں، خاص طور پر اس لئے اور بھی کہ اسے جھگڑا کرنے تک کا سلیقہ نہیں؟

ھاں تو جنگ— ھر طرف، ھر جگہ ایک ھی چرچا ھے، جنگ! جنگ! لیکن کوئی بھی ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتا کہ آخر یہ ھو کیا رھا ھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، حالات خوشگوار تھے پر اتنے میں جانے کیا ھوا کہ لوگ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ سب کی خوشگوار ذھنی کیفیت اور زندگی چوپٹ ھوکے رہ گئی۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ کرنے اور گھبرا جانے کے احساسات لوگوں پر حاوی ھو گئے۔ نہ کوئی مسکرانےوالا رھا نہ میٹھی میٹھی باتیں کرنےوالا۔ جنگ میں سارے کے سارے لوگ بالکل بوکھلا سے گئے۔

امی خط کھولتے ہی چیخ پڑیں:

"ھائے!" ایسا لگا جیسے انہوں نے چاقو سے اپنا ھاتھ کاٹ لیا ہو۔ "انور! انور!" سیڑھی ان کے نیچے چرمرانے لگی۔

"میں یہاں ھوں، میری جان۔ کیا ھوا؟" ابو جو خالی انڈرویر پہنے ھوئے تھے، لپک کے کمرے سے باھر آئے اور روتی ھوئی امی کو بانہوں میں لے لیا۔

ارے یہ کیا ھوا؟ امی اچانک رو کیوں پڑیں؟

ابو نے ان کی مٹھی کھول کے کاغذ لے لیا اور ان کی نظریں الفاظ پر دوڑنے لگیں۔

"وہ سورما کی طرح جان نثار کرکے شہید ھو گیا... سورما کی موت..." ابو کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

اچانک ابو بہت غمزدہ اور بدقسمت نظر آنے لگے۔

"انتقال ھو گیا؟ فرھاد کا انتقال ھو گیا؟"

"ھاں، شہید ھو گئے" ابو کی آواز ایک بار پھر گونجی تب کہیں جاکے میری سمجھ میں آیا کہ ماموں کو، میرے ماموں کو کوئی حادثہ ھو گیا ھے۔ اتنا ھولناک حادثہ کہ امی اور ابو میں ایک دوسرے سے یا مجھ سے مزید بات‌چیت کرنے کی تاب نہیں، ایک دوسرے کی طرف دیکھنے تک کی سکت نہیں۔ گویا ھم تینوں نے ہی ماموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ھو...

...اس کا مطلب یہ ھوا کہ میرے ماموں اب کبھی واپس نہ لوٹیں گے۔ ان کی آنکھیں، ھاتھ، چہرہ، سارا جسم یوں صاف دکھائی دے رھا ھے جیسے وہ میرے ساتھ ھوں۔ ھمیشہ کی طرح زندہ‌دل، خوبصورت، نوجوان اور بےحد دریادل۔ ایسا لگتا ھے جیسے وہ مجھے اپنی گود میں اٹھاکے انگور کی بیل کی بلندی تک پہنچا رھے ھوں، زور زور سے قہقہے لگا رھے ھوں اور میں ڈر ڈرکے روئے جا رھا ھوں جیسے ھم دونوں مچھلی کے شکار کو گئے ھوں۔ کوئی مچھلی ھاتھ نہیں لگ رھی ھے۔ ماموں خاموش بیٹھے ھیں۔ پھر وہ زور سے سیٹی بجاتے ھیں، مجھے جھولے میں جھلاتے ھیں، بنسی الگ پھینک‌کے مجھے پانی میں ڈھکیل دیتے اور فوراً ہی خود بھی غوطے لگانے لگتے ھیں۔ ھم دونوں پانی میں لیٹے لیٹے ھاتھ پاؤں چلاتے

میرے سر پر ھاتھ پھیرنے لگے۔ میں الگ ھٹ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ آخر یہ لاڈ پیار کاھے کے لئے۔

"سنو بیٹے" تمھارے والد نے مجھ سے کہا اور ان کی آواز آج تک میرے کانوں میں گونج رھی ھے، "اپنی امی سے کہنا کہ سبھی کو، جانے کتنوں ھی کو مصائب برداشت کرنے پڑ رھے ھیں۔ وہ خود ھی سمجھتی ھیں — جنگ، جنگ... اور ھاں دیکھو دونا نہیں، بہادری کا ثبوت دینا۔ کیسی ھولناک آفت ھے، لعنت ھو کمبخت پر!" اور انھوں نے مجھے ان کاغذات میں سے ایک تھما دیا جنھیں میں نے اور تم نے بعد میں "سیاہ کاغذات" قرار دیا تھا۔

لیکن اس وقت میں کہاں سمجھ سکا تھا کہ یہ سیاہ کاغذ ھے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ماموں نے محاذ سے خط بھیجا ھے، نہایت ھی عام نوعیت کا خط جس میں لکھا ھوگا: "میرے عزیزو، یہاں سب خیریت ھے۔ ھم لوگ روس کی شاھراھوں اور جنگلوں سے گزرتے ھوئے آگے بڑھ رھے ھیں۔ میں آسمان کو، درختوں اور مواضعات کو دیکھ رھا ھوں۔ سارے مناظر بالکل ویسے ھی تو ھیں جیسے پانچ سال پہلے تھے جب میں فوجی خدمات انجام دے رھا تھا۔ روس کا آسمان جنگ سے متاثر نہیں ھوتا، اس پر کتنی ھی آگ کیوں نہ جلائی جائے یہ تو آج بھی پہلے ھی جیسا نیلگوں اور شفاف ھے..." ماموں نے اپنے پچھلے خط میں یہی سب تو لکھا تھا۔

میں اس کاغذ کو مٹھی میں دبائے صحن میں کچھ یوں داخل ھوا جیسے کوئی خاص واقعہ ھوا ھی نہ ھو۔ لاوڈ اسپیکر سے ورزش کے آخری احکام گونج رھے تھے:

"... اب گہری سانس لے کے اسے باھر نکالو۔ ایک، دو، تین..."

"ارے مغدی، آخر تم کہاں غائب ھو گئے؟" امی نے سختی سے پکارا۔ وہ سیڑھی پر چڑھی انگور کے خوشے کاٹ کاٹ کر تھالی میں رکھ رھی تھیں جو ابھی پوری طرح پکے نہیں تھے۔

"جی میں... کچھ نہیں... ذرا یوں ھی..."

میں انگور کی بیلوں کے قریب ٹہلتا رھا اور جی اوب گیا تو کاغذ امی کی طرف بڑھا دیا۔

"ماموں کا خط ھے۔ سب سے پہلے مجھے ملا۔ امی، اس کی خوشی میں آپ مجھے کیمرہ خریدنے کے لئے کچھ پیسے دیں گی نا؟"



1—1483

خوابوں میں سب سے بھیانک جانوروں کی شکلوں میں دکھائی دیتے رھے۔ میں ان خوابوں میں انھیں برا بھلا کہتا۔ ان پر لعنت بھیجتا۔ ان سے الجھ پڑتا، منہ نوچ لیتا، ان کی داڑھی اکھاڑ لیتا۔

تمہارے والد نے جن جن کو بھی موت کے وہ سیاہ کاغذ دئے تھے وہ سب کے سب ان کے بارے میں غالباً یونہی سوچتے ہوں گے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ جلد ھی تکلیف‌دہ اور طویل بیماری میں کیوں مبتلا ہو گئے تھے...

... تین دن بعد وہ ایک بار پھر ھمارے گیٹ پر دکھائی دئے۔ میں انگور کی بیلوں کے نیچے بیٹھا کشمش صاف کر رہا تھا کیونکہ اس روز ماموں کے انتقال سے متعلق رسمی ضیافت ہونے کو تھی۔ انہوں نے ھونٹوں سے سیں سیں کی دھیمی دھیمی آوازیں نکال کے مجھے اپنے پاس بلایا۔

"آخر تم اتنے بےحس و حرکت کیوں کھڑے ہو؟ ڈرو مت۔ موت کی خبر تھوڑی لایا ہوں... یہ لو!" انہوں نے ایک بار پھر میری طرف کاغذ بڑھایا، بغیر لفافے کا کاغذ جو خط نہیں تھا۔

میں ھکا بکا سا کھڑا تھا۔ سمجھ ھی نہیں پا رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ھے۔ اتنے میں انہوں نے ایک طرح کی برھمی اور بےچینی کے ساتھ مجھے اندر ڈھکیلا اور میرے پیچھے گیٹ دھڑ سے بند کر دیا۔

میرے قدم زمین پر جم‌کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے مجھے میرے گھر میں نہیں کسی دوسرے کے گھر میں ڈھکیل دیا ھے جہاں کوئی نہایت ھی بھیانک واقعہ میرا منتظر ھے۔

اچانک جانے کہاں سے ابو میرے پاس آ گئے۔

"کیوں بیٹے، ڈر گئے؟"

میں وہ کاغذ انہیں دے‌کے باغ میں انگور کی بیلوں کے پیچھے بھاگ گیا۔ چاروں طرف آدھی رات جیسا سناٹا چھایا ھوا تھا۔ سارا ماحول عجب ڈراؤنا سا تھا۔

ابو نے وہ کاغذ پڑھتے ھی زور سے ھاتھ جھٹک دیا جیسے بھڑ نے ڈنک مار دیا ھو۔ پھر ھاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے مجھے پکارا:

"مغدی!" میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے دبی ہوئی آواز میں کہا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" پھر کچھ اور بھی زیادہ دھیرے

هیں، الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہیں اور خود کو خوش‌قسمت، زندہ‌دل، گہرا رشتہ رکھنےوالا اور نیک تصور کرنے لگتے ہیں؛ ہم دونوں جانے کتنی ہی پرمذاق اور ڈراونی کہانیاں گڑھتے رہتے تھے۔ انسانی چہرےوالی بلیوں اور سانپ‌نما درختوں سے متعلق کہانیاں۔ اور وہ گیت ساتھ ساتھ گاتے تھے جس کے بول ہیں: "پرمسرت اور سرسبز آزور جزائر پر..." سائنس‌دانوں کا کہنا ہے کہ ان جزائر پر تمام مخلوقات سر کے بل چلتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہیں وہ وھیل بھی رہتی ہے جس کے تین سر ہیں۔ خود ہی گتار بجاتی ہے، خود ہی ناچتی ہے اور خود ہی گاتی ہے... تو میرے وہ ماموں، میرے سگے ماموں اب کبھی واپس نہ لوٹیں‌گے۔ کبھی نہ میرے ساتھ کھیلیں‌گے، نہ گیت گائیں‌گے، نہ ناچیں‌گے اور نہ قہقہے لگائیں‌گے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور جنگلوں میں چلے گئے۔ اب وہ کسی لوک کہانی کے کردار کی طرح غائب رہیں‌گے۔ صنوبر کے درختوں کو چھڑی سے کھٹکھٹاتے اور سنتے رہیں‌گے کہ ان کے تنوں کے ذریعے آسمانی آوازیں زمین تک کیسے پہنچتی ہیں۔ ماموں روسی فیڈریشن سے بےپناہ محبت کرتے تھے۔ اب وہ مجھے، امی کو، سبھی کو چھوڑکر اس ملک میں کھو گئے۔ انہیں لاکھ پکاروں کہ فرہاد ماموں میرے پاس آئیے، فرہاد ماموں آئیے مچھلی کے شکار کو چلیں، آئیے اچھل کود کریں، خوشیاں منائیں لیکن وہ میرے پاس نہ آئیں‌گے، کبھی بھی نہ آئیں‌گے... میں نے آخر انہیں ایسی کون سی تکلیف پہنچائی تھی؟ ہم لوگوں سے آخر ایسی کون سی غلطی سرزد ہو گئی تھی کہ وہ، میرے ماموں، میرے محبوب ماموں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ گئے؟..

"روؤ نہ میرے بیٹے" امی نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ان کے آنسو تھے کہ میرے سر پر ٹپکے ہی جا رہے تھے۔

## ۲

مرات، تم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے والد سے مجھے کتنی زیادہ نفرت تھی، کتنا ڈر لگتا تھا! کئی راتوں تک وہ میرے

ذرا دیر بعد نانا نے میرے پاس آکے مجھے پیار کیا اور ان کی ساری داڑھی میرے چہرے پر چھا گئی۔ ان کے جسم سے خربوزے، تپتیا گھاس اور دھی کی مہک آ رھی تھی۔

"اے خدا، تو نے میرے ننھے بچے کی کیا حالت کر دی! اس کا تو چہرہ بالکل فق ھو گیا ھے۔"

"نانا السلام علیکم" میں نے حتی‌الامکان خوش‌دلی سے کہا۔ "کھئے کیسا مزاج ھے؟"

"اور تمھارا کیا حال ھے؟"

"آپ خود ھی دیکھ رھے ھیں کہ پڑا ھوا ھوں... نانا، دراصل آپ کو دیکھکے مجھے ھنسی آتی ھے۔ اتنا پرمذاق آدمی تو میں نے کہیں دیکھا ھی نہیں... خیر میں آپ کو چپکے سے ایک بات بتاتا ھوں: ابو محاذ پر جائیں گے، فوج میں بھرتی کئے جا رھے ھیں۔"

"جانتا ھوں۔ انھوں نے گاؤں میں فون کرکے مجھے بتایا تھا۔ یہ خبر سنتے ھی تو گدھے پر سوار ھوکے یہاں کے لئے روانہ ھو گیا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ پریشان نہ ھو۔ وہ بہادروں کی طرح لوٹیں گے۔"

"معاف کیجئے گا۔ آپ کو یہ کہتے ھوئے شرم نہیں محسوس ھوتی؟"

"ارے شرم تو تمھیں آنی چاھئے۔ تمام بچوں کے باپ محاذ پر لڑ رھے ھیں اور تمھارے باپ یہاں..."

"لیکن اگر انھیں، انھیں..."

"اب یہ اگر مگر چھوڑو بھی۔ اٹھو، بہت پڑے رھے بستر پر!"

"میں بیمار ھوں، مجھ پر چلائیے نہیں۔ دراصل آپ اچھے آدمی نہیں۔"

"ارے بھئی، کہو تو اپنی داڑھی اکھاڑ پھینکوں۔ ایک تمھارے والد ھی تھوڑی محاذ پر جا رھے ھیں۔ ھمارے گاؤں میں تو بس عورتیں ھی عورتیں رہ گئی ھیں۔ اور وہ آہ و زاری کرتے کرتے پاگل ھوئی جا رھی ھیں۔ ھر روز دو تین عورتیں بیوہ اور دس بیس بچے یتیم ھو رھے ھیں۔ جنگ کتنے ھی انسانوں کی جانیں لئے لے رھی ھے..."

سے بولے: "یہ میرے لئے... محاذ پر جانے کا اطلاع‌نامہ آیا ھے... لیکن ابھی اپنی امی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔"

"بہت اچھا، ابو۔"

"تم بڑے عقلمند ھو۔"

"جی ابو۔"

"سنو بیٹے، ھمت نہ ھارنا۔ اپنی ناک آسمان تک اونچی رکھنا۔ بوراتینو* کی ناک کی طرح۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی ھاں۔"

"اچھا تو آؤ، ساتھ ساتھ کشمش صاف کریں۔"

ھم دونوں میز کے پاس جس کے وسط میں تھالی رکھی تھی، بیٹھ‌کے کشمش صاف کرنے لگے۔

"لیکن ابو، فرھاد ماموں کی طرح کہیں آپ بھی تو مار ڈالے جائیں گے؟ آپ جنگلوں سے ھمارے پاس لوٹ آئیں گے نا؟"

"ارے، اتنی بلند آواز سے نہ چلاؤ! میں واپس لوٹنے کی کوشش کروں گا، میرے منے..."

"اور آپ دوسروں کو ھلاک کریں گے؟ جسے آپ ھلاک کر دیں گے وہ تو جنگلوں سے اپنے گھر نہ لوٹ سکے گا۔ کیا واقعی آپ ھلاک کریں گے؟"

"عام طور پر جنگ میں حریفوں میں سے کوئی ایک تو جنگلوں میں کھو کے رہ ھی جاتا ھے" ابو نے کہا لیکن میں خاک بھی نہ سمجھ سکا۔

مرات، ان دنوں کتنی ھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن میں قابل معافی تھا۔

ماموں کے تیجے کی ضیافت میرے لئے ناقابل برداشت ثابت ھوئی۔ بڑی بوڑھیاں اتنا زیادہ چیخ چلا رھی تھیں کہ ماموں شاید قبر میں بےچینی سے تڑپ اٹھے ھوں گے۔ میرا تو سر چکرانے لگا اور مجھے باھر تازی ھوا میں لے جاکے انگور کی بیلوں کے قریب لٹا دیا گیا...

ضیافت اپنے عروج پر تھی تو نانا آ گئے۔ مجھے بڑی کمزوری محسوس ھو رھی تھی اور ان کے رونے چلانے کی آواز سنائی دی تو پڑے پڑے اونگھ رھا تھا۔

---

* بچوں کی اسی نام کی مشہور کہانی کا کردار۔ اڈیٹر۔

طاقتور، پرعزم اور نیک رهیں کہ وہ میری امی کے لئے آنکھ اور هاتھ بنے رهیں۔

اور اب؟ اب تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ ابو کی عدم‌موجودگی میں میری پیاری امی کا کیا حال هوگا۔ میری پیاری، میری بےچاری امی۔۔۔"

سارا معاملہ تیزی اور آسانی کے ساتھ طے هو گیا جیسے ابو اپنی ملازمت سے متعلق کسی عام دورے کی تیاری کر رهے هوں۔ ان کے ساتھی انہیں رخصت کرنے کے لئے همارے یہاں اکٹھا هوئے۔ سب لوگ خاموش بیٹھے رهے پھر شراب پی گئی۔ اس دوران میں باهر صحن میں ادهر ادهر چکر لگاتا رها۔ مجھے تو جیسے سب لوگ فراموش هی کر چکے تھے۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ ان لمحات میں کس سوچ میں ڈوبا هوا تھا۔ اتنا ضرور یاد هے کہ میرے دل میں امی سے گہری همدردی اور ترس کے جذبات بیدار هو گئے تھے اور میں تصور تک نہیں کر پا رها تھا کہ ابو چلے جائیں‌گے تو مجھ پر اور امی پر کیا بیتےگی۔ پھر سب لوگ باهر صحن میں آئے تو میں ابو کو پرانے کپڑوں میں ملبوس دیکھ‌کے سہم سا گیا۔ پرانے کپڑوں میں وہ بڑے بھدے سے، بجلی کے فٹر یا پانی کی پائپ لائن کے مزدور سے لگتے تھے۔ اور امی؟ ان کی طرف تو مجھ سے دیکھا هی نہیں جا رها تھا۔۔۔

ابو نے مجھے گود میں اٹھاکے کہا:

"بیٹے، اپنی ناک آسمان تک اونچی رکھنا! بوراتینو کی ناک جتنی اونچی! میں لوٹوں‌گا، هم لوگ خوب جی بھرکے هنسیں‌گے، خوشیاں منائیں‌گے۔ خدا تمہیں صحیح و سلامت رکھے!"

میں نے ابو کو مسکراکے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اچانک میری کنپٹیاں زور زور سے پھڑکنے سی لگیں۔ ابو نے جلدی جلدی میری پیشانی کا بوسہ لیا، میرے شانوں پر هاتھ پھیرے، کچھ کہا اور سب لوگ گیٹ سے باهر نکل گئے۔

وہ گاڑی میں سوار هوکے چل دئے۔ میں نے انہیں رخصت کرنے کے لئے گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑنا شروع هی کیا تھا کہ غبار کے باعث کھانسی آ گئی اور آگے نہ جا سکا۔ میں دل هی دل میں سوچنے لگا:

"هاں تو اب نہ آنسو بہانا هے نہ پریشان هونا هے۔ اس سے

پھر مجھے سو جانے کی ھدایت کے ساتھ بستر میں لٹا دیا گیا۔ سونے کو تو فوراً ھی سو گیا لیکن رات میں بار بار جاگتا رھا۔ پسینے پسینے ھو رھا تھا۔ پڑے پڑے کروٹیں بدلتا، آھیں بھرتا، پرچھائیوں سے خوف‌زدہ ھوتا اور پھر اونگھنے لگتا۔ جانے خواب تھا یا حقیقت، تمام رات امی کے رونے کی، ابو اور نانا کے دھیرے دھیرے باتیں کرنے کی اور پھر رونے کی آوازیں سنائی دیتی رھیں۔ ایک اور بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رھی تھی: جانے خواب تھا یا حقیقت، تمام رات درختوں پر کالے کالے پرندوں کی شکلیں، نامعلوم سی پرچھائیاں، سرخ اور نیلے دھبوں کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور ان کے درمیان جلتے چمکتے ھوئے نقطے میری نگاھوں میں منڈلاتے رھے۔

صبح کو مجھے پتہ چلا کہ یہ سب کچھ میں نے خواب ھی میں دیکھا تھا۔ امی البتہ روتی رھی تھیں اور ابو نانا سے باتیں کرتے رھے تھے۔ میری آنکھ کھلی تو امی سوئی ھوئی تھیں۔ ابو نے بتایا کہ وہ کوئی نصف گھنٹہ پہلے ھی سوئی ھیں۔ ابو اور نانا کی تو سرے سے پلک ھی نہ جھپک سکی۔

میں نے امی کے چہرے کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا: "اب ان پر کیا بیتےگی؟ ویسے تو وہ چھپاتی ھیں لیکن مجھے معلوم ھے کہ ابو کی جدائی میں ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکیں‌گی۔ ابو تو ان کے لئے سب کچھ ھیں۔ وہ امی کا کتنا زیادہ خیال رکھتے ھیں! ان کی کتنی زیادہ خدمت کرتے ھیں! اس قسم کا شوھر کم از کم ھمارے محلے میں تو ایک بھی نہ ملےگا۔ امی زیادہ کپڑے دھوتی اور تھک جاتی ھیں تو ابو ناراض ھوتے ھیں، برھمی ظاھر کرتے ھیں۔ امی کسی ضروری کام کی بنا پر کچھ دیر سے گھر لوٹتی ھیں تو ابو ناراض ھوتے ھیں، برھمی ظاھر کرتے ھیں، فکرمند اور مضطرب ھو جاتے ھیں۔ ھر وقت انہیں ڈر لگا رھتا کہ امی کہیں برف پر پھسل‌کے گر نہ پڑیں، کہیں کوئی شخص امی کو جو اناڑی اور زندگی میں ناتجربےکار ھیں، فریب دےکر پریشانی میں نہ مبتلا کر دے۔

امی تو چاھتی ھیں کہ تشویش اور فکر سے نجات پاکے بادلوں میں اڑتی رھیں۔ اس کے برعکس ابو کی خواھش رھتی ھے کہ وہ

گئی، دیکھنے میں بدصورت معلوم ہونے لگیں۔ دراصل وہ بھول ہی گئی تھیں کہ عورت کی حیثیت سے انہیں اپنا کچھ خیال رکھنا چاہئے، بالوں میں کنگھی کرکے سلیقے سے سنوارنا اور رخساروں پر کریم لگانی چاہئے۔ بناؤ سنگار سے انہیں کوئی رغبت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ہر وقت ایک ہی لمبا سیاہ لباس پہنے رہتیں حالانکہ پہلے یہ حالت تھی کہ دن میں دس دس بار کپڑے تبدیل کرتی تھیں۔

وہ ابو کے کپڑوں اور ان کے استعمال کی دوسری چیزوں کو اٹھا اٹھاکے دیر تک دیکھتیں اور اپنے منھ سے لگاکے آنسو بہانے لگتیں۔

مجھے اور نانا کو بڑی فکر تھی کہ امی کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئیں؟

"ذرا آپ جاکے انہیں تسلی دینے کی کوشش کرکے تو دیکھئے۔ وہ بہرحال آپ کی بیٹی ہیں" میں نانا سے درخواست کرتا۔

وہ اپنے شانے اچکاتے، کھوئے کھوئے سے انداز میں کچھ بڑبڑاتے اور کمرے میں امی کے پاس جاتے لیکن دوسرے ہی لمحے باہر نکل آتے۔ مجھ سے کچھ اور زیادہ اداس لہجے میں کہتے:

"تمہی بتاؤ کہ میں آخر تمہاری پگلی ماں کو کیسے سمجھاؤں گا؟ میری کسی بات کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ تمہی کچھ سمجھاؤ بجھاؤ نا۔ تم بہرحال ان کے بیٹے ہو..."

اور تب میری باری آتی۔

"امی جان، ذرا خود کو کچھ سنبھالئے نا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں، بہت ہو چکا۔ اب اور ہمیں نہ پریشان کیجئے... میں آپ کی ہر بات مانوں گا، کبھی آپ کو ناراض نہ ہونے دوں گا۔ آپ میری بات پر یقین کیجئے۔ کریں گی نا؟"

وہ اداسی سے مسکراتیں اور مجھے گلے لگاکے پیار کرنے لگتیں۔

رات کو جب وہ سو گئیں تو آخر میں نے ابو کے پاجامے، پتلون اور ہیٹ کو باہر لے جاکے انگور کی بیلوں کے پیچھے چھپا دیا۔

اگلے روز امی پڑوسن کے یہاں گئیں۔ وہاں ساری عورتیں جن کے شوہر اور بیٹے محاذ پر گئے ہوئے تھے، اکٹھا ہوئی تھیں۔ امی نے وہاں رو روکے دل کی بھڑاس نکالی اور گھر لوٹیں تو کہا:

کسی کو خاک بھی حاصل نہ ہوگا۔ اب تو اپنی ناک اونچی رہنی چاھئے۔ بوراتینو کی طرح! جرات اور بہادری دکھانے کا یہی تو وقت ھے، خواہ حالات کیسے ھی خراب کیوں نہ ھوں۔ سات سال کا ھو چکا ھوں اور اھم بات یہ ھے کہ امی کی خدمت کرنی ھے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابو ضرور لوٹ آئیں گے۔ تب ھم جی بھر کے ھنسیں گے، خوشیاں منائیں گے، اتنے زور زور سے قہقہے لگائیں گے کہ پیٹ دکھنے لگے گا۔ یوں تو بےحد افسوس ھے کہ مجھے ریلوئے اسٹیشن تک نہیں لے جایا گیا لیکن اس میں کیا رکھا ھے۔ بنیادی بات تو یہ ھے کہ مجھ پر گھر سنبھالنے کی... دوسری باتوں کی ذمےداریاں عاید ھوں گی۔"

صحن میں واپس آکے ٹھیک اسی جگہ کھڑا ھو گیا جہاں ذرا دیر قبل ابو مجھے اپنی گود میں اٹھائے کھڑے تھے۔ اچانک قریب ھی سے کوئی آواز ابھری اور انگور کی بیل میں لگے لاؤڈ اسپیکر سے ابو کی آواز فضا میں بکھرنے لگی:

"ورزش کے لئے سیدھے کھڑے ھو جاؤ! ھاتھ کمر پر! پیروں کے درمیان شانے کی چوڑائی کے برابر فاصلہ! تیار ھو گئے نا؟ تو اب ورزش شروع کرو: ایک، دو، تین... شاباش بیٹے! اسی انداز سے جاری رکھو..."

"ابو!" میں چیخ اٹھا۔ "یہ ساری باتیں مذاق ھی تو ھیں۔ آپ تو محاذ جنگ پر جا چکے ھیں..." پھر میں نے دل ھی دل میں کہا کہ مانا وہ چلے گئے لیکن ان کی آواز تو ھر صبح کو مجھے اور امی کو سنائی دے گی۔ اس سے ھمیں کچھ سکون تو حاصل ھی ھوگا۔ اور جھک جھک کے ورزش کروں گا۔ میں ان سے محبت کرتا رھوں گا، ابو جو بھی حکم دیں گے، بجا لاؤں گا۔ دوڑوں گا، کودوں پھاندوں گا اور جھک جھک کے ورزش کروں گا۔ میں ان سے محبت کرتا رھوں گا، انہیں یاد کرتا رھوں گا..."

## ۳

دو دنوں تک امی سے کوئی کام نہ ھو سکا۔ ھر وقت کھوئی کھوئی سی، ھر شے سے بےنیاز سی رھتیں۔ چہرے کی رنگت بدل

میں نے البم رکھ دیا۔ کمرے سے بھاگا ہوا باہری صحن میں پہنچا اور انگور کی بیلوں میں بلندی پر ٹہنیوں اور پتیوں کی اپنی چھوٹی سی پناہ‌گاہ میں چھپ گیا... اور مرات، یہیں سے میں نے تمہیں پہلے پہل دیکھا...

تمہارے بال گندے اور الجھے ہوئے تھے۔ جسم پر والد کا کوٹ اور پیٹھ پر ڈاکیے کا بھاری سا تھیلا۔ تم نے ہمارے گیٹ سے اندر جھانکتے ہوئے بلند آواز سے پکارا:

"مالکان مکان، آپ کے لئے خط ہے!"

میں تمہارے والد کے تھیلے کو نظر پڑتے ہی پہچان‌کے بری طرح خوف‌زدہ ہو گیا اور سوچا یہیں بیٹھے بیٹھے انتظار کروں‌گا، دیکھوں کیا ہوتا ہے۔

"ارے، آپ کے لئے خط ہے!" تم نے واقعی تھیلے سے ایک خط نکالا۔ سیاہ کاغذ نہیں بلکہ لفافہ۔

میں کودکے نیچے اترا اور احتیاطاً مٹھیاں بھینچے ہوئے تمہارے پاس پہنچا۔

"لاؤ، دے دو!"

تم نے بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے پوچھا:

"تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"تمہیں کیوں بتاؤں؟"

"تب تو میں تمہیں خط دینے سے رہا۔ کیا پتہ تمہارا پورا نام نوروف نہیں، بوروف ہو۔"

اس جواب سے میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ جی چاہا کہ تم پر ٹوٹ پڑوں۔ تمہارے باپ کے خلاف، ان کے لائے ہوئے سیاہ کاغذات کے خلاف اور خود تم جیسے کوڑھ مغز کے خلاف سارا غصہ نکال دوں۔ تمہاری خوب پٹائی کروں، دانت کاٹ لوں لیکن مشکل یہ تھی کہ ہماری قوتیں برابر نہ تھیں۔ تمہارا قد میرے قد سے لمبا تھا اور شانے میرے شانوں سے چوڑے۔ اور مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ لڑنے کے معاملے میں بھی تمھی کو فوقیت حاصل ہے۔

"میں کون ہوں؟ جاکے اپنے والد سے پوچھو نا کہ میرا پورا نام کیا ہے۔ میرا خاندانی نام وہی ہے جو ان کے لائے ہوئے حالیہ سیاہ کاغذ پر درج تھا۔"

"کل سے ایک اور فوجی اسپتال کھل جائےگا۔ میں اس میں ملازمت کروں گی۔"

"ٹھیک ھے، بیٹی" نانا نے تجویز کی حمایت کی، "تم بڑی ذھین ھو۔ کچھ دن وھاں کام کروگی تو اپنے غموں کو کسی حد تک بھول جاؤگی۔ بیٹے کی پرورش کا کام بعد میں جاری رکھ سکتی ھو۔ تب تک وہ صبر و تحمل سے کام لےگا۔"

"جی نہیں، اباجان! بات یہ ھے کہ صاف ستھرے کپڑے زیب‌تن کئے، بھولی بھالی خوبصورت عورت کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے کرتے عاجز آ گئی۔ ھمیشہ سوچتی تھی کہ مغدی کے ابو چند مہینوں کے لئے کہیں باھر چلے جائیں تاکہ ان کی عدم‌موجودگی میں گھر چلاکے دیکھوں، ساری ذمےداریاں خود سنبھالوں، خود ھی ھر بات پر غور کروں، ٹھوکر کھاکے گرنے پر خود ھی اٹھ کھڑی ھوں... اور وہ چلے ھی گئے..."

صبح کو امی ملازمت کے لئے فوجی اسپتال چلی گئیں اور میں اتنے بڑے سے گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ سب کمروں کے چکر لگائے، جانے کیوں دیر تک ابو کی میز کی دراز کی تلاشی لی، پھر البم کو الٹ پلٹ‌کے دیکھتا رھا جس کے تقریباً ھر صفحے پر فرھاد ماموں کی کوئی نہ کوئی تصویر لگی ھے۔ ایک تصویر خاص طور سے بہت اچھی لگی۔ ماموں مجھے گود میں لئے ھوئے انگور کی بیلوں کے سائے میں بیٹھے ھیں۔

"فرھاد ماموں، آداب... کہئے ھم سے بچھڑکے آپ کا تو دل ٹوٹ گیا نا؟"

"جیتے رھو بیٹے... آؤ، ھم دونوں مل‌کے اپنا محبوب گیت چھیڑیں۔"

"برا نہ مانیےگا، آج گیت گانے کو میرا جی نہیں چاھتا۔"

"میں تم سے درخواست کرتا ھوں، بیٹے۔"

"اچھا تو یوں ھی سہی... "سرسبز آزور جزائر پر..." مگر ماموں، میرے ابو محاذ پر چلے گئے نا؟.."

"صرف سرسبز ھی نہیں، پرمسرت، سرسبز جزائر پر..." یہ تم نے "پرمسرت" کو کیوں چھوڑ دیا؟ آؤ، شروع سے گائیں:
"پرمسرت، پرمسرت، پرمسرت..."

کرنا چاهوں‌گا لیکن یه سوچ کر هی دکھ هوگا کیونکه تم میرے دوست هوگیے۔ تب آخر میں کیا کروں‌گا؟

تم نے میرے اندیشے کو بھانپ لیا:

"ڈرتے هو که میں؟.."

"نہیں، ڈرتا تو نہیں هوں۔ اچھا یه بتاؤ که وه کاغذ تو نه لاؤگے؟ سچ هے نا؟"

"اسی وجه سے تو کوئی مجھ سے دوستی نہیں کرتا۔ پرانے دوست تک دشمن هو گئے کیونکه... کیونکه میں ان کے لئے یہی کاغذات لایا تھا.. لیکن آخر اس میں میرا کیا قصور۔ بالغ لوگ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رهے هیں تو اس میں بھلا میری کیا غلطی هے؟ مجرم کیسے هو گئے؟"

"نہیں" میں نے کہا، "میں ڈرتا نہیں هوں۔ میں تم سے دوستی کروں‌گا۔ کچھ بھی کیوں نه هو جائے، هم دونوں دوست هی رهیں‌گے۔"

تو یوں شروع هوئی تھی هماری دوستی، مرات...

امی شام تک گھر نه لوٹیں۔ میں تمام دن بھوکا رها۔ میں ادھر ادھر گھومتا اور انگور کھاتا رها۔ اتنے انگور کھائے که متلی هونے لگی۔ پیٹ میں شدید درد هوا اور کئی بار فرش پر لیٹ لیٹ کے کروٹیں بدلتا رها۔ امی کی خودمختاری کا پہلا دن میرے لئے کتنا تکلیف‌ده ثابت هوا!

میں ره ره‌کے پریشان هوتا اور سوچتا رها که امی مجھے بھول هی بیٹھیں۔ خود تو فوجی اسپتال میں لذیذ سوپ اور کٹ‌لیٹ اڑا رهی هوں‌گی اور یہاں کھٹے انگور کھا کھاکے میرا پیٹ پھول گیا هے اور لگتا هے که درد سے پھٹ هی تو جائے‌گا۔

بار بار میرے دل میں خیال پیدا هوا که پڑوسیوں کے یہاں جاکے خط پڑھوا لوں اور پھر امی کو دکھائے بغیر هی اسے پھاڑکے پھینک دوں۔ ابو کو غالباً اندازه هو هی گیا هوگا که امی مجھے بھوکوں مارے ڈال رهی هیں اس لئے وه میرے اس کارروائی سے ناراض هونے سے رهے۔ ویسے انهوں نے یه خط بھی تو امی کے نام نہیں، میرے نام بھیجا هے۔ امی کو ابو کے خط کی فکر پڑی هوتی تو ان کو اس کی آمد کا احساس هو هی جاتا اور وه بھاگم بھاگ گھر لوٹ آتیں۔

یہ سنتے ہی تمہارا منہ اتر گیا۔ تمہاری ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا، تمہیں شرم محسوس ہو رہی ہے کہ تمہارے والد، فرہاد ماموں کے متعلق ہمارے یہاں ایسی بری خبر لائے تھے۔

"گھبراؤ نہیں" تم نے جواب دیا۔ "یہ رہا خط۔ شاید تمہارے والد کا ہے۔ امید ہے کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہے، کیوں نہیں۔ خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ ان کے براہ‌راست خط بھیجنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ زندہ ہیں، زخمی تک نہیں ہوئے۔ کہو تو پڑھ دوں؟"

"ہاں پڑھو... نہیں، نہیں، رہنے دو۔"

امی کی اجازت کے بغیر ہم لوگ خط کھول لیتے تو وہ ناراض ہوتیں۔

"نہیں" میں نے کہا، "کوشش بھی نہ کرنا۔ تم سے بہتر تو میں خود پڑھ سکتا ہوں۔"

تم ٹھہرے رہے۔ زمین پر پیر مارے، ہتھیلیوں میں ہوا پھونکی جیسے انہیں سردی لگ گئی ہو، پھر اچانک کہا:

"آؤ، ہم دونوں دوستی کر لیں۔ چاہتے ہو نا؟ میرے ساتھ رہوگے تو تنہائی کا احساس نہ ہوگا۔ مجھے چڑیلوں اور جادوگروں کی ڈھیروں کہانیاں یاد ہیں۔ یہی نہیں، میرے پاس ایک سے ایک عمدہ ڈاک ٹکٹ بھی ہیں۔"

تم بڑے قابل‌رحم نظر آ رہے تھے، تمہاری نگاہیں منت سماجت کرتی معلوم ہو رہی تھیں جیسے بہت سی باتوں کا ہماری دوستی ہی پر انحصار ہو۔

"تم خود اپنی تنہائی سے اوب جاتے ہو کیا؟"

"نہیں تو۔ دراصل تم جانے کیوں مجھے بہت پسند ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا: ڈاکیے کی دوستی یقیناً دلچسپ ثابت ہوگی۔ ابو کے خطوط سب سے پہلے مجھی کو دیا کرےگا۔ یہ بھی بتائےگا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اچانک میں خوف‌زدہ ہو گیا: خدا نخواستہ تم ابو کے متعلق سیاہ کاغذ لےکے آئے تو؟ تو کیا ہوگا، مرات؟ تمہاری طرف کن نظروں سے دیکھوں‌گا؟ تمہیں ہلاک

امی رکابی بھر انگور چٹ کر گئیں۔ میں نے تو صرف ایک ھی گچھا کھایا پھر بھی متلی محسوس ھونے لگی۔

"یہ رھا خط" میں نے کہا، "ابو کا ھے۔"

"تمھارے ابو کا ھے؟ ارے تو اتنی دیر تک خاموش کیوں رھے؟" امی نے لفافے کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ انہیں کچھ اطمینان ھو گیا تو کھول کے پڑھنے لگیں۔

"میری پیاری نورا، میرے پیارے..." وغیرہ وغیرہ...

"نورا۔ یہ تو خیر آپ ھیں۔ سمجھ گیا" میں نے امی کی توجہ مبذول کراتے ھوئے کہا، "لیکن یہ "وغیرہ وغیرہ" کون ھے؟"

"یہ؟ اس سے مراد ھے تم اور تمھارے ناناجان۔"

"اچھا!"

"میں آپ لوگوں کو یہ خط کازالنسک ریلوئے اسٹیشن سے لکھ رھا ھوں جہاں ھماری ٹرین نصف گھنٹے کے لئے ٹھہری ھوئی ھے۔ کل صبح ھم روسی فیڈریشن میں اس سرزمین پر ھوں گے جس کا ھمیں دفاع کرنا ھے۔ میرے جیسے دوسرے معمولی لوگ بھی میرے ھمسفر ھیں جو عارضی طور پر اور بہت ممکن ھے ھمیشہ ھمیشہ کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ آئے ھوں۔ ان لوگوں نے کاھے کو کبھی سوچا ھوگا کہ کسی دن انہیں دوسروں کی جانیں لینی ھوں گی لیکن کیا کیا جائے۔ یہ تو جنگ ھے جنگ!

ساری صورت‌حال اچانک کیسی خراب ھو گئی! جلد ھی لوگ اپنے نئے پیشے کے عادی ھو جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ھے کہ بہت سے لوگ اس کے عادی ھوئے بغیر ھی دنیا سے سدھار جائیں۔ یہ وہ لوگ ھیں جنھوں نے ساری زندگی کپاس اور انگور کی کاشت کی۔ گولی دغنے کی آواز تو کبھی سنی تک نہ تھی۔ اور اب دنیا کا سب دشوار کام انجام دینے جا رھے ھیں..."

خط میں اور جانے کتنی ھی بار "پیاری نورا"، "مجھے تم سے محبت ھے"، "پیار کرتا ھوں" جیسے الفاظ استعمال کئے گئے تھے اور زندگی گزارنے، کھانا کھانے اور سڑک پر چلنے سے متعلق ھدایات اور نصیحتیں درج تھیں۔ پورے تین برسوں تک کے لئے ھدایات۔

میں جان بوجھکر امی کی واپسی کا انتظار کئے بغیر سو گیا۔ پہلے اونگھتا اور ایک کان ان کے قدموں کی آھٹ پر لگائے رہا کہ آ نہ رہی ہوں۔ ان کے تیز قدموں کی کھٹ کھٹ دیر تک نہ ابھری تو پھر سننا ھی بند کر دیا۔

سوتے سوتے میں نے ابو کو دیکھا۔ چہرہ اتنا صاف اور بڑا سا نظر آ رہا تھا جیسے سنیما کے پورے پردے پر پھیلا ہو۔ بس چہرہ ھی دکھائی دیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ میں بھی خاموش رہا۔

"ارے بیٹے، یہ تم کو ھو کیا گیا؟" مجھے امی کی آواز سنائی دی۔ "ڈر گئے کیا؟ تمہارا تو سارا بدن کانپ رہا ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں: امی آ گئی تھیں!

"نہیں، نہیں، میں کانپ کہاں رہا ھوں۔ ابو نے مجھے کوئی تکلیف تھوڑی پہنچائی ھے۔"

"تو تم نے اپنے ابو کو خواب میں دیکھا تھا؟ تم تو اس طرح چیخ رہے تھے جیسے تمہیں مارا پیٹا جا رہا ھو۔"

"جی نہیں، کسی نے بھی میری پٹائی نہیں کی۔"

عجب بات تھی: آخر میں خواب میں چیخ کیوں رہا تھا؟

"کیا آپ کو لوٹنے دیر ھوئی؟"

"بس ابھی ابھی آکے کپڑے بدلے ھیں... کیسی بھیانک بات ھے! سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ جیسے سب کچھ بھول ھی بیٹھی ھوں..."

"امی، آپ کچھ کھانا چاھتی ھیں؟"

"کھانے کو تو بےتاب ھوں۔ لائبریری بند ھونے تک وھاں بیٹھی رھی۔ ڈھیروں کتابیں چاٹ ڈالیں تاھم مجھے ڈر ھے کہ... اب میں جاکے انگور توڑوں‌گی اور ھم کھانا کھائیں‌گے۔"

اوہ! انگور کا نام سنتے ھی میرے منہ سے چیخ نکلتے رہ گئی۔ لیکن امی نے کچھ کھایا نہیں تھا اس لئے وہ قابل معافی تھیں۔

شاید سوتے میں میرے چلانے کا سبب یہ تھا کہ میں ابو سے اپنی بھوکی پیاسی زندگی کی شکایت کی تھی۔ میں بھی عجب احمق ھوں!

پر چڑھی ہوئی انگور کی بیلوں کے درمیان بلندترین جگہ پر بیٹھا سوچتا رہا۔ ہفتے میں ایک بار مفت فلم دیکھنے کے لئے چڑھ کے اسی جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔ ہماری سڑک ایک بہت بڑے سے پردے جیسی ہے اور فنکاروں کی تعداد ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سب کی نگاہوں سے چھپ کے کہیں بیٹھ جائیے اور دیکھتے رہئے۔ نہ پوچھئے کہ کیسی کیسی دلچسپ چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔

مثال کے طور پر ہر صبح کو سامنے والے مکان کے گیٹ سے بوڑھے سراج بابا باہر نکلتے ہیں۔ نکلتے ہیں اور سر اٹھاکے آسمان کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے وہاں کوئی گدھا پرواز کر رہا ہو۔ دیکھتے جاتے ہیں اور جا بیجا پتلون درست کرتے جاتے ہیں۔

پتلون وہ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے، میکرونی فیکٹری میں چوکیدار ہو جانے کے بعد ہی سے پہننے لگے ہیں۔ اس سے پہلے جب بیٹا محاذ پر نہیں گیا تھا، بوڑھے نے کہیں بھی ملازمت نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ سفید شلوار ہی پہنتے تھے۔ شلوار پہننے والے چائے خانے میں آرام سے پلتھی مارکے بیٹھ سکتے ہیں اور گرمیوں میں جسم کو ٹھنڈک بھی حاصل ہوتی ہے۔ مسجد جانے کے لئے بھی شلوار بہت موزوں ہوتی ہے۔ پتلون پہن کے کوئی مسجد جائے تو تماشا بن جائے۔

سراج بابا کھڑے کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، دس منٹ تک، آدھے گھنٹے تک، اس وقت تک جب تک گردن نہ دکھنے لگے۔ پھر وہ اپنے چغے کی بغل سے روئی کا ننھا سا ٹکڑا نکالتے ہیں، اسے صاف کرتے اور منہ سے پھونک کے آسمان کی طرف اڑا دیتے ہیں۔ خوش ہوکر اسے دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی اچھل کے اس کی طرف ہاتھ بھی ہلانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ روئی کا یہ ننھا ٹکڑا خیریت کے ساتھ کسی درخت کی پتیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے۔

ابو کہا کرتے تھے کہ سراج بابا جیسی عمر میں بچپن کی تمام عادتوں اور شرارتوں کو دوہرانے کا جی چاہتا ہے۔ میں سوچتا کہ جب ان کی عمر کا ہوں گا تو میری حالت عجیب ہیبت ناک ہوگی۔ سورج نکلنے سے ڈوبنے تک احمقوں کی طرح انگور کی بیلوں کے درمیان بلندی پر بیٹھا دیکھتا رہوں گا کہ کون کہاں اور کیوں جا رہا

"مغدی، تمہارے ابو بھی کتنے عجیب اور پیارے ہیں" امی نے کہا۔ "محبت کے بارے میں کتنے بھونڈےپن سے لکھتے ہیں۔ محبت‌نامہ لکھنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔"

۴

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ امی کے لئے ایک غیرمعمولی دن ہے۔

برسوں بعد جب میں نے زندگی میں پہلی بار کلاس لیا تھا تو میری بھی یہی حالت ہو گئی تھی۔ تمہیں تو ضرور ہی یاد ہوگا، مرات؟ یاد کرو نا اس دن کو جب انسٹی‌ٹیوٹ سے فارغ ہونے کے بعد ہم ایک اسکول میں زبان و ادب پڑھانے کے لئے گئے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میرے پہلی بار کلاس لینے کے وقت تمہیں فرصت تھی اور تم نے اس اندیشے سے کہ گھبراہٹ سے میری جان نہ نکل جائے، میرے کلاس میں موجود رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تم آخری ڈسک پر بیٹھے نگاہوں ہی نگاہوں میں میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ میں بچوں کے سامنے کھڑا تھا اور ذرا دیر تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکال سکا تھا حالانکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے بچوں کو کاھے کے بارے میں بتانا چاہئے۔ بچے مذاق اڑانے لگے تو میری ہمت اور بھی پست ہو گئی۔ میں ہاتھ پھیلاکے ہر چیز کو خیرباد کہنے اور کلاس سے بھاگ کھڑے ہونے ہی کو تھا کہ مرات، تم نے میرے پاس آکے کہا:

"بچو، گھبراؤ نہیں۔ مغدی انورووچ عجلت میں میری نوٹ بک اٹھا لائے ہیں اور بدخط تحریر کو پڑھ نہیں پا رہے ہیں!"

بچے ہنس پڑے۔ میں نے ہلکی سی سانس لی اور معلم کی حیثیت سے زندگی میں پہلے الفاظ ادا کئے: "بچو، اپنی اپنی کاپیاں نکال لو" اور بس اسی لمحے سے سب کچھ معمول پر آ گیا۔

میری امی کا بھی یہی حال تھا۔

"لیکن امی، سب ٹھیک ہو جائےگا۔ میں جانتا ہوں، زخمی آپ کو پسند کرنے لگیں‌گے۔ بیکار میں ڈریئے گھبرائیے نہیں" میں بلیوں



2—1483

بیوی دنیا سے کوچ کریں گے تو اس گیٹ کو کس کے حوالے کر جائیں گے۔ ان کے تو کوئی وارث ھی نہیں ھے!

مجھے اور بھی واقعات، اور بھی مناظر یاد ھیں۔ ان سب کا تذکرہ نامناسب ھوگا کیونکہ سننےوالا اوب جائےگا۔ ھاں، ایک اور بات ضرور قابل ذکر ھے۔ مرات، تم سڑک سے گزر رھے ھو اور بہت اداس نظر آ رھے ھو، میرے دوست۔

بھئی ذرا خود کو جھنجھوڑو نا، اپنی ناک کو بوراتینو کی طرح اونچی رکھو نا۔ لیکن ایسا لگتا ھے کہ تم بوراتینو کو جانتے ھی نہیں۔ بچپن میں تم کو چڑیلوں اور جادوگروں کے متعلق بس وھی کہانیاں آتی تھیں جن کے خالق تم خود تھے یا تمہارے دادا۔ ایک بھی مزیدار کہانی تو تمہیں نہیں آتی تھی۔ میرے دوست، ھمارے لئے یعنی سات سالہ لڑکوں اور تیس سالہ افراد کے لئے، خاص طور سے ۳۰ سالہ افراد کے لئے پاک اور روشن کہانیاں کتنی ضروری ھیں۔ ان کے بغیر تو جیسا کہ کسی شاعر نے کہا تھا، "نہ انسان زندہ رہ سکتا ھے نہ جانور"۔

"ارے مرات!"

اب کہیں جاکے میں نے دیکھا کہ تمہاری قمیض پھٹی ھوئی ھے۔

"ھاتھاپائی کی ھے کیا؟"

"میں ھر چیز سے تنگ آ گیا، مغدی! اب اور زیادہ نہیں برداشت کر سکتا۔ ھر روز یہی سیاہ کاغذات – موت، موت، موت... جیسے اس میں میرا قصور ھو۔"

تم نے منھ بناتے ھوئے اپنی قمیض اتاری تو میں ھکابکا رہ گیا: ساری پیٹھ پر نیل پڑے تھے۔

"یہ کس نے تمہیں مارا پیٹا؟ بتاؤ نا۔ ھم دونوں مل کے بدلہ لیں گے۔"

"تم تو نادان ھو۔ میں نے ایک بوڑھے کو لے جاکے سیاہ کاغذ دیا اور وہ مجھ پر ڈنڈے برسانے لگا... میں کھڑا رھا، مجھ سے بھاگا ھی نہیں جا رھا تھا۔"

"کسی روز کوئی تمہیں مار ھی ڈالےگا۔"

ھم ذرا دیر تک خاموش رھے۔ پھر میں نے کہا:

ھے۔ پڑوسی کہا کریں گے: "وہ رہا بوڑھا بےوقوف، انگور کی بیلوں کے درمیان۔ ناقابل تقلید حالت!"

ایک دوسرا تماشا بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ھمارے بوڑھے پڑوسی میاں بیوی ایک دوسرے سے بےحد مشابہ ھیں۔ میں تو ابھی گزشتہ سال تک انہیں جڑواں بھائی بہن سمجھتا تھا۔ ابو نے بتایا کہ یہ لوگ میاں بیوی ھیں، تب بھی بہت دنوں تک یقین نہ آیا کہ آخر اتنی بڑی عمر کے لوگ میاں بیوی کیسے ھو سکتے ھیں۔ میں سمجھا کرتا تھا کہ میاں بیوی کو بہرحال جوان ھونا چاھئے اور بوٹین‌گوٹ یا گوٹین‌گوٹ (ٹھیک سے نام ھی نہیں یاد آ رہا ہے!) میاں بیوی کی طرح محبت کی کہانیاں لکھنی چاھئیں۔

بوڑھے کا نام محکم ھے اور بڑھیا کا محمودہ۔ دونوں سڑک پر نکلتے ھیں تو میری طرف ان کی پیٹھ ھوتی ھے۔ دراصل وہ اپنے باھری گیٹ کو دیکھتے رھتے ھیں۔ دیکھ دیکھ‌کے آھیں بھرتے، روتے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ھیں۔ ان کا یہ محبوب گیٹ ان کی جوانی کا خاموش گواہ ھے لیکن کتنا پرانا ھو چکا ھے! کتنے شگاف ھیں اس میں! زندگی بھی کتنی نیچ ھے، اس نے اس گیٹ پر بھی رحم نہیں کیا جو نسل نسب کے لئے باعث فخر ھے اور ھمسایوں اور رشتےداروں کے لئے باعث رشک۔

ان کا گیٹ واقعی شاندار، بھاری بھرکم اور کھردرا ھے۔ سب سے مضبوط لکڑی قیراغاچ٭ کا بنا ھوا اور قالین جیسے گل بوٹوں سے آراستہ۔ یہ گیٹ ایک نسل سے دوسری کو ورثے میں ملتا اور ایک شہر سے دوسرے کو منتقل ھوتا رھتا ھے۔

محکم اور محمودہ نے دراصل اس کی دیکھ بھال میں لاپروائی برتی تھی۔ ان کی نگاھوں کے سامنے لکڑی بری طرح چٹخنے لگی اور اس میں شگاف پڑ گئے۔ اب میاں بیوی اس فکر میں کہ گیٹ اور زیادہ نہ خراب ھو، اسے ھر صبح کو مٹی کے تیل سے صاف کرتے ھیں۔ رگڑتے رگڑتے گالیاں بکنے کوسنے لگتے ھیں، رو پڑتے ھیں لیکن سب فضول ھے۔ اگلے روز گیٹ میں نئی دراز پڑ جاتی ھے۔ یہ ھے زندگی اور زندگی کا معمول۔ گیٹ کی زندگی بچانے کی کوئی صورت ھی نہیں! اس تماشے میں مجھے کوئی فکر ھے تو بس یہ کہ بوڑھے میاں

اور پریشانی میں گزرا تھا، اس کے علاوہ ہم لوگوں کے اسپتال پہنچنے سے یقیناً وہ سمجھ جاتیں کہ ہم ان کا کتنا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

مرات کو معلوم ہی تھا کہ اسپتال کس جگہ واقع ہے چنانچہ ہم دونوں چل دئے۔ مجھے گھر سے دور تک جانے سے منع کر دیا گیا تھا کیونکہ شہر کی گلیوں کوچوں میں بہ‌آسانی راستہ بھول سکتا تھا۔ اس روز میں نے اس پابندی کی پہلی بار خلاف‌ورزی کی۔

کیسی دلچسپ تصویر میری نگاہوں کے سامنے تھی! ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے کیونکہ تنگ گلیوں میں صرف یونہی چلنا ممکن تھا۔ قدم قدم پر مسجدیں نظر آتی تھیں اور سر اٹھاتے ہی ان کے لق‌لقوں کے گھونسلوں‌والے نیلے نیلے گنبد۔ ان نیلے گنبدوں کے پس‌منظر میں مکانات، درخت اور لوگ - سب کچھ نیلا نیلا ہی سا معلوم ہوتا۔ ویسے گلیاں اداس اور آنکھوں کے بغیر تھیں۔ کوئی بھی سر اٹھاکے کسی سے صاحب سلامت نہیں کر رہا تھا۔

اچانک ہماری نگاہوں کے سامنے بالکل عجیب و غریب سی پتھر کی عمارت ابھری جس کے بہت سی آنکھیں تھیں۔ یورپی وضع کی اس زمانے کی یہ واحد عمارت انسٹی‌ٹیوٹ کی تھی جہاں برسوں بعد میں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔

"تم ٹھہر کیوں گئے؟" مرات نے مجھے اس عمارت کی طرف ڈھکیل دیا اور میں نے جنگ کے زندہ زخمیوں کو دیکھنے کی آس کے ساتھ کھڑکی سے اندر جھانکا۔

"اندر جانا ممنوع ہے" دروازے کے سامنے ایک عورت نے جس کے ایک بازو پر سرخ پٹی بندھی تھی، ہمیں روکتے ہوئے کہا۔

"اپنی امی کے پاس جا رہے ہیں" میں نے کہا، "وہ یہاں کام کرتی ہیں۔"

"ماں کے پاس جانا بھی ممنوع ہے۔ وہ مصروف ہیں۔"

"ان کے گھر میں آگ لگ گئی ہے، خالہ‌جان۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟" عورت نے مرات کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں" میں نے جلدی سے اعتراف کیا۔ جانتا تھا نا کہ امی سے کہا جائےگا کہ ان کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے تو وہ بےہوش ہو جائیں گی۔

"جانتے ہو اس وقت میں... ارے سنو، میرے ابو گھر ہی پر ہیں۔ سمجھ گئے نا؟ وہ قطعاً محاذ پر نہیں گئے۔ لوگ سوچتے ہیں کہ وہ محاذ پر لڑ رہے ہیں حالانکہ گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔

"قسم کھاؤ!"

"سچ کہتا ہوں۔ چلو دکھا دوں" اور میں نے تمہیں پلنگ پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔ ابو کی آواز فوراً ہی کمرے میں گونجنے لگی:

"ورزش کے لئے کھڑے ہو جاؤ! ہاتھ کمر پر رکھو، بیٹھ..."

تم دنگ رہ گئے اور میں نے زور سے قہقہہ لگایا:

"یہ میرے ابو ہی ہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ اب تو تمہیں یقین ہو گیا نا کہ وہ گھر ہی پر ہیں؟"

لیکن تم نے فوراً ہی معاملے کو سمجھتے ہوئے پوچھا:

"یہ کس کا کرشمہ ہے؟"

میں تو خیر جانتا ہی تھا کہ کمرے میں ابو کی آواز کا ریکارڈ موجود ہے جو پلنگ پر سے کسی کے اٹھتے ہی اپنے آپ بجنے لگتا ہے اور انگور کی بیل میں لگے لاؤڈ اسپیکر سے احکام جاری ہونے لگتے ہیں لیکن تمہیں؟ تمہیں میں نہ سمجھا سکا کیونکہ میں خود یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ابو خود نہیں بول رہے ہیں، محض ان کی آواز کا معمولی سا ریکارڈ بج رہا ہے۔ یہ آواز بعد میں بھی بہت دنوں تک میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ مجھے افسوس ہوا، اپنے اوپر جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی کہ میں نے تمہیں یہ ریکارڈ دکھاکر اپنی کہانی کا راز فاش کر دیا...

تم نے میری دلی کیفیت کا غالباً اندازہ لگاتے ہوئے کہا:

"میں نے تو... فوراً ہی یقین کر لیا کہ واقعی تمہارے والد ہی بول رہے ہیں۔ میں تو یہ تک مانتا ہوں کہ تم ان سے کچھ پوچھو تو وہ جواب بھی دیں گے۔ پوچھو نا کچھ..."

## ۵

میں نے سوچا کہ میں اور مرات، امی کو لینے کے لئے اسپتال جائیں تو وہ بےحد خوش ہوں گی۔ اسپتال میں ان کا پہلا دن بڑی گھبراہٹ

کاٹ رہا تھا، تاریک اور گھنے جنگل میں۔ ماموں کو ہلاک کر دیا گیا اور اس سپاہی کو زخمی۔ مگر آپ اس کی جان بچانے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ گولاباری بھی ہو رہی تھی۔ آپ پر کیا بیتی، ابو؟..

"چچا، اے چچا!" میں اسے پکارنے اور جگانے لگا تاکہ اس کی توجہ جنگ کے مناظر سے ہٹ جائے، تاکہ وہ بتا سکے کہ آپ کا کیا حشر ہوا...

"اے لڑکے! زخمی کو آرام کرنے دو۔ تم گھر جاؤ۔ تمہاری ماں بہت مصروف ہیں..."

اور ہم وہاں سے چل دئے۔ چپ چاپ چلتے رہے۔ بالکل بھول ہی گئے تھے کہ ہم دو ہیں۔ نہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے، نہ باتیں کر رہے تھے۔

میں دیر تک، بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ ذہن میں کوئی بھی خیال نہ تھا جیسے میں غیرموجود ہوں۔ پھر مختلف کمروں اور باہر صحن میں چکر لگانے اور سوچنے لگا۔

شاید وہ زخمی اب بھی درخت کے نیچے ہی لیٹا ہوگا، جنگ کے مناظر دیکھ رہا ہوگا۔ درد میں مبتلا اور مایوسی کا شکار۔ بیوی بچے اس کے خط کے منتظر ہوں گے۔ بےچارے سوچ بھی نہ سکیں گے کہ اس وقت وہ درخت کے نیچے لیٹا ہے۔ نہ انہیں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی وہ مدد کے لئے اس کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔

میں لپک کے باورچی‌خانے میں پہنچا۔ ڈبل روٹی کاٹ کے مکھن لگایا اور اسے اخبار میں لپیٹا۔ میں نے روٹی کے ان ٹکڑوں کو زخمی سپاہی کے لئے لے جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح اس کی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔

اسی اثنا میں امی گھر آ گئیں۔ میں نے پیکٹ کو چھپاتے ہوئے ان کا خیرمقدم کیا۔

"امی، مبارک ہو۔"

"کیا مبارک ہو؟ تمہارے ابو کا خط آیا ہے کیا؟... ہاں، ہاں، آج کا دن بہت اچھا ثابت ہوا۔ لیکن تم تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کتنی تھک گئی ہوں۔ آج آٹھ آپریشن کئے۔ آٹھ!"

"یہ تعداد کم ہے یا زیادہ؟"

"ارے، تم جھوٹ بول رہے ہو!" عورت بےچارے مرات کو تنبیہ کرنے لگی۔ وہ جنگ میں لڑنےوالوں اور جھوٹ بولنےوالے بچوں کے بارے میں کچھ کہے جا رہی تھی... اچھا ہی ہوا کہ ہمارے پیچھے سے کسی گاڑی نے زور سے ہارن بجایا اور ہم ایک طرف ہٹ گئے۔

"زخمی فوجی" مرات نے سرگوشی کی۔

ریڈ کراس کی گاڑی سے طبی عملہ پہلے، دوسرے، تیسرے، ساتویں... اسٹریچر کو نکالنے لگا۔ میں ان لوگوں کو تکے جا رہا تھا لیکن سوکھی سوکھی، نیلی نیلی ٹانگوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ خدا کا شکر کہ ان میں آپ نہیں تھے، ابو۔ وہ سب کے سب اجنبی تھے جنہیں ہمارے قریب سے اسٹریچروں پر اندر لے جایا جا رہا تھا۔ ان کے جسموں میں خون اور جنگ کی بو بسی ہوئی تھی۔

"بس، بس" سرخ پٹیوالی عورت نے کہا، "ابھی ان کو درخت کے نیچے ہی لٹا دیجئے۔ اب اور جگہ نہیں..."

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ان کی حالت نازک ہے۔ دیکھئے نا بےہوش ہیں۔"

"میں آپ سے ازبیک زبان میں کہہ رہی ہوں کہ اب بالکل جگہ نہیں۔"

اسے یعنی آٹھویں زخمی کو جس کے لئے وارڈ میں جگہ نہیں تھی، درخت کے نیچے لٹا دیا گیا اور ہم دھیرے دھیرے اس کے اسٹریچر کے پاس گئے۔ ابو، اتنے میں ہوا نے چادر کا کونا ہٹا دیا اور میں نے مریض کا سوکھا سمٹا، بےجان اور دکھی چہرہ دیکھا۔ وہ کسی حد تک آپ سے مشابہ تھا، بالکل آپ ہی کی طرح طویل قامت اور دبلا پتلا۔ شانے البتہ زیادہ چوڑے تھے جو اسٹریچر میں بمشکل ہی سما رہے تھے۔

وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ غالباً اب بھی جنگ کے مناظر اس کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے: سپاہی بھاگ رہے ہیں، گر رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ درخت اور آسمان بیچ سے پھٹے جا رہے ہیں۔

اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ وہ آپ کو جانتا ہوگا، ابو۔ اور فرہاد ماموں کو بھی۔ یہ سپاہی آپ کے ساتھ جنگل میں چکر

"وہ کتنا اچھا ہے! کتنا نیک ہے! امی! امی! جانتی ہیں میں نے کیا سوچا ہے؟ بتا دوں؟ آئیے اسپتال چل کے اسے اسی وقت لے آئیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں..."

اور ہم دونوں اسپتال گئے۔ کتنی حیرت ہوگی اسے یہ جان کر کہ ہم اسے اپنے یہاں لے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر اس نے منظور نہ کیا تو؟ تو میں امی سے کہوں گا کہ اسے انجکشن لگاکے سلا دیں۔ اور پھر ہم اسے اپنے ہاں لے آئیں گے۔ صبح کو جاگے گا تو کہہ دیں گے کہ بھئی، اس میں کوئی قصور تھوڑی ہے۔ تمہارے بارے میں یہی فیصلہ ہوا ہے۔ آخرکار اسے ہمارا گھر پسند آ جائے گا اور رہنے پر آمادگی ظاہر کر دے گا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں خود پتہ لگا لوں گی کہ آج درخت کے نیچے کسے لٹایا گیا تھا اور اس کا انتخاب کر لوں گی۔"

مجھے تشویش ہوئی کہ امی سے کہیں غلطی نہ ہو جائے۔

ہم روٹی، مکھن اور انگور سے اس کی خاطر مدارات کریں گے۔ اس کے بعد کیا سلوک کریں گے؟ اس کا علاج کیسے ہوگا؟ خیر، یہ تو امی بتا ہی دیں گی۔ مگر وہ ہے کون – کپتان، جنرل، ٹینکچی یا ہواباز؟ ہواباز ہو تب تو بہت ہی اچھا ہے۔ ہواباز مجھے بہت پسند ہیں۔ اسے تمغے بھی ملے ہوں گے؟ غالباً ملے ہیں۔ بزدل ہوتا تو کہیں چھپ جاتا، زخمی ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ جانے کیوں ان کی واپسی میں دیر ہو رہی ہے۔ کہیں امی سے غلطی نہ ہو جائے؟ اچھا ہی ہوا جو زخمی کو ہم نے اپنے یہاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی زندگی پرمسرت ہو جائے گی۔ اب میں اسکول نہ جاؤں گا اور میرے لئے یہ کوئی افسوس کی بات بھی نہیں۔ زخمی کی دیکھ بھال زیادہ ضروری ہے۔ بےشک مجھے افسوس ہے لیکن یہ کام اسکول جانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔

"امی!"

میں اسٹریچر کی طرف لپکا۔ ہاں، وہی ہے!

"وہی ہے امی، وہی!"

میں اسٹریچر کے ارد گرد چکر کاٹتا رہا۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

"زمانۂ امن کے حساب سے تو بہت زیادہ ھے، بیٹے۔ لیکن ان دنوں... ایک ڈاکٹر نے تو بارہ آپریشن کئے اور سب کے سب کامیاب رھے۔"

"اور آپ کے کتنے کامیاب رھے؟"

"امید ھے کہ سب کے سب۔ لیکن ایک آپریشن اتنا دشوار تھا کہ میں بالکل بوکھلا سی گئی۔ سنو تم اسپتال کیوں آئے تھے، بیٹے؟"

"بس یونہی۔ آپ کو دیکھنا چاھتا تھا۔ اجازت نہیں ھے کیا؟"

"نہیں، اجازت نہیں ھے، بیٹے۔ سمجھ گئے نا؟"

سمجھ تو نہیں سکا تھا پھر بھی میں نے جواب دیا:

"جی ھاں۔"

"کل ھمارے یہاں ایک مہمان آئےگا۔"

"کون، امی؟"

"اسپتال میں اب تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں۔ ھم ڈاکٹروں نے زخمیوں کو اپنے گھروں میں رکھنے کا فیصلہ کیا ھے۔"

"مگر کیوں؟"

"وھاں انہیں سخت گھٹن محسوس ھوتی ھے۔"

"تو کوئی زخمی ھمارے ھاں بھی آئےگا؟"

"ھاں، بیٹے۔ اور تم میری مدد کروگے نا؟"

"کروں‌گا کیوں نہیں، امی۔ اچھا تو آپ نے کسی کا انتخاب کر لیا؟ آپ اسے جانتی ھیں؟ اسے ھمارا گھر پسند آئےگا نا؟"

"انتخاب تو ابھی کسی کا نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ اسے ھمارا گھر پسند آئےگا یا نہیں۔ لیکن بہرحال اس کا علاج کرنا ھے۔"

"میں سب کچھ کروں‌گا تاکہ وہ اچھا ھو جائے۔ ٹھیک ھے نا، امی؟"

"اچھی بات ھے۔ آؤ، اب کھانا کھائیں۔"

"امی، کیوں نہ ھم اسی زخمی کو یہاں لے آئیں جو درخت کے نیچے لیٹا ھے۔ بےچارے کے لئے وارڈ میں جگہ نہیں تھی۔ آپ کے لئے تو سبھی یکساں ھیں۔ مجھے یقین ھے کہ ھماری باتیں مانےگا، اخلاق سے پیش آئےگا اور ذرا بھی ضد نہیں کرےگا۔"

"منظور ھے، بیٹے۔ تم میرے ساتھ اسپتال چل کے اس زخمی کو مجھے دکھا دینا۔"

رخصت کرنے کے لئے باہر آئے تو پڑوسیوں میں چہمیگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔

"اور مغدی کے والد؟ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ گھر میں اجنبی مرد ہے..."

"آپ لوگوں کو اس کی فکر نہ کرنی چاہئیے" امی نے جواب دیا۔ وہ بھاگی بھاگی کمرے میں واپس آئیں اور مجھ سے کہا: "ذرا دیر تک کمرے میں نہ آنا..."

آخر پڑوسیوں کو یہ بات کیوں نہیں پسند آئی؟ خیر ہوگا۔ اس مسئلے پر سر کھپانے کی ابھی ہمیں فرصت نہیں۔ ہمارے یہاں مہمان آیا ہوا ہے، زخمی مہمان۔

خوش آمدید، اجنبی چچا! یقین کیجئیے یہاں آپ کو سکون میسر ہوگا۔ جلد ہی آپ اچھے ہو جائیں گے، دوبارہ محاذ پر جا سکیں گے لیکن ذرا احتیاط سے کام لیجئیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دوبارہ زخمی یا ہلاک نہ کر دیا جائے۔ آپ ہلاک کر دئے گئے تو میں رووں گا، امی روئیں گی اور وہ تمام افراد بھی آنسو بہائیں گے جو آپ سے مانوس ہیں۔ وہ گہوارہ سوگ منائےگا جس میں پل کے آپ بڑے ہوئے تھے، وہ گیند سوگ منائےگا جس سے آپ کھیلتے اور جسے بادلوں کی طرف اچھالتے تھے۔ آپ کی کتابیں اور آپ کی کہانیاں سوگ منائیں گی۔ آپ کے اولین جوتے سوگ منائیں گے جنہیں آپ نے اس وقت پہنا تھا جب اپنے پیروں سے چلنا شروع کیا تھا۔ وہ دریا جس میں آپ نہاتے تھے، وہ سیب کا درخت جس پر آپ چڑھتے تھے، آپ کی کھڑکی حتیٰ کہ اس پر بیٹھی ہوئی مکڑی تک آپ کا سوگ منائےگی۔ آپ کی والدہ آنسو بہائیں گی۔ ان کے بال سفید ہو جائیں گے اور وہ بوڑھی ہو جائیں گی..."

میں آپ سے التجا کرتا ہوں، محاذ سے صحیح سلامت لوٹ ضرور آئیےگا۔

ابھی تو خیر تو آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میری اور میری امی کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ ایک شاندار دن کو آپ اٹھ کے کھڑے ہو سکیں، مسکرا سکیں، کہہ سکیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ امی صبح ہی صبح کام پر چلی جایا کریں گی تو میں آپ کو دودھ پلایا کروں گا۔ دودھ ہر ایک سے نہیں پیا جاتا لیکن بہرحال اسے پینا چاہئیے کیونکہ

لیکن سارا مسئله بہ‌آسانی حل ہو گیا۔ بڑے سرخ نشان‌والی گاڑی آئی، اس کا پچھلا دروازہ کھلا، اسٹریچر اس کے اندر رکھا گیا اور میری والدہ نے تحکمانہ انداز سے کہا: "مغدی، تم کیبن میں بیٹھ جاؤ!" اور گاڑی چل دی۔ ہم زخمی کو علاج کے لئے اپنے گھر لئے جا رہے ہیں۔ اب وہ ہمارا ہے، ہم کسی کو اسے ناراض نہ کرنے دیں گے۔ سارا مسئله آسانی سے حل ہو گیا۔ میں بیکار ہی ڈرا اور گھبرایا ہوا تھا۔

ڈرائیور بھی کیسا اداس آدمی تھا۔ بس خاموشی سے اسٹیرنگ گھمائے جا رہا تھا۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ گاؤں، ہنسوں، کودوں مگر ڈرائیور کچھ اتنا سنجیدہ اور مغرور سا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے رہا ہو - خاموشی سے اسٹیرنگ گھمائے جا رہا تھا اور بس۔ میں نے پیچھے مڑکے سفید کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن کچھ دیکھ نہ سکا۔ سوچا امی تو وہاں ہیں ہی۔ سب ٹھیک ہی ہوگا، گھبرانے کی کیا بات ہے۔

گاڑی کی رفتار بہت دھیمی تھی جیسے ڈرائیور جان بوجھ‌کے احتیاط برت رہا ہو۔ آخر ہم تنگ گلیوں میں داخل ہوئے۔ ڈرائیور نے گاڑی کچھ پیچھے کی طرف چلائی جس سے کچھ دیواریں خراب ہو گئیں۔ ان کے مالکوں نے ہمیں برا بھلا کہا حالانکہ ہم ایک زخمی کو اپنے گھر لے جا رہے تھے، علاج کے لئے، جان بچانے کے لئے۔

گاڑی بمشکل ہمارے گیٹ پہنچی تو ہمسایوں کی بھیڑ سی لگ گئی۔ میں بڑے فخریہ انداز سے کیبن سے نیچے اترا اور پچھلا دروازہ کھولنے میں ڈرائیور کی مدد کی۔ پڑوسیوں نے آگے بڑھ‌کے ہمیں گھیر لیا لیکن ہم نے کسی کی طرف توجہ نہ مبذول کی اور بڑی آن کے ساتھ اسٹریچر کو لےکر گیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

"پوچھنے کی ہمت تو نہیں پڑ رہی ہے، پیاری نورا لیکن کیا یہ واقعی مغدی کے والد ہیں؟" محمودہ نے پوچھا۔

"جی نہیں" امی نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ کون ہے؟"

"اسپتال کا ایک زخمی۔"

ہم نے زخمی کو کمرے میں لے جاکے لٹا دیا اور ڈرائیور کو

بےشک یاد ہے...“
”آپ بھولے تو نہیں کہ کس ...؟“

ایرکن چچا، میں یہ ساری باتیں اس شام کو سوچ رہا تھا جب آپ ہمارے یہاں لائے گئے تھے۔ امی نے کہا تھا کہ وہ آپ کے انجکشن لگائیں گی اور انہوں نے مجھے اس کمرے میں داخل ہونے سے روک دیا تھا جس میں آپ بےہوش لیٹے ہوئے تھے۔

میں صحن میں چکر لگاتے لگاتے تنگ آ گیا تو کھڑکی کے قریب پہنچا اور ایک پتھر پر کھڑے ہوکے اندر جھانکا۔ امی اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی تھیں کہ ان کو دیکھکے گرتے گرتے بچا۔ ان کے ہاتھ میں سیرنج تھی اور وہ پلنگ کے قریب‌والی میز سے لپک لپک‌کے روئی، پٹیاں اور دوا کی شیشیاں نکال رہی تھیں۔ وہ آپ سے یا خود اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں کچھ کہتی بھی جا رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے کھڑکی کے شیشے کو کھٹکھٹایا:

”امی، کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟“

لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور پہلے سے بھی زیادہ گھبرا کر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔

غالباً آپ کی حالت نازک تھی۔ اسپتال سے گھر آتے وقت گاڑی کے ہچکولوں نے آپ کو بالکل نڈھال کر دیا تھا اور امی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

میرا جی چاہا کہ باہر نکل‌کے پاس پڑوس کے لوگوں کو مدد کے لئے بلا لاؤں لیکن اس کے بجائے بھاگا بھاگا انگور کی بیلوں کے پیچھے پہنچا اور وہیں ڈرا سہما ہوا بیٹھا رہا۔

ایک بار پھر میں نے امی کو دیکھا، فرش پر پڑے ہوئے روئی کے ٹکڑوں کو، آپ کی پیٹھ پر امی کے ہاتھ اور آپ کی پیٹھ کو دیکھا۔ اور اتنا ڈر گیا کہ زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایرکن چچا، ظالم فسطائیوں نے آپ کی پیٹھ کی کیا حالت بنا دی تھی! چکنی اور مضبوط پیٹھ کتنی بھدی سی لگ رہی تھی۔

ذرا صبر سے کام لیجئے۔ امی آپ کی مدد کریں گی۔ آپ کو اچھا کر دیں گی۔ بس ذرا صبر کیجئے۔

ایک دن ہم ان سب باتوں کو یاد کر کرکے خوب ہنسیں گے۔ آپ

اس کے بغیر آپ جلدی اچھے نہ ہوں گے۔ میں آپ کو دوائیں بھی دوں گا۔ سب سے زیادہ کڑوی گولیوں کو چاھے آپ چپکے سے پلنگ کے نیچے ھی پھینک دیجئیے گا لیکن باقی گولیاں بہرحال کھانی ہوں گی۔
آپ کہیں گے تو میں آپ کو وہ دلچسپ کہانیاں بھی سناؤں گا جو میں نے فرھاد ماموں کے ساتھ مل کر گڑھی تھیں۔ جب آپ کے جسم سے درد جاتا رھے گا تو میں اندازہ لگاؤں گا کہ خود آپ بھی کوئی کہانی تیار کر سکتے ھیں کہ نہیں۔ دراصل مجھے کہانیاں تخلیق کرنے والے بےحد پسند ھیں۔
امی آپ کو پسند آئیں گی۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ سخت لہجے میں بات کریں تو آپ گھبرائیے گا نہیں۔ وہ بہت ھی پیاری خاتون ھیں اور اب جبکہ ان کی نگرانی میں آ گئے ھیں تو وہ ضرور آپ کو اچھا کر دیں گی۔
اور رھے میرے ابو تو جب وہ جنگ سے لوٹیں گے، ان سے دوستی کر لیجئے گا، ان کے ساتھ شطرنج کھیلئے گا۔ ابو کے جگری دوست بہت ھی کم ھیں اور آپ گھبرائیے نہیں، وہ بخوشی آپ سے دوستی کر لیں گے۔
میرے نانا البتہ ھو سکتا ھے کہ شروع شروع میں آپ کو پسند نہ آئیں۔ شاید آپ سوچیں کہ انہیں تو بات بات پر غصہ آ جاتا ھے۔ لیکن دراصل انہیں ھنسی مذاق کرنے کا بڑا شوق ھے۔ ھاں، یہ خیال رھے کہ ان کی موجودگی میں ان کے گاؤں کو ھرگز برا بھلا نہ کہئے گا۔ آپ کہیں یہ بھول کر بیٹھے تو آپ دونوں میں ھمیشہ ھمیشہ کے لئے دشمنی پیدا ھو جائے گی۔
اپنے دوست مرات سے بھی میں آپ کا تعارف کراؤں گا۔ وہ آپ کے لئے عزیز و اقارب کے خطوط لایا کرے گا اور یقین کیجئے کہ کسی نے آپ سے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو مرات ضرور آپ کا دفاع کرے گا۔
آپ کو ھمارا گھر اور ھمارا شہر اچھا لگے تو جنگ کے خاتمے پر یہیں آکے بس جائیے گا۔ ھمارے یہاں آپ مہمان کی حیثیت سے آیا کریں گے اور ھم ساتھ بیٹھیں اور پرانی یادوں کو تازہ کریں گے:
"آپ کو یاد ھے نا کہ جب...؟"

پھر وہ نئی صبح کے، آفتاب کے، انگور کی پتیوں پر پڑے شبنم کے قطروں کے خیرمقدم کے کئے کھڑکی کی طرف لپکتیں۔

میری وہ امی آخر کہاں گئیں؟ وہ تو رات ھی بھر میں جیسے بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اور ھوتیں بھی کیوں نا۔ پریشانی کے عالم میں جاگتے رھنا، مسلسل ایرکن چچا کے پاس بیٹھے رھنا، انہیں دوائیاں کھلانا، کمرے میں ٹہلنا اور سوچتے رہنا کوئی کھیل تھوڑی تھا۔

صرف ذرا ذرا دیر کے لئے وہ میرے پاس آتیں۔ اس وقت بھی کپڑے اتارے بغیر پلنگ کے سرے پر لیٹ‌کر کھڑکی اور چھت کی پرچھائیوں کو تکتی رھتیں۔

"ذرا غور سے سنو، مغدی" امی نے کہا۔ "اب تمہیں خود کو بالغ سمجھنا اور ھر کام میں میرا ھاتھ بٹانا ھوگا۔"

"جی اچھا۔"

"تمہارے ایرکن چچا بیدار ھوں تو فوراً ھی انہیں لال رنگ کی پڑیاوالی دوا کھانے پر مجبور کرنا اور بارہ بجے سفید کاغذوالی گولیاں۔ دودھ بھی پلانا۔ دوپہر کو میں آکر انجکشن لگاؤں‌گی... میرے بیٹے، تم پر بہت کچھ منحصر ھے۔ میں تم پر بھروسہ کرتی ھوں۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی امی، تو اب مجھے کیا کرنا چاھئیے؟"

"مریض کے جاگنے کا انتظار کرنا اور اسے لال رنگ کی پڑیاوالی دوا کھلانا... عقل سے کام لینا..."

امی چلی گئیں لیکن میں ایرکن چچا کے کمرے کے دروازے کچھ دیر تک کھڑا اپنے اوپر لعنت بھیجتا رھا: میں بھی کتنا بزدل اور کام‌چور ھوں! دروازہ نہیں کھول سکتا، اندر نہیں جا سکتا، ایرکن چچا کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ نہیں سکتا، ان کی بیداری کا انتظار نہیں کر سکتا اور انہیں سنانے کے لئے مزاحیہ کہانیاں نہیں سوچ سکتا۔

کسی زمانے میں ایک آدمی، ارے نہیں ایک لڑکا رھتا تھا۔ یہ آدمی، نہیں لڑکا چھوٹا تھا اور آدمی لڑکے سے دوگنا بڑا تھا۔ آدمی کے ایک بیوی تھی اور ایک مرغی ریابا۔ آدمی نے بیوی سے کہا: "لڑکے سے کہو کہ وہ مرغی کو پکڑ لائے۔ مرغی کوئی ایسی ویسی

کی پیٹھ پر جہاں زخم ہے، اسی جگہ مکے ماریں گے اور آپ کو ذرا سا بھی درد نہ محسوس ہوگا۔

"سب کر چکی!"

امی نے باہری دھلیز پر بیٹھ کے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔ میں نے ان کے قریب جاکے ان کے شانے کو دھیرے سے چھوا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ کہنے لگیں:

"جانتے ہو بیٹے، آج میں اپنی نگاہوں میں اتنی اونچی ہو گئی" انہوں نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ "کتنی شاندار بات ہے!"

میں سمجھ نہ سکا کہ شاندار بات آخر کیا ہے جبکہ ایرکن چچا کی حالت اتنی نازک ہے پھر بھی میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی:

"امی، آپ چھت ہی تک کیوں، آسمان تک بلند ہو گئیں۔"

انہوں نے مجھے بھینچ لیا، پیار کیا، مسکرائیں اور پھر ہم دونوں پاگلوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے۔ امی بار بار کہے جا رہی تھیں:

"کتنی شاندار بات ہے بیٹے، کتنی شاندار!"

آسمان پر پرواز کرتے اور پھٹتے ہوئے رنگ برنگے غباروں کے متعلق میرا مختصر خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ امی نے مجھے جگا دیا کیونکہ ان کے کام پر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

پہلے میں نے ضد کی ہوتی تو امی کو مجھے پوری طرح بیدار کرنے کے لئے گھنٹہ بھر گدگدانا پڑتا لیکن اس روز تو میں خود ہی جلدی سے اٹھ گیا۔

"ایرکن چچا کیسے ہیں؟"

"ابھی سو رہے ہیں..."

امی کی آواز دھیمی اور تھکی ہوئی سی تھی۔ چہرے سے بھی تھکن نمایاں تھی اور اتنی دبلی پتلی لگ رہی تھیں جیسے بیماری کے بعد اٹھی ہوں۔ پہلے جیسی ہنس مکھ امی تو کہیں غائب سی ہو گئی تھیں۔ عموماً وہ علی الصباح بیدار ہوکے ابو کو جھنجھوڑتیں اور بلند آواز سے کہتی تھیں:

"طلوع آفتاب کا منظر کم از کم ایک بار تو دیکھ ہی لیجئے۔ کتنا حسین ہے یہ نظارہ!"

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے اور مسکرانے لگے۔ حیرت کی بات ہے کہ میں ان سے ذرا بھی خوف‌زدہ نہ تھا۔ میں نے تو انہیں آنکھ بھی ماری اور کہا:

"یہ میں ہوں، مغدی۔ اور میں آپ کو جانتا بھی ہوں۔ آپ ایرکن چچا ہیں۔ آپ جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ ہم آپ کو اپنے گھر لے آئے ہیں کیونکہ اسپتال میں ذرا بھی جگہ نہ تھی۔ آپ کے لیٹنے اور علاج کرانے کے لئے وہاں جگہ نہ تھی... السلام علیکم..."

وہ مجھے تکے جا رہے تھے اور مسکرا مسکراکر میرے سلیقے کی داد دے رہے تھے۔ میری باتوں کے جواب میں ان کے ہونٹوں کو محض ہلکی سی جنبش ہوتی تھی اور بس۔

"اچھا تو اب" میں نے سختی سے کہا، "لیجئے دوا تو کھائیے۔ آپ کے ساتھ میں بہت بک بک کر چکا۔"

انہوں نے ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے جیسے ہی منہ کھولا، میں نے ایک گولی ان کی زبان کے نیچے رکھ دی—

"نگلیے، نگلیے۔ ذرا سی تو ہے۔"

انہوں نے اپنی سفید، بالکل سفید زبان گھما لی اور گولی تکیے پر گر گئی۔

"مہربانی کرکے تھوکیے نہیں" میں نے کہا۔ "امی کی ڈانٹ سے بچنا چاہتے ہیں تو گولی کھا لیجئے۔"

میں نے گولی پھر ان کے منہ میں ڈال دی۔

"آپ اسے نگلیے اور میں آپ کو گانا سناؤں‌گا تاکہ کڑوی نہ لگے... سائنس‌دانوں کا کہنا ہے کہ آزور جزائر پر تمام مخلوقات سر کے بل چلتی ہیں... تاخ، تاخ، تاخ!"

وہ منہ کھولے میری باتیں سنتے رہے۔ اس اثنا میں گولی ان کی زبان پر پگھل‌کے حلق کے نیچے اتر گئی۔

"کہانی ختم" میں نے کہا۔ "آپ ہمیشہ کہنا مانیں‌گے تو میں آپ سے دوستی کر لوں‌گا..."

اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے۔ پھر گولی کھلانے کا وقت آ گیا تھا۔ اوہ، کتنا مشکل ہے!

امی بھاگی بھاگی گھر آئیں۔ مجھے کمرے سے باہر کرکے ایرکن چچا کا معائنہ کیا۔ یہ دیکھا کہ میں نے ساری گولیاں کھلا دی ہیں

تو تھی نہیں۔ سونے کی تھی سونے کی۔ لڑکے نے مرغی کا تعاقب کرکے اسے پکڑ ہی لیا۔۔

جی نہیں، کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں ایک لڑکا رہتا تھا، بوراتینو۔ اس کے ایک چچا بھی تھا جو کاراباس باراباس* جیسا تھا۔ چچا کے پاس ایک مرغی تھی۔ ریابا۔ وہ پرمسرت، سرسبز آزور جزائر میں رہتے تھے جہاں سائنس‌دانوں کا کہنا ہے کہ سب لوگ سر کے بل چلتے ہیں۔ وہیں تین سروالی وہیل بھی رہتی تھی جو خود ہی گیت تیار کرتی، خود ہی گاتی اور خود ہی تالیاں بجاکر اپنے آپ کو داد دیتی تھی۔ مرغی نے لڑکے سے کہا: "میرا انڈا کھاؤ۔ ایسا ویسا نہیں، سونے کا ہے سونے کا"۔ پھر چچا...

آخر وہ جاگ گئے، آنکھیں کھولیں اور میں خوف کی شدت سے پلنگ کے نیچے چھپتے چھپتے رہ گیا۔ وہ مجھے تکے جا رہے تھے لیکن دیکھ نہیں رہے تھے کہ یہ میں ہوں۔ وہ مجھے تکے جا رہے تھے، اتنی تیز نگاہوں سے کہ میرے اندر ہر چیز دکھنے لگی۔

"السلام علیکم" میں نے کہا۔ "ڈرئیے نہیں۔ میں مغدی ہوں۔"

وہ ڈرے بھی نہیں اور مجھے نہ دیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، بڑے مغرور انداز سے۔ اب ان کا چہرہ انسانی چہرہ معلوم ہونے لگا تھا۔ دیکھا جا سکتا تھا کہ کہاں آنکھیں ہیں، کہاں ہونٹ۔ پہلے تو سب کچھ ایک ہی رنگ کا تھا۔

"اچھی بات ہے" میں نے کہا۔ "یہ نہ سوچئے کہ دوا آپ کو میں دینا چاہتا ہوں۔ اس کی ہدایت تو میری امی نے کی ہے۔"

گولیاں کھانا نہ کھانا ان کے لئے سب برابر تھا۔ لیکن ان کے دیکھنے کا یہ انداز کیوں؟ یہ خاموشی کیوں؟ شاید ان کی حالت بہت خراب ہے۔ اور ایسے میں جبکہ وہ نہ کچھ سمجھ پا رہے نہ منھ کھولنا چاہتے ہیں، انہیں گولیاں کیسے کھلائی جائیں؟

"السلام علیکم" میں نے کہا۔ "السلام علیکم!"

اچانک انہوں نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور مجھے دیکھ لیا۔ دیکھا اور سمجھ گئے کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوں اور خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

---

* بوراتینو کی کہانی کا ایک کردار۔ اڈیٹر۔

"مگر بس ایک نگاہ، سمجھے؟ وہ سو رہے ھیں۔"

تم نے جانے کیوں خوف‌زدہ ہوکے دروازے سے اندر جھانکا، انہیں دیکھا، ذرا دیر تک تکتے رہے، پھر دبی ہوئی آواز سے پوچھا:

"یہ ھیں کون؟ سارجنٹ؟"

مجھے کیا معلوم تھا کہ سارجنٹ عام سپاہی سے بہتر ہوتا ھے کہ نہیں۔ بہرحال میں نے جواب دیا:

"میں تو سمجھتا ہوں کہ جنرل ھیں۔ دودھ نہیں پیتے، دوا نہیں کھاتے اور ضد کرتے ھیں۔"

ہم لوگ باہر صحن میں آئے تو تم نے دریافت کیا:

"اب تو شاید تم مجھ سے دوستی نہ رکھوگے؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو! میں جنرل سے بھی دوستی کروں‌گا اور تم سے بھی۔"

"مجھ سے تو تمہاری دوستی جنرل کی دوستی سے پورے دس دن پہلے کی ھے۔"

"بےشک۔ پھر یہ بھی تو ھے کہ جنرل سے دوستی کرنے میں کافی مشکلات جھیلنی ہوں‌گی۔ میں نہیں جانتا کہ ان سے دوستی کی بھی جا سکےگی کہ نہیں۔ سچی باتیں صاف صاف کہی بھی جا سکتی ھیں کہ نہیں... کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ آج میں نے جنرل کو کس طرح بچایا! مرگی کا جیسا دورہ پڑا تھا، چیخ چلا رہے تھے، برتن توڑے ڈال رہے تھے لیکن میں نے ایک ایسی گولی کھلائی کہ ایک‌دم ہوش میں آ گئے۔ کچھ نہیں تو گھنٹے بھر تو ضرور ھی میرا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے اچھا ہو جاؤں‌گا تو تم کو اعزاز دوں‌گا..."

"اچھا مغدی" تم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، "تم میرا ایک کام کر دوگے؟"

"ھاں، ھاں" میں نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"انہیں دیکھ رہے ہو؟" تم نے تھیلے سے متعدد کاغذات، سیاہ اور نفرت‌انگیز کاغذات نکالے۔ "دیکھ رہے ہو نا کتنے زیادہ ھیں؟.. موت کی ایک خبر لیلی آپا کو پہنچانی ھے لیکن مجھ میں اس کی سکت نہیں۔ وہ میرے لئے ماں جیسی ھیں۔ یہ کاغذ ان کے بیٹے حکیم چچا کے بارے میں ھے۔"

که نہیں۔ پھر لال لال بھیانک روئی، پٹیوں اور دوا کی شیشیوں سے بھری ہوئی بالٹی لئے باہر صحن میں آئیں اور اسے اداسی اور خاموشی کے ساتھ کوڑے کے پیپے میں انڈیل دیا۔

"کہو، کیسی حالت رہی؟" امی نے پوچھا۔

"انہوں نے میری ہر بات مانی! گولیاں بھی کھا لیں۔ امی، وہ اندر کراہ رہے ہیں!"

"سن رہی ہوں۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ایرکن چچا تو بالکل اکیلے چھوڑے ہوئے پلے کی طرح فریاد کئے جا رہے تھے لیکن امی ان کے پاس گئیں تو جلد ہی خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ دیکھنے کی بڑی فکر تھی کہ امی آخر ان کی تکلیف کو کس طرح کم کر دیتی ہیں پر وہ مجھے اندر جانے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

امی اسپتال لوٹ گئیں تو میں پھر ایرکن چچا کے پاس گیا۔ وہ سو رہے تھے... چہرے سے بیزاری سی جھلکتی تھی جیسے جنگ کے متعلق مسلسل خواب دیکھے جا رہے ہوں: کیسے ان پر گولی چلائی گئی، ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی، کیسے وہ گرے، سب کچھ بھول بیٹھے۔ نہ کچھ دیکھ رہے ہیں نہ سن رہے ہیں، بےہوش ہیں۔

اتنے میں تم آ گئے، موات۔

"سنا تمہارے یہاں کوئی زخمی آیا ہے؟"

"تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟ کس نے بتایا؟"

"تمہاری پڑوسن نے۔ سچ ہے نا؟"

"کس انداز سے بتایا تھا؟"

"کسی انداز سے بھی نہیں!"

"بتاؤ نا۔ میں نے تو تمہاری آنکھوں سے اندازہ لگایا..."

"گھبراؤ نہیں۔ میں نے اس کا دماغ درست کر دیا۔ اس کمینی نے کہا: «مغدی کے باپ کو گئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ بیوی دوسرے مرد کو گھر لے آئی»۔"

"اور اس میں برائی کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں... اچھا میں اس زخمی کو دیکھ سکتا ہوں؟" تم نے درخواست کی۔

"مگر بس ایک نگاہ، سمجھے؟ وہ سو رہے ہیں۔"

تم نے جانے کیوں خوف‌زدہ ہوکے دروازے سے اندر جھانکا، انہیں دیکھا، ذرا دیر تک تکتے رہے، پھر دبی ہوئی آواز سے پوچھا:

"یہ ہیں کون؟ سارجنٹ؟"

مجھے کیا معلوم تھا کہ سارجنٹ عام سپاہی سے بہتر ہوتا ہے کہ نہیں۔ بہرحال میں نے جواب دیا:

"میں تو سمجھتا ہوں کہ جنرل ہیں۔ دودھ نہیں پیتے، دوا نہیں کھاتے اور ضد کرتے ہیں۔"

ہم لوگ باہر صحن میں آئے تو تم نے دریافت کیا:

"اب تو شاید تم مجھ سے دوستی نہ رکھوگے؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو! میں جنرل سے بھی دوستی کروں‌گا اور تم سے بھی۔"

"مجھ سے تو تمہاری دوستی جنرل کی دوستی سے پورے دس دن پہلے کی ہے۔"

"بے‌شک۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ جنرل سے دوستی کرنے میں کافی مشکلات جھیلنی ہوں‌گی۔ میں نہیں جانتا کہ ان سے دوستی کی بھی جا سکے‌گی کہ نہیں۔ سچی باتیں صاف صاف کہی بھی جا سکتی ہیں کہ نہیں... کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ آج میں نے جنرل کو کس طرح بچایا! مرگی کا جیسا دورہ پڑا تھا، چیخ چلا رہے تھے، برتن توڑے ڈال رہے تھے لیکن میں نے ایک ایسی گولی کھلائی کہ ایک‌دم ہوش میں آ گئے۔ کچھ نہیں تو گھنٹے بھر تو ضرور ہی میرا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے اچھا ہو جاؤں‌گا تو تم کو اعزاز دوں‌گا..."

"اچھا مغدی" تم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، "تم میرا ایک کام کر دوگے؟"

"ہاں، ہاں" میں نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"انہیں دیکھ رہے ہو؟" تم نے تھیلے سے متعدد کاغذات، سیاہ اور نفرت‌انگیز کاغذات نکالے۔ "دیکھ رہے ہو نا کتنے زیادہ ہیں؟.. موت کی ایک خبر لیلی آپا کو پہنچانی ہے لیکن مجھ میں اس کی سکت نہیں۔ وہ میرے لئے ماں جیسی ہیں۔ یہ کاغذ ان کے بیٹے حکیم چچا کے بارے میں ہے۔"

که نہیں۔ پھر لال لال بھیانک روئی، پٹیوں اور دوا کی شیشیوں سے بھری ہوئی بالٹی لئے باہر صحن میں آئیں اور اسے اداسی اور خاموشی کے ساتھ کوڑے کے پیپے میں انڈیل دیا۔

"کہو، کیسی حالت رہی؟" امی نے پوچھا۔

"انہوں نے میری ہر بات مانی! گولیاں بھی کھا لیں۔ امی، وہ اندر کراہ رہے ہیں!"

"سن رہی ہوں۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ایرکن چچا تو بالکل اکیلے چھوڑے ہوئے پلے کی طرح فریاد کئے جا رہے تھے لیکن امی ان کے پاس گئیں تو جلد ہی خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ دیکھنے کی بڑی فکر تھی کہ امی آخر ان کی تکلیف کو کس طرح کم کر دیتی ہیں پر وہ مجھے اندر جانے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

امی اسپتال لوٹ گئیں تو میں پھر ایرکن چچا کے پاس گیا۔ وہ سو رہے تھے... چہرے سے بیزاری سی جھلکتی تھی جیسے جنگ کے متعلق مسلسل خواب دیکھے جا رہے ہوں: کیسے ان پر گولی چلائی گئی، ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی، کیسے وہ گرے، سب کچھ بھول بیٹھے۔ نہ کچھ دیکھ رہے ہیں نہ سن رہے ہیں، بےہوش ہیں۔

اتنے میں تم آ گئے، مہوات۔

"سنا تمہارے یہاں کوئی زخمی آیا ہے؟"

"تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟ کس نے بتایا؟"

"تمہاری پڑوسن نے۔ سچ ہے نا؟"

"کس انداز سے بتایا تھا؟"

"کسی انداز سے بھی نہیں!"

"بتاؤ نا۔ میں نے تو تمہاری آنکھوں سے اندازہ لگایا..."

"گھبراؤ نہیں۔ میں نے اس کا دماغ درست کر دیا۔ اس کمینی نے کہا: «مغدی کے باپ کو گئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ بیوی دوسرے مرد کو گھر لے آئی»۔"

"اور اس میں برائی کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں... اچھا میں اس زخمی کو دیکھ سکتا ہوں؟" تم نے درخواست کی۔

"میرے حکیم کو انگور بےحد پسند ہیں" لیلی آپا نے کہا۔ "بچپن میں جب وہ مغدی، تمہارے برابر تھا تو دن دن بھر بیلوں کے پاس بیٹھا انگور کھاتا رہتا۔ میں پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی، اسے وہاں سے بھگاتی کیونکہ ڈرتی تھی کہیں پیٹ نہ پھٹ جائے..."

ہاں، ہاں، وہ بےشک انگور کی بیلوں کے پاس بیٹھے تھے۔ اور اب بیٹھے بیٹھے اس زمانے کو یاد کر رہے ہیں۔ والدہ کے انگوروں کا انتظار کر رہے ہیں... نہیں، حکیم چچا زندہ ہیں!

"مرات!" میں چیخ پڑا۔ "یہ خبر جھوٹی ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ان کی والدہ ان کے لئے انگور توڑ رہی ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مغدی؟"

"لو! یہ رہا!" میں نے اس سیاہ کاغذ کے ٹکڑے کرکے زمین پر پھینک دیا۔ انہیں روندنے اور چلانے لگا: "حکیم چچا زندہ ہیں! وہ زندہ ہیں!"

امی نے مسلسل تین راتیں زخمی کے کمرے کے اندر ہی گزار دیں۔ تینوں راتوں کے دوران مجھے کمرے کی دیوار کے پیچھے سے امی کے تشویش‌ناک قدموں کی آہٹیں اور ایرکن چچا کی آہیں سنائی دیتی رہیں۔ اکثر مکان میں ایسا سناٹا چھا جاتا کہ انگور کی پتیاں تک نہ ہلتیں: چچا بےہوش ہو جاتے تھے۔ تین دن اور تین رات امی برابر ان کے کمرے سے خون سے تر بھیانک روئی اور پٹیوں سے بھری بالٹیاں باہر نکالتی رہیں۔

ہماری گفتگو کے لئے اب ایک ہی موضوع رہ گیا تھا: زخمی کی حالت۔ سوتے جاگتے ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ زخمی کی طبیعت کیسی ہے۔ ٹھیک سے نیند آئی کہ نہیں۔ امی کی آنکھوں کو دیکھ دیکھکے میں اندازہ لگاتا کہ ایرکن چچا کی حالت کتنی نازک ہے، امی کو کتنی مشکلات کا سامنا ہے۔ صبح ہی صبح وہ اسپتال چلی جاتیں۔ دوپہر کو آکے مرہم‌پٹی کرتیں، انجکشن لگاتیں اور شام کو پھر ان کے لئے تشویش اور بےچینی کے لمحات کا آغاز ہو جاتا۔ لیکن وہ ذرا بھی تو شکایت نہ کرتیں۔ وہ تو ایسا رویہ اپنانے کی کوشش کرتیں جیسے سب کچھ ٹھیک ہو، گھبرانے کی

"هلاک کر دئے گئے؟"

"هاں۔"

"کوشش کروں‌گا۔ کر دوں‌گا تمہارا یہ کام مرات... مگر اس وقت تو باهر خاصی گرمی هے..."

"ابهی پہنچا دو، مغدی۔ میں سیاہ کاغذ کو دیر تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ ابھی پہنچا دو نا، جنرل تو سو رها هے۔"

"اچھا" میں نے جواب دیا، "جیسی تمہاری مرضی... لیکن خیال رکھنا کہ جنرل کہیں جاگ نہ جائیں۔"

میں چل دیا، مٹھی میں حکیم چچا کی، طاقتور اور لحیم شحیم چچا کی موت کا سیاہ کاغذ دبائے هوئے۔ وہ گھر سے صحیح سلامت گئے تھے اور سیاہ، نفرت‌انگیز کاغذ کی شکل میں واپس لوٹے۔ اسے پڑھ‌کر لیلی آپا زار و قطار روئیں‌گی، بےحال هو جائیں‌گی، حکیم چچا کو پکارتی رهیں‌گی، منت سماجت کرتی رهیں‌گی کہ وہ جنگلوں سے لوٹ آئیں۔ وہ سوچیں‌گی کہ انہوں نے، ایک ماں نے اپنے بیٹے کو اتنا زیادہ ناراض کر دیا کہ وہ ان سے همیشه همیشه کے لئے روٹھ گیا... نہیں، نہیں، یہ مذاق هے، نفرت‌انگیز مذاق۔ ممکن هی نہیں کہ حکیم چچا اپنی ماں کے پاس واپس نہ آئیں۔ وہ تو اپنی ماں سے بہت محبت کرتے تھے!

میں پل بھر تک لیلی آپا کے گیٹ کے سامنے کھڑا رها پھر اسے کھول‌کے اندر قدم رکھا، پہلا، دوسرا... تاریک گیلری سے گزرکے صحن میں پہنچا اور وهاں لیلی آپا کو انگور کی بیلوں کے نیچے دیکھتے هی میرا چہرہ سرخ پڑ گیا جیسے بلا اجازت پرائے گھر میں آ گیا هوں۔

"ارے مغدی، کیا بات هے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی، میں..."

"کچھ سنائی نہیں دیا۔ خیر میں ابھی اس بڑےوالے خوشے کو کاٹ‌کے نیچے اترتی هوں... یہ حکیم بیٹے کے لئے کاٹ رهی هوں... لکھا هے کہ انگور کھانے کو اس کا بہت جی چاهتا هے۔ میرا بیٹا..."

هاں، هاں، میرا بھی یہی خیال تھا۔ حکیم چچا زندہ هیں۔ ماں ان کے لئے انگور توڑ رهی هیں۔ ان کے بیٹے کو بڑی خوشی هوگی کیونکہ وہ انگور بہت پسند کرتے هیں...

ھیں۔ ابو، آپ بھی بڑے مسخرے ھیں۔ جنگ میں جیسے آپ روایتی کہانی کے کردار بہادر قلیچ باتر ھوں۔

خیر، کوئی بات نہیں۔ محاذ سے آپ یونہی پرمسرت خطوط بھیجتے رھئے۔ سب لوگ افسردہ ھوں، آزردہ ھوں، قتل کریں، کچھ بھی ھو مگر ابو آپ ھمت نہ ھاریےگا...

امی نے بتایا کہ آپ کا خط راستے میں تھا تبھی آپ کی ٹریننگ مکمل ھو گئی ھوگی اور آپ سچ مچ لڑنے کے لئے روانہ کر دئے گئے ھوں‌گے۔ میری دلی تمنا ھے کہ آپ عمدہ، بہادر اور زندہ‌دل سپاھی بن جائیں۔ پھر کیا مجال جو کوئی آپ کو ھلاک کر سکے...

## ٦

کتنی اچھی بات ھے! آج ایرکن چچا کے منھ سے پہلا لفظ نکلا۔ انھوں نے جاگ‌کے مجھے اور امی کو دیکھا اور کہا: "ستارہ"۔ ھم دونوں کرسیوں سے فوراً ھی اٹھ کھڑے ھوئے، اس انتظار میں کہ اور کیا کہتے ھیں۔ لیکن وہ خاموش رھے جیسے کہہ رھے ھوں کہ آج کے لئے بس اتنا ھی کافی ھے۔ وہ ھماری طرف دیکھ‌کے کچھ جھینپے سے انداز میں مسکرائے پھر کبھی امی کو، کبھی مجھے، کبھی کمرے کو، کبھی دیوار کو، کبھی گھڑی اور کبھی کھڑکی کو تکنے لگے۔

امی کو تو بھاگم بھاگ اسپتال پہنچنا تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی زخمی کو کروٹ بدلوائی اور اس کے بول اٹھنے کی خوشی میں بڑی سی سیرنج سے انجکشن لگا دیا۔

"امی، یہ "ستارہ" کیا ھے؟" میں نے انھیں گیٹ پر رخصت کرتے ھوئے پوچھا۔

"اس جگہ کا نام ھے جہاں تمھارے ایرکن چچا پیدا ھوئے تھے۔ کہیں وادی فرغانہ میں ھے... اچھا تو ذرا عقل سے کام لینا اور اپنی باتوں سے انھیں دق نہ کرنا۔"

"ستارہ" میں نے کہا اور تلفظ پر غور کیا۔ گونجتا ھوا اور خوبصورت لفظ! ظاھر ھے کہ چچا نے خواب میں دامن کوہ میں آباد آبائی گاؤں کو دیکھا ھے اور بچپن کی یادیں تازہ ھو گئیں: وہ چھوٹے

کوئی بات ہی نہ ہو۔ مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ اتنے صبر و تحمل اور آزادی سے کام لے سکتی ہیں۔ ابو، یقین مانیے کہ آپ کی غیرموجودگی میں وہ ہر کام سوچ سمجھ‌کے کر رہی ہیں۔ اور مجھے اور آپ کو ڈر تھا کہ آپ کے محاذ پر جاتے ہی نہ جانے ان کا کیا حال ہو۔

ابو، ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ کے دلچسپ اور مزاحیہ خط نے ہمیں بڑا حوصلہ دیا۔ ہم دونوں بار بار آپ کے خط کو دیکھتے رہے۔ اگلے روز مرات نے مزید دو بار اس کو پڑھ‌کے سنایا۔ سچ پوچھئے تو مجھے پوری طرح حفظ ہو گیا۔

پھر میں نے سوچا کہ آخرکار آپ کو اس مقام پر لے ہی جایا گیا جہاں لڑائی ہونےوالی تھی۔ مگر وہاں جنگ کہاں ہو رہی ہے۔ وہاں تو چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہیں، اونچے اونچے، موٹے موٹے درخت۔ هاتھ کو هاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ آپ جنگلوں میں چکر کاٹتے کاٹتے حیران ہوئے جا رہے ہیں اور خاک بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ جنگل میں آپ پہلی بار پہنچے ہیں نا۔ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں، درختوں پر چڑھ رہے ہیں، پھل توڑ رہے ہیں اور جیسا کہ امی کہتی ہیں، ایسے میں آپ کو ہمارا خیال تک نہیں آ رہا ہے۔

اچانک آپ کے کمانڈر حکم دیں گے: "لائن میں کھڑے ہو جاؤ!" آپ گلہری کی طرح تیزی سے نیچے اتریں گے۔ حکم ملےگا "دائیں مڑو! بائیں مڑو!" اور کمانڈر آپ پر نکتہ‌چینی کریں گے کیونکہ آپ روسی زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔ پھر لوگ دائیں طرف مڑیں گے۔ بس ایک آپ ہی غلطی سے بائیں طرف مڑیں گے۔ کیوں، ہے نا مضحکہ‌خیز بات؟

پھر کمانڈر آپ کو زمین پر لیٹ‌کے درختوں کے درمیان رینگنے پر مجبور کریں گے۔ سب کو اس میں کامیابی ہوگی۔ بس ایک آپ، جیسے جان بوجھ‌کر، صنوبر کے دو تنوں کے درمیان پھنس‌کر رہ جائیں گے۔ نہ آگے بڑھ سکیں گے، نہ پیچھے اور زور زور سے چلائیں گے: "بھائیو، میری مدد کرو، مجھے یہاں اکیلا چھوڑکے نہ جاؤ ورنہ ریچھ کھا جائیں گے!" بےچارے ابو... سپاہی آپ کی ٹانگیں پکڑکے گھسیٹ رہے ہیں لیکن کمانڈر آپ کے بھدےپن کی وجہ سے تنبیہ دے رہے

"ارے چچا، ابو نے ایسا مزاحیہ خط بھیجا ہے کہ نہ پوچھئے۔ پڑھکے میں نے اور امی نے خوب ہی تو قہقہے لگائے۔ جیسے وہ جنگل میں درختوں کے تنوں میں پھنس کر رہ گئے ہوں اور ان کے پیروں کو پکڑکے باہر گھسیٹا گیا ہو۔ لیکن آپ نہ سوچ بیٹھیےگا کہ وہ جنگ میں بس شرارتیں ہی کر رہے ہیں۔ وہ بڑے ذہین ہیں... امی کے سارے کام پہلے وہی کیا کرتے تھے۔ اور امی کا نام نورا ہے۔ وہ..."

"ماں اچ۔ چھی ہیں" ایرکن چچا نے دھیرے سے کہا۔ "اچ۔ چھی ہیں..." اور پھر وہ چھت کو تکنے اور جانے کیا سوچنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اب وہ میری باتیں سن ہی نہ رہے ہوں۔ یقیناً وہ امی ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے، ان راتوں کے بارے میں جو امی نے ان کے بستر کے قریب گزاری تھیں، ان انجکشنوں کے بارے میں جن سے امی نے انہیں راحت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

"ابو کی آواز آپ سنیں گے؟"

میں کھڑکی کھول کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک کڑک سی سنائی دی اور ابو کی آواز گونجنے لگی:

"اٹنشن! ورزش کے لئے کھڑے ہو! ایک، دو... مارچ! دائیں مڑو، بائیں مڑو!"

ایرکن چچا نے حیرت‌زدہ ہوکے دانت کٹکٹائے اور سرد آہ بھری۔

"ارے یہ ابو ہیں، میرے ابو!"

لیکن وہ خاک بھی نہ سمجھ سکے، کراھتے اور بستر میں بےچین ہوتے رہے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے ابو کی آواز آخر تک سنے بغیر ہی ریکارڈ پلیئر بند کر دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں" میں نے کہا۔ "پریشان نہ ہوں..."

شاید وہ میرے ابو پر رشک کر رہے تھے؟ سوچ رہے تھے کہ ابو تو لڑ رہے ہیں اور وہ خود یہاں لیٹے ہوئے ہیں، زخمی اور بےبس۔ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم نے ایرکن چچا کی تیمارداری کتنے دنوں تک کی۔ شاید ایک ماہ، دو ماہ۔ ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ میں صبح

سے لڑکے ھیں۔ پہاڑ پر چڑھتے جا رہے ھیں۔ ان کا ننھا سا کتا پیچھے پیچھے ھے۔ بزدلی سے بھونک بھونک‌کے جیسے التجا کر رھا ھو: اتنی بلندی تک نہ چڑھو۔ اس میں خطرہ ھے۔ لیکن لڑکے کو کوئی فکر نہیں۔ بادلوں تک چڑھتا جا رھا ھے۔ نیچے کے مناظر کتنے خوبصورت ھیں! ھر طرف لالے ھی لالے جیسے الاؤ دھک رہے ھوں۔ ان پھولوں کے درمیان مکان چھوٹے چھوٹے مکعب جیسے نظر آتے ھیں۔ یہ رھا خود لڑکے کا، ایرکن کا مکان۔ والدہ سوت کات رھی ھیں۔ چھوٹی بہن صحن میں بکری کے بچے سے کھیل رھی ھے۔ کتنا پیارا سماں ھے، کتنا پیارا! پہاڑ اور ھوائیں بھی جیسے طوطے کی طرح رٹ لگائے ھوئے ھوں: "کتنا پیارا!"

اتنے میں ایرکن چچا جاگ اٹھے لیکن دیر تک سمجھ نہ سکے کہ کس بات پر اتنے خوش ھیں۔ ان کی نگاھوں میں تو اجنبی چہرے ھوتے تھے، میرا اور امی کا چہرہ۔ جسم میں درد اور انجکشن، انجکشن۔ "ارے" انہوں نے سوچا، "میں تو بھول ھی گیا تھا کہ جنگ چھڑی ھوئی ھے..."

میں زخمی کے سرھانے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کتنے دنوں سے ان کے چہرے کو دیکھ رھا ھوں۔ منتظر ھوں کہ آخرکار وہ بولیں‌گے، مسکرائیں‌گے، اٹھ کھڑے ھوں‌گے... لیکن عنقریب تو یہ سب ھونے سے رھا۔ خیر، کچھ اور صبر کروں‌گا، کچھ اور انتظار...

ایرکن چچا ایک بار بول چکے ھیں تو اب تو انہیں سب کچھ سمجھنا ھی چاھئے۔ میں اپنی نگاھیں ان کے چہرے پر جما دیتا ھوں تو دھیرے دھیرے اس پر سرخی چھا جاتی ھے، کچھ پرسکون سا ھو جاتا ھے۔ آنکھیں پرمعنی سی ھو جاتی ھیں، سب کچھ سمجھنے کے قابل آنکھیں۔ چکنا چکنا خوبصورت سا چہرہ، ستواں ناک اور پرکشش ٹھوڑی۔ وہ خاصے طاقتور نظر آتے ھیں۔ پیر تو اتنے لمبے ھیں کہ پلنگ سے کچھ باھر نکلے ھوئے ھیں اور شانے اتنے چوڑے کہ پلنگ پر جیسے سما ھی نہ رہے ھوں۔ ٹھوڑی میں خفیف سا گڑھا جو غالباً بچپن سے موجود ھے۔

وہ لیٹے لیٹے مجھے گھورے جا رہے ھیں۔ میرے ھاتھوں، بالوں اور ناک کو دیکھ دیکھ‌کے مسکرا رہے ھیں۔ بےشک میں انہیں پسند ھوں۔ اور اب میں انہیں بتا رھا ھوں:

امی کہیں گی: "اپنا یہ نکماپن اب ختم بھی کرو۔ آٹھواں سال شروع ہو چکا ہے، اب تو کچھ عقل بڑھانے کی سوچو۔"

وہ ایسی باتیں پہلے کب کہتی تھیں، عقل بڑھانے کا سوال پہلے کہاں اٹھتا تھا۔ پہلے تو ایرکن چچا کی تیمارداری زیادہ ضروری تھی۔

"تو قصہ ختم" میں نے دوہرایا اور سمٹ گیا۔

ایرکن چچا مسکرانے اور میرے بالوں کو الجھانے لگے۔ ہلکے بالوں کو الجھانا کیسی بری عادت ہے۔ پھر انہوں نے کہا:

"کوئی بات نہیں، بیٹے! تمہارے ہاں کوئی دوسرا چچا آ جائے گا۔ تمہاری امی کسی اور کو لے آئیں گی۔"

"مجھے دوسرا چچا چاھئے ہی نہیں۔ خواہ مخواہ نخرے دکھائے گا، دوائیاں تھوک دیا کرے گا۔"

"نہیں تو، دوسرا چچا زیادہ دلچسپ ہوگا۔ میرا جیسا سپاہی تھوڑی، جنرل ہوگا جنرل!"

"مجھے جنرل نہیں چاھئے۔ گھمنڈی ہوگا۔ میں جان بوجھ‌کر اس کی تیمارداری نہ کروں گا۔"

"تم بھی عجب لڑکے ہو، مغدی! بھئی، جنرل طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ اپنی امی کے ساتھ اسپتال جاکے کسی جنرل کو منتخب کر لینا۔"

مجھے قائل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ایرکن چچا۔ آپ کی عدم‌موجودگی گراں گزرے گی۔ صبح کو جاگا کروں گا تو آپ پاس نہ ہوں گے۔ آپ کا بستر خالی اور ٹھنڈا ہوگا... سلام کہوں گا تو آپ خاموش رہیں گے جیسے ناراض ہوں۔ صحن میں جاکے سننا شروع کروں گا تو صرف انگور کے پتوں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ ہی سنائی دے گی۔ سڑک پر جاکر آپ کو تلاش کروں گا لیکن آپ نظر نہ آئیں گے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ جانے آپ جنگ سے دوبارہ ہمارے یہاں لوٹیں گے بھی کہ نہیں۔

"دیکھو ہمت نہ ھارنا" ایرکن چچا نے اچانک کہا۔ "واپس آنے کی کوشش کروں گا..."

"کوئی اچھی بات نہیں کہ آپ اپنی والدہ کا دیا ہوا تعویذ نہیں پہنتے۔ بڑے بوڑھے لوگ جانتے ہیں کہ..."

سے شام تک انہیں دوائیں کھلاتا، کہانیاں سنا سناکے دل بہلاتا اور شام سے صبح تک امی ڈیوٹی دیتیں۔ دن بڑی یکسانیت کے ساتھ گزر رہے تھے اور بہت ھی طویل اور غیرمعمولی لگتے تھے۔ میں نے باھر نکلنا تقریباً بند ھی کر دیا تھا اور ایک دن یہ دیکھکر مجھے سخت حیرت ھوئی کہ انگور کی بیلوں کے سارے پتے گر چکے ھیں۔

اور تب... ھرا! ایرکن چچا، بہت پیارے، بہت اچھے چچا جنہوں نے اتنی مصیبت جھیلی تھی جن کی پیٹھ میں اتنا شدید درد ھوتا تھا، اٹھ کھڑے ھوئے! میں اور امی گھبرائے ھوئے، سہمے ھوئے رہتے تھے کہ وہ کبھی اٹھکے گھر سے باھر جا بھی سکیں گے، درختوں، لوگوں، آسمان اور سورج کو دیکھ بھی سکیں گے، چیخ مارکے کہہ بھی سکیں گے: "واہ، واہ! کتنی شاندار ھے یہ زندگی بھی!"

اور آخرکار وہ اٹھ ھی کھڑے ھوئے۔ انہوں نے زور سے پکارا:

"ارے مغدی، میرے پاس آؤ!"

میں دیوانگی کے عالم میں، کچھ سہما ھوا، کچھ مسروروشاداں ان کے کمرے میں داخل ھوا۔ کچھ سمٹ سمٹاکے جیسے ان کی نہیں خود میری کمر ابھی چرمرا اٹھےگی، ان کا بازو پکڑا اور کمر سیدھی کرنے اور فرش پر کھڑے ھونے میں سہارا دیا۔

"ارے واہ!" وہ خوشی سے پکار اٹھے۔ "سب ٹھیک ھو گیا، ھرا!"

"ھرا! ھا، ھا، ھا!"

"ھا، ھا، ھا! ھرا!"

"اب محاذ پر واپسی ممکن ھوگی!"

"جی ھاں" میں نے کہا، "اب آپ محاذ پر واپس جا سکیں گے!"

لیکن اچانک مجھ احمق کا جی چاھا کہ رو پڑوں۔

"ھاں، تو قصہ ختم۔"

ھاں، ایرکن چچا اچھے ھو گئے۔ وہ ایک بار پھر جنگلوں کو لوٹ جائیں گے، جنگل جن کی دلچسپ کہانیاں وہ ھر شام کو سناتے تھے۔ میں اور امی پہلے کی طرح پھر تنہا رہ جائیں گے۔ ھمارے دل اوب جائیں گے، ھم پر مایوسی غالب آ جائےگی۔ بیٹھے بیٹھے ابو کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام ھی نہ رہ جائےگا۔ اور شاید امی مجھے زبردستی اسکول بھیج دیں، اس بھیانک لنگڑے ماسٹر کے پاس۔

"ارے بیٹے، اس میں بھی ایک دلربائی ہے۔ تم زندگی کو خاک بھی تو نہیں سمجھتے!"

ہم دونوں سائن بورڈ پر بحث کر رہے تھے، ہنس رہے تھے کہ اتنے میں پیچھے سے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

ہماری دو پڑوسنیں پگلی محمودہ اور اس کی احمق سہیلی شرافت ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

میں چونک پڑا: دونوں اس طرح گھورے جا رہی تھیں جیسے ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ ایرکن چچا نے بغیر کچھ سمجھے بوجھے ہی سر کی جنبش سے انہیں سلام کر لیا۔

"اری پڑوسن، یہی ہے وہ مرد" محمودہ نے ایرکن چچا کی طرف نفرت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کمبخت لڑکے کی ماں نورا نے اسی مرد کو بےشرمی کے ساتھ اپنی چھاتی سے گرمی پہنچائی ہے۔ لڑکے کا باپ لڑائی میں اپنا خون بہا رہا ہے۔ اس بےچارے کو ان باتوں کی کیا خبر... توبہ، توبہ!.. کیسے زمانے آ گئے..."

"واہ رے زمانے" شرافت نے سفید بالوں‌والے سر کی جنبش سے محمودہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "جھوٹ سچ، سب ایک ہو گیا۔ لوگوں کی بیویاں غیر مردوں کے ساتھ ہم‌بستری کر رہی ہیں۔"

ایرکن چچا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کھوئے ہوئے سے کھڑے اپنے گالوں کو سہلائے جا رہے تھے۔

"آپ کو شرم نہیں آتی؟"

"تم ہمیں شرم دلانے کی کوشش چھوڑو۔ ہم نہ غیروں کی بیویوں کو رسوا کرتی ہیں، نہ اجنبی بستروں پر سوتی ہیں۔ تمہیں تو اس لڑکے کے باپ سے شرمندہ ہونا چاہئے۔ وہ ابھی زندہ ہے اور تم اس کی بیوی سے عشق لڑا رہے ہو! تم نے ہمیں اندھا بہرا سمجھ رکھا ہے کیا؟ ہم کچھ دیکھتی سنتی نہیں ہیں کیا؟ بھلائی اسی میں ہے کہ تم ہمارے محلے سے چلتے بنو!"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ لعنت ہو..." ایرکن چچا کو غصہ آنے ہی والا تھا کہ میرا خوف ختم ہو گیا اور میں نے پڑوسنوں سے کہا:

"آپ بدنیت اور بری عورتیں ہیں! اتنی مشکلوں سے تو ہم نے

"کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہاں دیکھا جائےگا، بیٹے۔ دراصل عین مقام پر ہر بات ہمیشہ زیادہ واضح ہوتی ہے۔"

"مگر آپ محاذ پر جلدی تو نہیں جائیں‌گے نا؟ کچھ وزن بڑھانا چاھئے۔ کم از کم مہینہ بھر تو اس میں لگےگا ہی۔"

"وزن تو جنگ ہی میں بڑھےگا۔ اچھا موقع ہے..."

کاہے کو مذاق اڑا رہے ہیں آپ، ایرکن چچا؟ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے نزدیک میرے آپ کے پاس ہونے یا نہ ہونے کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ آپ بڑے عمروالے لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں...

"خیر، بہت ہو چکا" ایرکن چچا نے کہا۔ "اپنے ابو کی ہدایت یاد ہے نا: "بوراتینو کی طرح ناک اونچی رکھنا!"

میں نے گہری سانس لی اور ایرکن چچا کا بازو تھام‌کے انہیں سڑک پر لے گیا۔

تو یہ رہی ہماری سڑک جسے ایرکن چچا کو دکھاتے شرم آتی ہے۔ لیکن انہوں نے تو آنکھیں میچ لیں اور تیز تیز، گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

"اوہ!" انہوں نے آنکھوں سے کچھ نکالا، شاید غبار یا کوئی تنکا اور ادھر ادھر دیکھ‌کے خوش ہونے لگے۔ پھر انہوں نے آنکھوں سے کچھ اور نکالا۔ لعنت ہو کمبخت اس سڑک پر! پل بھر بھی تو یہاں نہیں کھڑا ہوا جاتا۔ ہوائیں چھتوں سے ضرور تنکے اڑا لاتی ہیں۔

"اچھا ہے!" ایرکن چچا نے کہا۔ "بہت خوب، بیٹے! تم نے اس سڑک کی بیکار ہی شکایت کی تھی۔" پھر وہ ہمارے گیٹ کے سائن بورڈ کو دیکھ‌کر اچانک مسکرانے لگے: "پکی اینٹوں کی سڑک، مکان نمبر ۵۔"

بھلا اس میں کون سی بات مضحکه‌خیز ہے؟ انہیں تو آج ہر چیز مضحکه‌خیز ہی لگ رہی ہے۔ میرے احساسات اس کے بالکل برعکس ہیں۔

"پکی اینٹوں کی سڑک! آس پاس کہیں ایک پکی اینٹ تو نہیں۔"

"میں تو کہہ چکا ہوں..."

"اری ڈاکٹرنی، تم ذہین عورت ہو۔ میں تو تمہاری عزت کرتی ہوں لیکن لوگ... لوگوں کو البتہ حیرت ہے..."

"کاہے کی حیرت؟"

"اسی بات کی حیرت کہ یہ غیر مرد آخر کیسے..."

"ایرکن کا میرے یہاں علاج ہو رہا ہے۔ آپ حیران نہ ہوں!"

"... تم بہرحال شادی شدہ عورت ہو..."

"آخر اس میں کون سی قیامت آ گئی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"... اور ہمارا خیال ہے کہ تمہارے شوہر انور، ہمارے معتبر انجینیر..."

"آپ کا خیال ہے کہ وہ ناراض ہوں‌گے؟ تو سن لیجئے کہ میرے شوہر انجینیر انور خوش ہیں!.. امید ہے کہ اس یقین‌دہانی کے بعد ساری چہ‌میگوئیاں ختم ہو جائیں‌گی... لیکن میرے شوہر خوش نہ ہوتے تب بھی ایرکن کا ہمارے یہاں علاج ضروری ہوتا!.. اور کچھ پوچھنا ہے؟"

اس کے بعد کچھ اور نہ پوچھا گیا۔

"اندر جاکے لیٹ جائیے" امی نے ایرکن چچا کو سختی سے ہدایت کی۔ وہ اندر آکے بستر پر لیٹے اور چھت کی پرچھائیوں کو تکنے لگے۔ اور امی کچھ اس انداز سے انجکشن تیار کرنے لگیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابو کا ذکر کیسے آ گیا۔ امی اسپتال میں دم توڑتے ہوئے ایرکن چچا کو لے آئیں تو حرج ہی کیا ہے؟ آج ہی تو وہ بستر سے اٹھ‌کے کھڑے ہوئے ہیں۔ معمر لوگوں کو تو خوش ہونا چاہئے مگر وہ تو... اور پھر اس میں آخر کیا بری بات ہے کہ ایرکن چچا امی سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں، ان کی اسپتال سے واپسی کا دن بھر انتظار کرتے ہیں۔ وہ آتی ہیں تو کھل اٹھتے ہیں اور تکلیف‌دہ انجکشن لگوانے کے بعد چھت تک اچھلتے اچھلتے رہ جاتے ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم نے تو ابو کو بھی جب ایرکن چچا کے بارے میں لکھا تو انہوں نے امی کی تعریف کی اور دفتی کا ایک تمغہ بناکر بھیج دیا جس پر تحریر تھا: «درجۂ اول کا تمغہ مروت اور ہمدردی کے لئے» ابو نے وعدہ کیا کہ اصلی تمغہ لوٹنے کے بعد دیں‌گے۔

ایرکن چچا کا علاج کیا اور آپ... یہ محلہ کوئی آپ کی جاگیر تھوڑی ہے، یہ تو سب کا ہے..."

انہوں نے میری باتیں کاٹتے ہوئے کہا:

"آخر یہ کس قوم کا رواج ہے؟ آخر یہ کہاں دیکھا گیا ہے کہ شادی شدہ عورت غیر مرد کے ساتھ سوئے؟ کیسی شرم کی بات ہے!"

"چلی جائیے یہاں سے، آپ بدنیت اور بری عورتیں ہیں! ابو واپس آکے آپ کو مزہ چکھا دیں‌گے! آئیے گھر چلیں" میں چچا کو گیٹ کے اندر کھینچنے لگا لیکن وہ ضد کرنے لگے، کانپنے لگے، بلند آواز سے بڑبڑانے لگے۔

یہ ھنگامہ جاری ھی تھا کہ امی سڑک پر آتی نظر آئیں۔

میں اُن کی طرف لپکا:

"امی!"

انہوں نے ٹھہرکے کچھ سمجھے بوجھے بغیر اپنا ڈاکٹری بیگ مجھے تھمایا، گھر کی طرف دوڑیں اور کسی کو دیکھے بغیر ایرکن چچا سے کہا:

"کیا بات ہے؟! میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ ابھی اٹھنے کا وقت نہیں آیا! کہہ دیا تھا نا!.. اور یہاں تماشا ہو رہا ہے؟"

پڑوسنیں ذرا دیر تک خاموشی سے امی کو یوں گھورتی رہیں جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔اتنے میں ایرکن چچا نے شانے اچکائے اور رک رک‌کے کہا:

"عجب بدتمیزی ہے! ارے خدا کے لئے..."

میں امی اور ایرکن چچا کے درمیان کھڑا پڑوسنوں کو دیکھ رہا تھا جن کے چہروں سے نفرت اور حیرت جھلکتی تھی۔

"کس کو کیا پوچھنا ہے؟" امی نے دریافت کیا۔ "میں سن رہی ہوں..."

لیکن ان کے چہرے سے گھبراھٹ نمایاں تھی۔ وہ ایرکن چچا کا خیال کرکے پریشان ھو رھی تھیں۔

"نورا، دراصل ھمیں یہ معلوم کرنا ہے" محمودہ نے پرسکون لہجے میں کہا، "کہ آخر یہ مرد ہے کون؟"

"یہ تو آپ نے ان کی آمد کے پہلے ھی دن پوچھا تھا۔ اور کون سی بات صاف نہیں ہے؟"

"بس؟"
"ہاں، بس۔"
"مگر اس کے بعد کیا ہوا! آپ لوگ جنگل سے باہر آ گئے نا؟ اس سپاہی کو سکون مل گیا نا؟"
"باقی کل بتاؤں گا۔ اب تمہیں سو جانا چاہئے۔"

... اور میں جنگل میں چکر کاٹ رہا ہوں۔ بھیانک ماحول اور قیامت کا اندھیرا۔ ٹوٹی ہوئی شاخوں کے ٹھنٹھ مجھے پکڑنے کے لئے لپک رہے ہیں۔ میں چیختا چلاتا ہوں، بھاگنا چاہتا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے میرے پیر زمین میں جم کر رہ گئے ہوں۔ اور محمودہ سے مشابہ بوڑھی یاگا* درخت پر سے مجھے دیکھ کے بدتمیزی سے ہنسے جا رہی ہے:
"ہا۔ ہا۔ ہا! اب سارے محلےوالوں کو تم لوگ صفائی پیش کرنا..."
دوسرے درخت پر سے ڈراؤنی بوڑھیا شرافت کی آواز آ رہی ہے:
"کیسے زمانے آ گئے، کیسے زمانے... ہاں، ہاں، اب دینا جواب ساری باتوں کا" اور وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، میرا گلا گھونٹنے کے لئے۔"
"امی!" میں چیخ پڑا۔ "امی، جنگل میں مجھے آواز دیجئے! میری مدد کیجئے!"
چیختا ہوں لیکن اپنی آواز نہیں سن پاتا ہوں اور پھر خوف کے مارے سارا جسم سن ہو جاتا ہے۔
"یہ تمہیں ہو کیا گیا، بیٹے؟ ڈرو نہیں!" امی مجھے گلے لگاکے پیار کرنے لگیں۔
میں نے آنکھیں کھول دیں: امی اور ایرکن چچا میرے کمرے میں موجود تھے۔
"امی، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپائیے۔

* جادوگرنی، چڑیل۔ بچوں کی کہانیوں کا ایک مشہور کردار۔ اڈیٹر۔

"مغدی" امی نے آواز دی۔ "جاکے اپنے چچا کے پاس بیٹھو۔ میں باورچی‌خانے میں جا رہی ہوں۔"

میں ان کے کمرے میں گیا لیکن انہوں نے جنبش تک نہ کی۔ چھت ہی کو گھورتے رہے۔

"آپ گھبرائیے نہیں" میں نے کہا۔ "ان بوڑھیوں پر ہم فتح پائیں گے۔ بکواس کرتی ہیں، محض بکواس!"

"ہاں" ایرکن چچا نے دبی آواز میں کہا۔ "یقیناً بکواس۔ لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ باتیں بکواس ہیں؟"

انہوں نے پلنگ پر میرے لئے ذرا سی جگہ خالی کی اور میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

"بہتر ہوگا کہ آپ مجھے جنگل کے بارے میں بتائیں" میں نے کہا۔ "اسی جنگل کے بارے میں۔"

"ارے، کتنی بار تو بتا چکا ہوں!"

"دراصل مجھے جنگل کی کہانیاں سننے کا بڑا شوق ہے۔"

"بہت اچھا" چچا نے کہا۔ "... تو اسی جنگل میں... ہم بہت سے سپاہی، یوں سمجھو کہ پورا ایک دستہ جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک دن، دو دن۔ چلے جا رہے ہیں مگر جنگل ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ نہ کہیں راستے ہیں، نہ آگ۔ بھیانک ماحول۔ ہم آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ چلے جا رہے ہیں... آس پاس جرمن سپاہی موجود ہیں، بہت سے جرمن... اچانک یہ صورت حال ہمارے ایک سپاہی کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی اور وہ چیخ اٹھا: «ماں، ماں، جنگل میں مجھے آواز دیجئے! میری مدد کیجئے! میری مدد کیجئے! ماں!» اور جرمنوں نے فائرنگ شروع کر دی... مشین‌گنوں، توپوں اور ٹینکوں سے گولاباری ہو رہی ہے اور وہ سپاہی مسلسل چیخے جا رہا: «جنگل میں مجھے آواز دیجئے!...»"

تب کمانڈر نے سینے سے اپنا جلتا ہوا، چکاچوند کر دینے‌والا دل نکالا اور اسے بلند کرکے ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ اب جنگل ہولناک نہیں، روشن تھا... اور اس کمانڈر کا نام تھا دانکو...*"

---

* عظیم روسی ادیب میکسم گورکی (۱۸٦۸ء – ۱۹۳٦ء) کی ایک کہانی کا کردار۔ اڈیٹر۔

نے امی کے بازو تھامے، کوئی اداس نغمہ گنگنانا شروع کیا اور وہ دونوں کمرے میں دھیرے دھیرے رقص کرنے لگے۔ دونوں نے مجھے فراموش کر دیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رقص کرتے رہے۔

میں بیٹھے بیٹھے لطف‌اندوز ہو رہا تھا۔ چچا کا چہرہ جو کچھ اداس سا تھا، اتنا پرکشش کبھی بھی نہیں لگا تھا۔ اور امی، ان کے متعلق تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی خوبصورتی سے رقص کر سکتی ہیں۔ میں نے انہیں ابو کے ساتھ ناچتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابو کو یا تو رقص کرنا نہیں آتا تھا، یا پھر اس کی فرصت نہ ملتی ہوگی۔

چچا میری امی سے دوگنے چوڑے اور لگ بھگ دوگنے ہی لمبے تھے۔ زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا اس لئے کچھ بھدے سے لگتے تھے۔

یہ رقص بڑی دیر تک جاری رہا کیونکہ چچا نے جو نغمہ چھیڑا تھا وہ بہت طویل ثابت ہوا۔

امی نے دیکھا کہ میری نظریں ان دونوں پر جمی ہیں تو چچا سے کہا:

"کیوں نہ بیٹے کو بھی شامل کر لیں۔"

تو اس طرح میں بھی ان کے درمیان چکر کھانے اور مسکرا مسکراکر چچا کے نغمے کو تان دینے لگا...

مجھے قطعی پتہ نہیں، امی ان دنوں سوتی بھی ہیں کہ نہیں۔ شام کو وہ ایرکن چچا کے کمرے میں جاتی ہیں۔ وہاں سے روئی کے بھیانک ٹکڑوں اور شیشیوں سے بھری بالٹی لےکے باہر آتی ہیں۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مصروف رہتی ہیں۔ آرام خاک بھی نہیں کرتیں۔ فرصت کے تمام اوقات، نیند، کھانا اور آرام سب کچھ ایرکن چچا کی مکمل صحت‌یابی کے لئے وقفاً کئے ہوئے ہیں۔

صبح کو آنکھ کھلتے ہی میری نگاہ کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے ایرکن چچا اور امی‌جان پر پڑتی ہے۔ وہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کو باغ میں پڑتے دیکھتے اور دبی دبی آوازوں میں باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ڈرتے ہوں کہ زور سے بولیں‌گے تو سورج اور نیا دن ڈر جائیں‌گے۔ وہ کاھے کے بارے میں باتیں کرتے ہیں؟ سچ پوچھئے تو ایک روز میں نے ان کی باتیں سنیں بھی لیکن ذرا

آخر بات کیا ہے؟ بوڑھیاں چاہتی کیا ہیں؟ میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں!..."

"میں التجا کرتی ہوں کہ اس محمودہ کے منہ نہ لگئےگا" امی نے ایرکن چچا سے کہا۔ "پاگل عورت ہے، کوئی ایسی ویسی حرکت کر سکتی ہے۔"

"شکریہ، ہر چیز کے لئے شکریہ۔ میں بالکل اچھا ہو چکا ہوں۔ جلد ہی محاذ پر لوٹ جاؤں‌گا۔"

چچا اٹھکے ٹین کے بنے ہوئے سپاہی کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگے لیکن امی نے تحکمانہ انداز میں انہیں ٹوکا:

"بس، بس۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ اب اپنے آپ کو زیادہ نہ ہلکان کیجئے" اور وہ دونوں خوشی سے ہنس پڑے۔

یہ بڑی عمر کے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جب دیکھو جب بےدھڑک ہنس پڑتے ہیں۔ ویسے امی اور ایرکن چچا کی ہنسی بجا تھی کیونکہ وہ تقریباً اچھے ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کاش یہ لوگ دیر تک ہنستے رہیں کیونکہ امی جانے کب سے خوش ہوکے ہنسی نہیں تھیں۔

"نئی زندگی پانا، پھر سے چلنا پھرنا کتنی اچھی بات ہے!" چچا کہہ رہے تھے۔ "میں ہمیشہ یاد رکھوں‌گا کہ دنیا میں ایک ایسی خاتون بھی ہیں جنہوں نے مجھے مصیبت سے نجات دلائی۔ یہ خاتون آپ ہیں نورا!"

"آپ بھی کیا کہہ رہے ہیں! ان بھاری بھرکم لفظوں کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟"

"یقین کیجئے، مجھے یہ سب کہہ‌کے خوشی حاصل ہو رہی ہے۔"

اس روز شام کو وہ دونوں قسمیں کھا کھاکے ایک دوسرے کو اپنے خلوص اور شکرگزاری کا یقین دلاتے رہے اور مجھے یہ حالت عجب مضحکہ‌خیز سی لگی۔ پھر ایرکن چچا نے کہا:

"مجھے آپ کے یہاں آئے ہوئے آج پورے تین مہینے ہو گئے: بیس اگست سے بیس نومبر تک۔ ہر مہینے کی بیسویں تاریخ میرے لئے یوم جشن ہے۔ آپ تصور کر سکتی ہیں، نورا کہ میں کتنا خوش‌قسمت ہوں: ہر مہینے میں جشن، سال میں بارہ مرتبہ!"

اچانک ایرکن چچا نے ایسا قدم اٹھایا کہ میں دنگ رہ گیا۔ انہوں

کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ لوٹیں گے تو اپنی پڑھائی شروع کروں گا۔ فی‌الحال تو میرے ذھن میں تعلیم کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ ھر وقت آپ ھی میں جی لگا رھتا ہے۔۔۔»

میں اور امی صحن میں بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ ایرکن چچا سو رہے تھے۔ امی کے مرھم‌پٹی کرتے ھی انہیں نیند آ گئی تھی۔

"جلد ھی طویل سردیاں شروع ھو جائیں گی" امی نے کہا۔

"میں تو برف سے محبت کرتا ھوں! آپ جانتی ھیں کہ مجھے برف کتنی زیادہ پسند ہے!"

"اسپتال جا رھی ھوں اور باھر سڑک پر ابھی اندھیرا ھی ہے" امی نے جانے کیا سوچتے ھوئے کہا۔

میں ان سے بہت دنوں سے پوچھنا چاھتا تھا:

"امی، چچا سوتے ھیں، میں سوتا ھوں اور شاید ابو بھی اس وقت محاذ پر کہیں سو ھی رہے ھوں گے۔ صرف آپ نہیں سوتیں۔ میں سنتا رھتا ھوں کہ آپ دیوار کے پیچھے پلنگ پر کروٹیں بدلتی رھتی ھیں۔ آخر کیوں؟"

"مجھے فکر لگی رھتی ہے کہ رات کو تمہارے ایرکن چچا کی طبیعت نہ خراب ھو جائے۔"

"آپ کو یاد ھوگا ایک بار ابو دفتر سے گھبرائے ھوئے آئے تھے۔ اس رات آپ دونوں بالکل نہیں سو سکے تھے۔ مجھ سے سو جانے کو کہا تھا لیکن خود نہیں سوئے تھے۔ آپ نے مجھے پریشانی کا سبب بتا دیا ھوتا تو الجھن کچھ نہ کچھ کم ھی ھو گئی ھوتی۔"

امی نے جواب دینے کے بجائے مجھے بھینچ لیا۔

وہ اکثر ابو کی قمیض اٹھاکے اسے دیر تک دیکھتی رھتی ھیں۔ پھر ابو کے سارے کے سارے خطوط دوبارہ پڑھتی ھیں۔ مجھ سے کچھ نہیں کہتیں۔ سوچتی رھتی ھیں، جانے کیا سوچتی رھتی ھیں۔

میں ان سے کہتا ھوں:

"میری امی، آپ ھر وقت اتنی فکرمند نہ رھا کریں، نہیں تو بیمار پڑ جائیں گی۔ آپ کو یاد ہے نا، ابو کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ بہت زیادہ نہ سوچا کریں۔ آپ نے خود ھی کہا تھا کہ وہ زیادہ فکر کریں گے تو بیمار ھو جائیں گے۔"

بھی سمجھ نہ سکا۔ بس یوں ہی خزاں، انگور کے پتوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے جیسے دنیا میں بات کرنے کے لئے کچھ اور رہا ہی نہ ہو۔

انہی دنوں ابو کا خط آیا۔ اس بار انہوں نے ہمارے متعلق زیادہ اور اپنے متعلق کم لکھا تھا۔ صرف یہ معلوم ہو سکا کہ وہ سپاہیوں کے ساتھ رات دن پیدل چلتے ہوئے مواضعات اور شہروں کے پاس سے گزرتے رہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر سپاہی صرف پیدل چلتے پھرتے رہتے ہیں تو آخر یہ جنگ ہے کیا۔ سوچئے نا کہ جنگ دلکش مقامات کی سیر و سیاحت ہی تو ہوئی۔

میں اور امی فوراً ہی جواب لکھنے بیٹھ گئے۔ پہلے امی نے وہی سب باتیں لکھیں جو ان کے دل میں تھیں...

«پیارے انور، دلی تمنا ہے کہ جنگ جلد ہی بند ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تمہاری عدم‌موجودگی میرے لئے کتنی مشکلات کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ایرکن اچھے ہو رہے ہیں۔ مغدی کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ ان کے علاج میں جانے کتنی دقتیں جھیلنی پڑیں! لیکن وہ بڑے نیک‌دل ہیں۔ ضد بالکل نہیں کرتے۔ لیکن یہ تم اپنے بارے میں اتنا کم کیوں لکھتے ہو؟ مجھے معلوم نہیں کہ وہاں تم کس حال میں ہو اس لئے طبیعت بڑی بےچین رہتی ہے۔ ایرکن کو دیکھ دیکھ‌کے بےاختیار دل میں خیال آتا ہے کہ انسان کس قدر مشکلات برداشت کرتا، کس طرح مصائب جھیلتا ہے۔ وہ تو پہلی ہی لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے لیکن اب اچھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جلد ہی محاذ پر لوٹ جائیں گے۔ اچانک کہیں تم دونوں کی ملاقات ہو جائے تو کتنی دلچسپ بات ہو!..»

امی ایرکن چچا کا ذکر کرتے کرتے نہیں تھکتیں۔ ایرکن نے یہ کیا، ایرکن نے وہ کیا... خیر ہوگا، میں ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھوں گا۔

«پیارے ابو، اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ سب لڑکے لڑکیاں اسکول جاتے ہیں۔ ایک میں ہی نہیں جاتا۔ میں نے کچھ دن انتظار کرنے

"بس، بہت ہو چکا" میں چیخ پڑا۔ "موت کے متعلق بہت زیادہ لکھ چکے۔ بس کرو!"

مرات نے پنسل رکھ دی۔

"اب آگے تم لکھو۔ کچھ اور لکھنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ مزید دھوکا نہیں دے سکتا! لیکن ہم لکھیں بھی تو کیا لکھیں؟ یہ کہ جنگ کب ختم ہوگی؟"

"تو جاکے ساری باتیں اگل دو نا۔ لیلی آپا سے کہہ دو نا کہ آپ کے حکیم تو جانے کب ھی کے مار ڈالے گئے۔ ان کی طرف سے آپ کو یہ خطوط ہم لوگ لکھتے ہیں۔"

ہلاک‌شدہ بیٹے کی طرف سے اس کی ماں کو خطوط لکھتے وقت ہر بار ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں۔ ہم دونوں ہی جانے کیوں اس واقعے کے سلسلے میں خود کو قصوروار تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں ہے کہ جاکے لیلی آپا سے کہہ دیں: "آپ کے بیٹے زندہ نہیں ہیں۔ آپ بیکار ھی انہیں خط لکھتی ہیں۔"

لیکن اس طرح کے خطوط ہم ہر ہفتے لکھتے ہیں اور مرات لیلی آپا کو پڑھ‌کے سناتا ہے۔ ان کی نگاہ کمزور ہے اس لئے وہ دیکھ نہیں سکتیں کہ یہ تحریریں حکیم چچا کی نہیں ہیں۔

وہ مرات سے مرحوم بیٹے کے نام جوابی خط لکھواتی ہیں — دل میں اتر جانے‌والے الفاظ کے خط۔ اور ہمارے جسم اس احساس سے سن ہونے لگتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں، ان کے بیٹے کب کے مر چکے ہیں اور وہ ان کے خط کو پڑھنے سے رہے۔

آج خط کا مسودہ مجھے تیار کرنا ہے۔ میں نے جنگل اور ابو کے بارے میں ایک کہانی سوچی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بیٹا اپنی ماں کو لکھے:

«ہم تاریک جنگل میں سپاہیوں کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ مغدی کے والد ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا، ہمارے محلے میں ایک دبلا پتلا، لمبی لمبی ٹانگوں‌والا لڑکا مغدی رہتا ہے؟ تو ہم اسی لڑکے کے والد، انجینیر انور کے ساتھ دشمنوں پر فتح پانے جا رہے ہیں۔ جنگل میں کبھی جھاڑیوں کے پیچھے سے بھیڑئے کی چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں اور کبھی بوڑھی یاگا درخت پر بیٹھے بیٹھے

ایک دن میرا جی چاھا کہ کسی طرح جادوگر بن جاؤں۔ اس طرح مجھے فوراً ھی معلوم ھو جاتا کہ امی اپنے دل میں کون سی بات چھپائے ہوئے ھیں اور آخر وہ اتنا زیادہ خیالوں میں کیوں کھوئی رھتی ھیں۔ مجھے یاد ھے کسی کہانی میں جادوگر بار بار کہتا رھتا ھے: ایک کی بہ‌نسبت دو آدمیوں کی عقل بہتر ھوتی ھے۔

پھر ابو کا خط آ گیا۔

"مغدی!" میں مرات کی آواز سنتے ھی لپک‌کے سڑک پر نکل آیا۔ "ناچو، ناچو" مرات نے کہا۔

"مجھے فرصت نہیں" میں اس سے خط چھین‌کے دوڑا دوڑا امی کے پاس پہنچا۔ "ناچئے، ناچئے۔ ابو کا خط آ گیا!"

"ابو کا خط" انہیں نہ حیرت ھوئی، نہ کوئی خاص خوشی حالانکہ پہلے ابو کا خط آتے ھی باغ باغ ھو اٹھتی تھیں۔ "عجب بات ھے" انہوں نے کہا۔ "میں ان کے بارے میں سوچ ھی رھی تھی اور ان کا خط آ گیا جیسے ھمدردی ظاھر کرنا چاھتے ھوں..."

عجب بات تھی کہ امی، ابو کا مزاحیہ اور پرمسرت خط پڑھتے وقت رو رھی تھیں۔

وہ تمام دن اداس رھیں۔ چیزیں ان کے ھاتھ سے گر گر جاتی تھیں۔ بالٹی گری، دوا کی شیشی گرکے چکناچور ھو گئی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جاکے چھپ گئیں۔ نہ میرے پاس آئیں، نہ ھی ایرکن چچا کے پاس۔

جانے امی کو کیا ھو گیا تھا۔

ان دنوں میں زیادہ نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ پریشان ھیں اور نہیں جانتیں کہ اپنے آپ کو، اپنے جذبات کو کیسے سنبھالیں...

«پیاری والدہ صاحبہ، السلام علیکم! آپ مجھے بہت یاد آتی ھیں۔ آپ کے بھیجے ھوئے انگور اتنے میٹھے تھے کہ سپاھیوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ میں نے انہیں بھی دئے۔ کنجوس تھوڑی ھوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ میں ھلاک نہ کیا جاؤں‌گا۔ کوشش کروں‌گا کہ ھلاک نہ کیا جاؤں۔ میں محتاط رھوں‌گا۔ آپ کا دیا ھوا تعویذ ھر وقت پہنے رھتا ھوں۔ وہ مجھے موت سے محفوظ رکھے ھوئے ھے...»

"آپ عظیم موسیقار کیوں نہ بن گئے؟" ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔ "بچپن ھی میں ساز بجانےوالے تو بعد میں ممتاز موسیقار بن جاتے ھیں۔"

"میں نے وائلن سے دلچسپی ھی ختم کر دی۔ میرے والد بڑے غصیلے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ میں وائلن کے پیچھے پاگل ھوا جا رھا ھوں تو اسے اٹھاکے توڑ ڈالا۔ وہ موسیقار کے پیشے کے قطعی قائل نہ تھے۔"

"عجب تھے آپ کے والد بھی! اچھا تو پھر آپ پر کیا اثر ھوا؟"

"مجھے اتنا صدمہ پہنچا کہ بیمار ھو گیا۔ بعد میں صورت‌حال کا عادی ھو گیا۔ نادان بچہ جو تھا۔"

"میں تو کسی بھی قیمت پر ساز کو نہ چھوڑتا۔"

"جانتا ھوں کہ تم بہادر ھو... میرے والد تو الف‌بے کے صرف سات حروف جانتے تھے۔ اُن کے نزدیک دیہی سوویت ھی کائنات کا مرکز تھی۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ھے کہ میری پیدائش کی خبر سن‌کے والد کھیتوں سے دوڑے دوڑے گھر آئے، عورتوں کو الگ ھٹایا اور کپاس کے ایک پودے کو خوشی کی علامت کے طور پر میرے پاس رکھ دیا... چاھتے تھے میں بھی کپاس کے پودے کی طرح بڑھوں اور انھی کی طرح زمین سے محبت کروں لیکن میں ضد کرکے گاؤں سے تاشقند چلا گیا جہاں ٹیچر کے پیشے کی تعلیم حاصل کی۔"

"چچا، آپ کے بچے بھی ھیں؟"

انہوں نے فوری طور پر جواب نہ دیا۔ گلے پر ھاتھ پھیرا جیسے سانس لینے میں دقت ھو رھی ھو۔

"میں تنہا ھوں..." انہوں نے دھیرے سے جواب دیا پھر کہا: "والدہ کا پہلے ھی انتقال ھو چکا تھا۔ گزشتہ سال والد بھی چل بسے... تم خوش‌قسمت ھو، بیٹے! تمہارے ایسی ماں ھیں..."

تھوڑی دیر تک ھم لوگ خاموش رھے۔

"اچھا تو" میں نے کہا، "دوا کھانے کا وقت ھو گیا۔"

بےچارے چپ چاپ راضی ھو گئے۔ میں نے یہ دیکھ‌کے کہ وہ کیسے گولی کھا رھے ھیں، سوچا: ان کے پیٹ میں ایک ھزار سے زائد گولیاں تو اکٹھا ھی ھو گئی ھوں‌گی۔ جانے ان کے پیٹ میں کھانے کے لئے بھی گنجائش ھے کہ نہیں۔ میں تو کبھی نہ راضی ھوتا۔

دانت پیسنے لگتی ہے... جادو سے متاثر ہوکے درخت سرسرانے لگتے ہیں۔ بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی کے لئے صورتحال ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور وہ چیخ پڑتا ہے: "ماں، ماں، جنگل میں مجھے آواز دو! آکے میری مدد کرو!" اسی لمحے مغدی کے والد انجینیر انور اپنے سینے سے اپنا بڑا اور مضبوط دل، سورج جیسا روشن دل باہر نکال‌کے سپاہیوں کی رہنمائی کرتے اور آگے لے جاتے ہیں۔ جنگل راستہ دیتا ہے۔ بھیڑیے اور بوڑھی یاگا بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ درخت خاموش ہو جاتے ہیں۔ سپاہی تمام فسطائیوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں اور ہماری فتح ہوتی ہے..."

ہم یہی سب لکھ دیتے ہیں۔ ماں کو اپنی اس کہانی کا تحفہ دیتے ہیں۔ کاش اس کے لئے زندگی کچھ آسان ہو جائے، وہ یقین کر سکے...

ہماری سڑک سے یونہی گزر جانا ناممکن ہے۔ باہر نکلتے ہی پگلی محمودہ ضرور کسی نہ کسی پڑوسن سے کاناپھوسی کرتے دکھائی دےگی۔ وہ ہمارے بارے میں، امی اور ایرکن چچا کے بارے میں الٹی سیدھی گھناؤنی باتیں پھیلاتی رہتی ہے۔

اسے خاموش کر دینے کے لئے آخر کیا تدبیر اپنائی جائے؟

اور ادھر ایرکن چچا بھی اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے ٹوہ میں لگے رہتے ہیں:

"اس پگلی محمودہ نے پھر کوئی ایسی ویسی بات کہی ہے کیا؟"

"جی نہیں، کچھ نہیں کہا۔"

"تمہارے چہرے سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ ضرور کہی ہوگی" اور ان کا چہرہ فق پڑ جاتا ہے۔ یا پھر شاید مجھی کو ایسا لگتا ہو۔ پتہ نہیں۔

ایرکن چچا ایسے کیوں ہو جاتے ہیں؟ کہیں وہ ان عورتوں سے ڈرتے تو نہیں؟ میں تو کم‌سنی کے باوجود نہیں ڈرتا لیکن وہ...

ویسے بچپن میں وہ بہت ہی باصلاحیت تھے۔ اتنی عمدہ وائلن بجاتے تھے کہ رشتےداروں کے دل تڑپ اٹھتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں بھلا چچا کا جیسا کہاں ہوں۔

## ۷

موسم سرما میرے لئے ہمیشہ باعث مسرت رہا ہے۔ اس کی آمد کا خوشی کے ساتھ منتظر رہا ہوں۔ شفاف برف انگور کی بیلوں پر، چھتوں اور لوگوں کی ٹوپیوں پر جم جاتی ہے، ہر گندی اور گلی سڑی چیز کو چھپا دیتی ہے۔ اور سردیوں کے بعد نئی زندگی اور عمدہ عمدہ چیزیں جنم لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ آئندہ گرمیوں تک جاری رہتا ہے، اس وقت تک جب تک چھتوں پر پھر سے کوڑا کرکٹ نہ جمع ہو جائے، انگور کی پتیاں گل سڑ نہ جائیں، قلمیں نہ پیدا ہوں۔ میں ہمیشہ سردیوں کا منتظر رہتا اور ان کی آمد پر خوش ہوتا ہوں لیکن اس بار سردیاں ہمارے لئے غم اور تشویش کا باعث ثابت ہوا کیونکہ ایرکن چچا کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ ان کی پیٹھ کا زخم اچھا ہو گیا تھا۔ اب امی کو روئی کے وہ منحوس ٹکڑے اور پٹیاں باہر نہیں پھینکنی پڑتی تھیں لیکن چچا اکثر دیر تک کھانستے رہتے تھے۔ اب ان کے حلق سے خون بہنے لگا تھا۔

آخر ایرکن چچا کو کیا ہو گیا؟ غدار سردیوں نے جن کا میں اس خیال سے منتظر تھا کہ میں اور چچا برف پر پھسل کے لطف‌اندوز ہوں گے، دوڑیں گے، قہقہے لگائیں گے، جی بھر کے صاف اور تازی ہوا کھائیں گے، میرے چچا کو یہ کس حالت کو پہنچا دیا؟

میں جانتا تھا کہ وہی منحوس، پگلی محمودہ چچا کے سر پر یہ مصیبت لائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نے پڑوسی قلندر کے پاس جاکے اس سے چچا کے لئے موت اور امی کے لئے عذاب دوزخ بھیجنے کی درخواست کی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ابو آکے ایرکن چچا کا بدلہ لے لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ چچا محمودہ اور ساری پڑوسنوں سے ڈرتے ہیں ورنہ وہ باہر نکل کے ان سب کی زبانیں بند کر دیتے۔ لیکن وہ... وہ تو بس یہی پوچھا کرتے ہیں کہ محمودہ نے کیا کہا، کیسے کہا؟ امی تو ان عورتوں پر ذرا بھی توجہ نہیں مبذول کرتیں۔ امی قابل ستائش ہیں۔ "احمقانہ باتیں اڑائی جا رہی ہیں تو میری بلا سے" یہ ہیں امی کے الفاظ۔ اتنی نڈر وہ جانے کیسے بن گئیں۔

چیخ اٹھتا اور گولیاں پھینک دیتا لیکن ایرکن چچا ہیں کہ گولیاں کھاتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

دوا کھانے کے بعد انہیں کچھ دیر تک صبر کے ساتھ پیٹ کے بل لیٹے رہنا پڑتا ہے۔ ان کا چہرہ سنترے کے چھلکے کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور درد کی شدت سے ہونٹ کاٹنے لگتے ہیں۔ میں خوف‌زدہ ہو جاتا ہوں کیونکہ مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی مدد کیسے کروں۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ بستر پر لیٹے ہوئے دو منٹ بھی نہ ہوئے ہوں‌گے کہ وہ آہیں بھرنے لگے جیسے انگاروں پر لیٹے ہوں۔

"ارے ذرا دیر برداشت کر لیجئے۔ یہ درد ختم ہو جائےگا..."

ایرکن چچا اپنے اوپر سے کمبل اتار پھینکتے ہیں۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں انہیں سہارا دےکر کھڑکی کے پاس لے جاتا ہوں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے اور اچانک سیٹی بجانے لگتے ہیں۔ پہلے دھیرے دھیرے، پھر زور سے۔ اور اچانک وہ مجھ کو، پیٹھ کے درد کو، ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ پھر اپنی آنکھیں مل‌کے صاف کرتے ہیں، شاید غبار نکال رہے ہیں۔

"چچا..."

انہوں نے وہ ڈنڈا جس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں، اٹھایا، میز پر سے رولر لیا اور ہاتھ پھیلاکر بجانا شروع کر دیا۔ جیسے وہ کوئی ڈنڈا نہیں، سچ مچ کا وائلن ہو اور میں حاضرین سے بھرے ہوئے ہال کا نمائندہ۔

تو یہ ہیں حقیقی موسیقار۔ بہت خوب!

"ارے چچا، کوئی شوخ دھن چھیڑئے نا!"

انہوں نے سر کو یوں جھکایا جیسے حاضرین کی تحسین کا شکریہ ادا کر رہے ہوں۔

کمرے کی ہر چیز میرے ساتھ گھوم رہی ہے، ناچ رہی ہے۔ موٹے موٹے پایوں‌والی میز ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ کر رہی ہے۔ ساس‌پان اور مگ ٹکراکے آوازیں نکال رہے ہیں اور ابو کے لانگ بوٹ اور کھڑکی کے شیشے بج رہے ہیں۔

بہت خوب! یہ ہے حقیقی خوشی! ایسی خوشی ہمارے یہاں عرصے سے نہیں منائی گئی تھی!

"چلو، دوڑتے ہوئے مسجد چلو" مرات نے ہانپتے ہوئے کہا اور ہم پچھواڑے سے مسجد تک پہنچ کے اس کے گنبد پر چڑھ گئے۔ وہاں ایک گول سا چھید سا تھا جس سے مسجد کے اندر کی ہر چیز دکھائی اور ہر بات سنائی دیتی تھی۔

اندر بڑے بوڑھے، ان کے ربڑ کے جوتے، عمامے اور ملا قلندر نظر آ رہے تھے۔ طرح طرح کے رنگ اور بوئیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوکے رہ گئے تھے اور دیواروں کی پھپھوندی کی بو چھید سے اوپر اٹھ رہی تھی جس کی وجہ سے ہمیں سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔

نماز اور دعا سے فارغ ہوکے لوگ ملا قلندر کے گرد جمع ہو گئے اور اس نے بڑے پروقار دانش‌مندانہ انداز میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا:

"مسلمانو! آج ہمیں عزت اور نیک‌نامی کے ایک مسئلے پر غور کرنا چاہئے..."

مرات سنجیدگی سے سن رہا تھا لیکن جانے کیوں میں ہنسے جا رہا تھا۔ مجھے بےاختیار وہ واقعہ یاد آ رہا تھا جب میں نانا کے ساتھ مل‌کر چلا اٹھا تھا: "ارے بھئی، ہم طرح طرح کی چیزیں فروخت کرتے ہیں، پرانے جوتوں کے بدلے میں نئے جوتے دیتے ہیں۔"

ملا قلندر نے اپنا وعظ جاری رکھتے ہوئے کہا: "انسان عیش و عشرت میں پڑکر خدا کو بھولنے لگیں‌گے تو آسمان میں خدا کا نازل کیا ہوا بدبختی کا سیاہ ستارہ نمودار ہوگا اور لوگ پاگل بھونروں کی طرح ایک دوسرے کو ڈسنے لگیں‌گے..."

یہ کہہ‌کے ملا نے اپنے والد کو یاد کیا۔ وہ بےچارہ سوتے میں بھونرا نگل‌کر مر گیا تھا۔

"یاد رہے کہ جنگ بدبختی کا وہی ستارہ ہے! یہ بھی یاد رہے کہ ہم خود خدا کو بھلاکر اپنے بچوں کے سر پر اس سیاہ ستارے کے امنڈ آنے میں معاون ثابت ہوئے..."

"مرات، دلچسپ بات ہے نا؟"

ایک روز اچانک چھ ڈاکٹر ھمارے یہاں آ دھمکے۔ انہوں نے چچا کا معائنہ کیا لیکن ان کے جاتے ھی امی اپنے کمرے میں جاکے آنسو بہانے لگیں۔

امی اس لئے رو رھی تھیں کہ انہوں نے جانے کتنی ھی راتیں جاگ‌کے چچا کی تیمارداری کی لیکن ان کی طبیعت دوبارہ خراب ھو گئی۔ وہ اس لئے رو رھی تھیں کہ بےچارے چچا کے اتنے زیادہ انجکشن لگائے، انہیں اتنی زیادہ تکلیف پہنچائی لیکن ساری کوششیں رائیگاں ثابت ھوئیں۔ امی اس لئے رو رھی تھیں کہ چچا میں جو باھر نکلنے اور وائلن بجانے لگے تھے، اب ذرا بھی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی اور اب انہیں بستر پر پڑے پڑے صحت‌یابی کا انتظار کرنا تھا۔

بےچاری امی پھر پرانا کرتا پہننے لگیں۔ وہ پھر بھول گئیں کہ عورت ھیں اور انہیں میک‌اپ بھی کرنا چاھئے۔ چیزیں ان کے ھاتھوں سے پھر گرنے لگیں۔ پہلے تو وہ بڑا فخر کرنے لگی تھیں کہ چچا کو ان کی ضرورت ھے کہ وہ ان کا علاج کر رھی ھیں کہ وہ کسی شخص کے لئے کوئی مفید کام انجام دینے کے قابل ھیں۔ لیکن اب ان کی وہ زندہ‌دلی اور خوشی سب غائب ھو چکی تھی۔

آخر ایرکن چچا کو ھو کیا گیا؟ امی سے میں نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: "سب ٹھیک ھو جائےگا، سب کچھ۔"

دس ھی سال بعد جب بہت سی باتیں فراموش کی جا رھی تھیں، مجھے اتفاق سے ابو کی دراز میں اپنے اور امی کے خطوط مل گئے۔ سب خطوط وھی تھے جن کے مسودے میں نے اور امی نے ایک ساتھ تیار کئے تھے۔ بس ایک خط ایسا تھا جسے امی نے مجھ سے بتائے بغیر ابو کو بھیجا تھا:

«پیارے انور، سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیسے بتاؤں۔ ھم پر عجب مصیبت آ پڑی... ایرکن شدید طور پر بیمار پڑ گئے۔ اب کیا کیا جائے؟ کچھ تم ھی مشورہ دو نا۔ ان کی زندگی کیسے بچائی جائے؟ ان کا مر جانا کوئی اچھی بات نہ ھوگی۔ ھے نا؟ تم تو ساری باتوں سے باخبر ھو۔ پیارے انور، تم سے التجا کرتی ھوں...»

"محض بکواس! یہ لوگ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ محلہ انہی کی جاگیر تھوڑی ہے، سب کا ہے۔"

"آؤ، بھاگے بھاگے چل کے تمہاری امی کو خبر دے دیں۔"

"ابو لوٹ کر آئیں گے... ان سب کو مزہ چکھا دیں گے..."

"یہ جھوٹ ہے!" اچانک مسجد کے اندر ایک آواز گونج اٹھی۔

"یہ کس نے ہمت کی؟" بڑے بوڑھوں نے کسمساتے ہوئے سرگوشیاں کیں۔

"یہ بالکل جھوٹ ہے، محترم ملا!" سراج بابا نے جو ہر روز طلوع آفتاب کے وقت روئی کے ریشے ہوا میں اڑایا کرتے تھے، ہجوم سے نکل کے قلندر سے کہا: "میں آپ کی سفید داڑھیوں (جانے انہوں نے قلندر کو سفیدریش کیوں کہا) کا احترام کرتا ہوں پھر بھی اس معاملے میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا... نورا اس اجنبی کا علاج کر رہی ہیں۔ نیک کام انجام دے رہی ہیں" سراج بابا کبھی ایک بوڑھے کو، کبھی دوسرے کو (بوڑھے ان کی باتیں نفرت کے ساتھ سن رہے تھے) مخاطب کر رہے تھے۔ انہوں نے مشکلات میں اجنبیوں کی بھی مدد کرنے کے سلسلے میں قرآن شریف کا حوالہ دیا اور آخر میں کہا: "میں آپ سے اس معاملے میں متفق نہیں ہو سکتا چاہے آپ مجھے ہلاک ہی کیوں نہ کر دیجئے۔"

قلندر نے ہاتھ ہلایا جیسے کہہ رہا ہو: "خاموش بےوقوف۔"

"جنگ کا زمانہ ہے اور نورا درد و غم اور بیماری میں مبتلا افراد کی مدد کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ جابرانہ سلوک نہ کرنا چاہئے۔"

"تو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" قلندر نے حقارت سے ہنستے ہوئے کہا۔ "مسلمانو! آپ نے سن لیا نا؟ ہونہہ، میں جھوٹ بول رہا ہوں!"

"اس کا دماغ چل گیا ہے!" آوازیں بلند ہوئیں۔

"اسے مسجد سے باہر نکال دو!"

پھر سارا مجمع سراج بابا کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ بدنیت اور قابل نفرت لوگوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے وہاں سے چل دئے...

"خاموش!"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ ہمارے باپ دادا خود ہی سیاہ ستارے کی آمد کا باعث بنے؟"

"چپ رہو!"

"اس وقت جبکہ مرد جنگ میں ہمارے مذہب کی خاطر قابل نفرت کافروں کے خلاف لڑکے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، ان کی بیویاں عزت اور ایمان کو بھلا رہی ہیں... خدا مجھے معاف کرے!.."

اچانک سب چیخ اٹھے: "ٹھیک ہے!" لیکن دوسرے ہی لمحے سب کے سب نہ جانے کیوں گھبرا سے گئے۔

"آپ لوگ انجینیر انور کی بیوی ڈاکٹر نورا کو جانتے ہیں..."

حاضرین نے جواب دیا:

"ہاں۔"

لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرا گئے۔

نورا؟ کون سی نورا؟ یہ تو میری امی ہیں، انجینیر انور کی بیوی۔

"عورتیں اس ڈاکٹرنی کے چال‌چلن سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ سخت برہم ہیں۔ وہ میرے پاس آکر یہ پتہ لگانے کی درخواست کر رہی ہیں کہ کہیں اس مرد اور نورا کے تعلقات میں قانون کے نیک نام پر دھبا لگانےوالی کوئی بات تو نہیں۔"

"اس نے اپنے شوہر کو بالکل فراموش کر دیا ہے" پگلی محمودہ کا شوہر چیخ اٹھا۔ "میری بیوی کو ان کے ناجائز تعلقات کا علم ہے۔"

"کتنی شرم‌ناک بات ہے یہ! کہیں ہماری بیٹیوں نے اس ڈاکٹرنی کے نقش‌قدم پر چلنا شروع کر دیا تو؟"

"ہم مرد تو مذاق بن‌کے رہ جائیں گے!"

"اور ہماری خانہ‌بربادی شروع ہو جائےگی۔ خون مل جائےگا، نسلیں ختم ہو جائیں‌گی۔ ان کو ہمارے محلے سے نکال باہر کیا جائے!"

میں نے غصے اور نفرت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے مرات سے سرگوشی کی:

پر جمی ہوئی تھیں، سر ہلائے جا رہا تھا۔ کچھ دوسرے لوگ اور بچے قریب ہی منڈلا رہے تھے۔ محمودہ اپنے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

امی مسلسل اپنے بالوں پر انگلیاں پھیرے جا رہی تھیں۔

"تو آپ لوگوں نے کیسے تکلیف کی۔ ویسے جہاں تک مجھے علم ہے، محلےوالوں کی ترجمانی ہمیشہ محلہ کمیٹی ہی کرتی ہے۔"

"دیکھو، زیادہ چالاکی سے نہ کام لو!" محمودہ دوڑکے امی کے پاس پہنچ گئی اور جانے کیوں اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ "بےحیا کہیں کی!"

"ڈاکٹرنی صاحبہ، ہم آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ دراصل ہم آپ کو ایسی نازیبا باتوں سے بچانا چاہتے ہیں جو یاد رہے کہ آپ کے خاندان کے نام پر دھبا لگا سکتی ہیں۔"

"ارے مغدی، تم کاہے کے لئے یہاں کھڑے ہو؟ اندر اپنے چچا کے پاس جاؤ۔ میں ابھی آئی..."

"تم نہایت ہی باعزت والدین کی بیٹی ہو، تعلیم‌یافتہ شخص کی بیوی ہو، خود بھی پڑھی لکھی ہو۔ پھر آخر اس غیر مرد کو اپنے گھر کیوں لے آئیں؟" محکم نے امی سے پوچھا اور محمودہ نے اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں ڈاکٹرنی ہوں۔ وہ زخمی ہیں اور ان کا علاج کرنا میرا فرض ہے۔"

"ارے وہ – وہ تمہارا عاشق ہے!" محمودہ نے سینہ پیٹتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ بھول گئیں کہ جنگ کا زمانہ ہے۔ وہ زخمی ہیں اور ان کا علاج کرنا میرا فرض" امی نے بڑے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"اور آپ کے انجینیر شوہر کا کیا ردعمل ہے؟" قلندر نے پوچھا۔

"میں اس معاملے کی وضاحت کر سکتی ہوں لیکن آپ لوگ سمجھیں گے نہیں... ایرکن!" امی چیخ اٹھیں۔ "باہر مت آنا!"

لیکن چچا نے ان کی ایک بھی نہ سنی۔ ان کے زرد چہرے سے درد و کرب نمایاں تھا اور وہ بہ‌دقت تمام دھلیز پار کرکے سڑک پر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ‌کے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

ہم بھاگے بھاگے گھر پہنچے۔ میں آھٹوں پر کان لگائے کچھ دیر تک صحن میں ٹہلتا رھا پھر ایرکن چچا کے پاس گیا۔

"آپ ڈرئیے نہیں۔ وہ لوگ ھمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے!" میں نے دروازہ بند کرتے ھوئے کہا۔ "ابھی بارش شروع ھو جائے گی اور وہ خوف‌زدہ ھو جائیں گے۔"

"کیا وہ لوگ یہاں آ رھے ھیں؟"

چچا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ وہ پلنگ پر اٹھ‌کے بیٹھ گئے۔

"نہیں! ابھی بارش ھوگی، کاش جلد ھی ھو جائے۔"

"ابھی تمہاری امی آ جائیں گی۔"

"بھاڑ میں جائیں وہ لوگ! کاش وہ آ جائیں! میں نے ان بھوتوں کو سوتے میں دیکھا ھے، ھڑیلے بھوت! آئیں، جلد ھی آ جائیں!" وہ چیخنے لگے۔

"ارے چچا، آپ لیٹ جائیے نا!"

اتنے میں گیٹ پر دستک دی جانے لگی، پہلے دھیرے دھیرے، پھر زور سے۔

"ارے یہ تو ھوا ھے، چچا ھوا۔"

"جاؤ مغدی، گیٹ کھول دو، ڈرو نہیں!"

"ڈاکٹرنی نورا، گیٹ کھولئے!"

"یہ قلندر کی آواز ھے!"

"بھوت ھی کیوں نہ آیا ھو، تم گیٹ کھول دو!" ایرکن چچا چیخ اٹھے۔ وہ خود پلنگ سے نہ اٹھ سکے۔

"امی کی آواز! امی آ گئیں، چچا!"

میں باھر لپکا۔ گیٹ کے سامنے امی، قلندر... اور دو بوڑھے کھڑے تھے۔

"امی، ابو کا خط آیا ھے۔"

"محترمہ ڈاکٹرنی صاحبہ! ھم مسلمانوں اور محلے کے تمام باشندوں کی نمائندگی کر رھے ھیں" قلندر نے کہا۔

"آئیے، اندر آ جائیے۔"

"نہیں، نہیں۔"

ایک بوڑھا محکم، نفرت سے گردن سہلانے، پھر ھاتھ ملنے لگا جیسے گرمی لگ رھی ھو۔ دوسرا بوڑھا صفر جس کی نگاھیں زمین

مہربانی کرکے مجھے ایک بم بھیج دیجئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بم نہ ہوگا تو نہ جانے اور کون سی کارروائی کرنی پڑے»۔

میں بیٹھے بیٹھے دل ہی دل میں ابو کو بھیجنے کے لئے خط کا مضمون سوچ رہا تھا کہ اچانک محمودہ، چڑیل کی طرح سیاہ رنگ میں رنگی ہوئی ہمارے گھر میں داخل ہوئی۔

"تم لوگوں نے میری جان لے لی۔ رنگ میں ڈبوکے مار ڈالنا چاہا۔ تم دھیرے دھیرے الاؤ میں جلو۔ تمہارے گھر میں وبا پھیلے!"

محمودہ کی چیخ پکار سے امی گھبرا گئیں اور میں ایک کونے میں چھپ گیا۔ امی پوچھتی رہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے، لیکن وہ پگلی تو بس چیخے جا رہی تھی، دھمکیوں پر دھمکیاں دئے جا رہی تھی۔ امی کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے بھڑ سے گیٹ بند کرکے اندر سے بلی لگا دی۔ محمودہ دیر تک چیختی چلاتی اور گیٹ کو مکوں سے بھڑبھڑاتی رہی۔ یہ ساری باتیں ایرکن چچا کے اعصاب پر برا اثر ڈال رہی تھیں۔

"لیکن لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟" چچا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپ توجہ ہی نہ دیجئے" امی نے حتی‌الامکان پرسکون انداز سے کہا۔

"سوچا تھا کہ جلد ہی اچھا ہو جاؤں‌گا اور سارا تماشا ختم ہو جائے‌گا۔ یہاں سے چلا جاؤں‌گا، سب کچھ بھول جاؤں‌گا۔ لیکن علالت جاری ہے۔ نورا، بتائیے نا کبھی یہ سلسلہ ختم بھی ہوگا؟"

"آپ ضرور اچھے ہو جائیں‌گے۔ دراصل سردیوں کی وجہ سے بیماری زور پکڑ گئی ہے اور بس۔"

"نہیں، آپ مجھ سے ضرور کچھ چھپا رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے لئے بیکار بوجھ بنا ہوا ہوں۔ گزارش ہے کہ میری وجہ سے خود کو اب اور پریشان نہ کیجئے۔ مجھے اسپتال پہنچا دیجئے۔"

"آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے‌گا۔"

امی میرے کمرے میں جہاں میں الماری کے پیچھے چھپا ہوا تھا، داخل ہوکے کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئیں اور رونے لگیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا ھی ذکر ہو رہا ھے، ٹھیک ھے نا؟"
وہ بمشکل کچھ عجب انداز سے مسکرائے اور ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "تو لیجئے میں تیار ہوں! جو الزام لگانا ہو، لگائیے!"

سب خاموش ہو گئے۔ امی ان کی طرف بڑھیں۔

"مغدی! انہیں لے جاکے لٹا دو!"

"دیکھئے، ڈاکٹرنی کو ھاتھ نہ لگائیے گا... ان کا کوئی قصور نہیں..."

"انہیں اندر لے جائیے" کسی نے کہا۔ "ان کی حالت بہت خراب ہو رہی ھے۔"

اس کے بعد پڑوسی منتشر ہونے لگے۔ قلندر، محمودہ اور بوڑھے، سب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہم نے چچا کو اندر لے جاکے لٹایا اور وہ بےہوش ہو گئے۔

صبح کو پتہ چلا کہ کسی نے کئی خالی بوتلیں ھمارے گیٹ پر دے ماری تھیں اور چاروں طرف کرچیں ھی کرچیں بکھری ہوئی تھیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ پاس پڑوس والے ھمارے مخالف ہو گئے تھے۔

خیر، کوئی بات نہیں۔ دیکھتے ھیں کون کس کو ھراتا ھے!

میں نے کباڑخانے میں سیاہ رنگ کا ڈبا ڈھونڈا اور علی‌الصباح بلھر لپک کے سارا رنگ محمودہ کے محبوب گیٹ پر انڈیل دیا۔ اب کرے وہ غصہ!

پھر میں نے ابو کو خط لکھا کہ وہ میرے لئے ایک بم بھیج دیں۔

«پیارے ابو، کسی نہ کسی طرح مجھے ایک بم تو بھیج دیجئے۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ھمارے شہر پر فسطائیوں نے قبضہ کر لیا ھے، امی کو قید کر لیا ھے اور مجھ پر مظالم ڈھا رھے ھیں تاکہ میں ان کا طرفدار ہو جاؤں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ فسطائی ھمارے یہاں آئے ہوتے تو میں اور مرات جاکے چھاپہ‌ماروں سے مل جاتے اور موٹر سائیکل پر گزرتے ہوئے سب سے بڑے فسطائی کو پکڑ لیتے۔ ہم نے اس سے پوچھ گچھ کی ہوتی اور پھر...

مجھے نہیں معلوم کہ ہم اس سے کیا سلوک کرتے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ سوچ ھی لیتے۔

لیکن پتہ چلا کہ زلفیہ خالہ نئے زخمیوں کا استقبال کرنے کے لئے ریلوئے اسٹیشن گئی ہوئی ہیں۔

"انہیں آتے ہی آپ کے یہاں بھیج دوں‌گی" عورت نے کہا۔

میں گھر کی طرف بھاگا اور سوچنے لگا کہ امی کو کیا جواب دینا چاہئے جس سے انہیں کچھ اطمینان ہو۔

ارے، یہ ہمارے گیٹ سے کون باہر نکل رہا ہے؟ یہ تو نانا ہیں! پیارے نانا، ہمیشہ کی طرح اچانک ہی آ گئے۔

"فریبی، ریاکار کہیں کے!" وہ راستہ پار کرتے ہوئے چیخ رہے تھے۔ "اس علاقے میں تو سانس ہی نہیں لی جا سکتی۔ سب کے سب منحوس ہو گئے۔"

صاف ظاہر تھا کہ کسی نے ان سے ملتے ہی امی کے متعلق الٹی سیدھی باتیں چھیڑ دی تھیں اور وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔

"نانا! پیارے ناناجان!"

میں دوڑکے ان سے لپٹ گیا۔ ان کو دیکھنے، ان سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا! لیکن انہوں نے مجھے بس ایک بار اور وہ بھی سردمہری کے ساتھ پیار کیا اور آگے بڑھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے لپکا۔

"واپس جاؤ، یہ کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے!" نانا چلائے۔

"میں بھی قلندر سے انتقام لینا چاہتا ہوں! مجھے آپ کا بےحد انتظار تھا۔"

"ایشان!" نانا نے زور زور سے قلندر کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

"قلندر" میں چلایا۔ "ھمت ہو تو باہر نکل آؤ!"

قلندر صاف ستھرے چغے میں ملبوس عمامے کے بغیر باہر آیا۔ وہ مجھے اس قلندر سے بالکل مختلف لگا جسے میں نے مسجد میں دیکھا تھا۔

"آئیے، آئیے، میرے دوست!" وہ نانا سے بغلگیر ہو گیا۔ "مجھے اس شخص سے مل‌کے بہت خوشی ہوئی جسے ہمارے مذہب کا مقدر عزیز ہے۔ اندر تشریف لائیے۔ بیٹے، تم بھی آؤ نا۔ تم نے اس بار میری توہین کی تھی لیکن میں نے معاف کر دیا۔ سات سال سے کم عمروالوں کے گناہ، گناہ تھوڑی ہوتے ہیں۔"

میں فوراً الماری کے پیچھے سے نکل آیا۔ امی چونک پڑیں اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

"میری امی، مجھے معاف کر دیجئے۔ اب میں محمودہ کے گیٹ پر کبھی بھی رنگ نہ لگاؤں گا۔"

## ۹

اکثر جب ایرکن چچا کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو امی دوڑی دوڑی صحن میں آکے پکارتیں:

"مغدی، جلدی کرو!"

اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میں دوڑکے اسپتال جاؤں اور امی کی مدد کے لئے زلفیہ ڈاکٹرنی کو بلا لاؤں۔ دراصل امی اب سوچتی تھیں کہ وہ چچا کے موزوں علاج کے لئے اکیلی ناکافی ہیں۔ زلفیہ خالہ آکے امی کو کچھ تسلی دیتیں اور وہ دونوں مل‌کر چچا کو ہوش میں لانے کی کوششیں کرتیں۔ امی کو میرے سوا کسی اور کی، کسی بالغ کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ وہ ان کی ہمت بندھائے اور زلفیہ خالہ عین موقعے پر آ جاتی تھیں۔

آج ایک بار پھر مجھے زلفیہ خالہ کو بلانے کے لئے اسپتال جانا پڑا۔ گیٹ پر مامور عورت جس کے بازو پر سرخ ربن بندھا ہوا تھا، فوراً ہی میری آمد کا مطلب سمجھ گئی اور مجھے ساتھ لےکے زخمیوں کے قریب سے ہوتی گیلری سے گزری۔ میں نے پہلے ہی کی طرح کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اندازہ لگایا کہ کون عام سپاہی ہے اور کون جنرل۔

"ارے، ڈاکٹر زلفیہ کہاں ہیں؟ آپ نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟" وہ عورت ہر ایک سے پوچھے جا رہی تھی اور میں اصرار کرتا جا رہا تھا:

"جلدی تلاش کیجئے، جلدی۔ امی نے فوراً ہی بلایا ہے!"

ہم نے ایک گیلری سے دوسری میں جاکے ایک ایک وارڈ میں جھانکا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں۔ زلفیہ خالہ آخر کہاں چلی گئیں؟ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امی مجھے اور زلفیہ خالہ کو برابر بلائے جا رہی ہیں اور ان کی حالت غیر ہو رہی ہے۔

"میری بیٹی نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"لو لڑکے، کشمش کھاؤ۔ پسند کرتے ہو نا؟"

"نہیں!"

نانا اور قلندر خاموش رہے۔

"مسلمانوں کی خواہش یہی تھی" قلندر نے کہا۔ "ان کا مطالبہ مجھے ماننا پڑا۔"

"میری بیٹی نے کون سی خراب بات کی؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ وہ اور یہ مرد... وہ اس مرد کے ساتھ... اس وقت جبکہ شوہر محاذ پر موت کے منہ میں ہے۔"

"کیا اس کا قصور یہ ہے کہ اس بدبخت زخمی کا علاج کر رہی ہے؟"

"معاف کیجئےگا لوگ کہتے ہیں کہ کچھ اس سے بھی خراب‌تر..."

"میری بیٹی حلیم‌طبیعت، اپنے بچے سے محبت کرنےوالی اور شوہر کی وفادار بیوی ہے۔ خراب خیالات تو خواب میں بھی اس کے دل میں نہیں آتے۔ رہا یہ مرد سو بیمار ہے۔ آخر ان کوڑھ مغزوں اور اوباشوں کے پاس کوئی ثبوت بھی ہے؟ کس نے کس بات کے لئے اسے مجرم قرار دیا ہے؟"

قلندر نے چپ چاپ ہاتھ ہلائے۔

"بتاؤ نا، اس کا جرم کس نے دیکھا ہے؟"

قلندر نے نانا کی طرف گاؤتکیہ بڑھایا:

"ذرا لیٹ رہئے، میرے بھائی۔ کچھ آرام کر لیجئے۔"

"ابھی میں تمہارے منہ پر تھوک دوں‌گا!"

"غصہ نہ کیجئے، میرے بھائی۔"

"مان لو کہ میری بیٹی سے کوئی غلطی سرزد ہو ہی گئی پھر بھی ہر بدی کے لئے سزا دینےوالا صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا۔ تم یا کوئی دوسرا شخص اس طرح کسی انسان کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تم نے ایک بار پھر، ہزارویں بار شریعت کی خلاف‌ورزی کی ہے۔ میری نوراً تو ان آنسوؤں کی طرح پاک و صاف ہے جو آج اس نے مجھے دیکھتے ہی بہائے۔"

"اچھا تو اگر آپ کو اتنا ہی پختہ یقین ہے..."

"اس کی عمر سات سال سے زائد ہو چکی ہے لیکن اصل بات یہ نہیں ہے" نانا نے کہا۔

"اندر آئیے میرے برادر، جہاں‌گشتوں کی اس پناہ کے اندر آئیے نا۔"

وہ ہمیں مکان کے اندر لے گیا جو ہمارے گھر ہی جیسا تھا اور صحن میں انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن جانے کیوں یہ گھر مجھے ہمیشہ کچھ ایسا اداس اور تاریک لگتا تھا جیسے دبلی پتلی جنگلی بلیاں آوارہ‌گردی کر رہی ہوں اور صحن کے درختوں پر سے اُلو گھور رہے ہوں۔

"میرے عزیز، آپ نے ایک بار مجھ پر ریاکاری کا الزام لگایا تھا" قلندر نے نانا سے کہا۔ "لیکن اب آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں مفلسی میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دیکھئے نا، پھٹے پرانے گدے پر سوتا ہوں اور میرے سندل* میں کوئلہ تک نہیں۔ مجھے دنیا کے عیش و عشرت سے نہیں، خدا سے محبت ہے۔ اپنی ساری دولت غریبوں میں تقسیم کر چکا ہوں۔ افواج کے لئے بھی دو بورے آٹا حکام کے حوالے کیا ہے۔ یہ رہی رسید... میرے مہمانو، سندل پر بیٹھ‌کے پیروں کو گرم کیجئے۔ میں نے اس میں اپنی پرانی اور عزیز کتابوں کو جلاکے گرمی پیدا کی ہے ورنہ سردی میں جم‌کے رہ جاتا... کشمش کھائیے۔ ساس کا شکریہ کہ انہوں نے میرے لئے یہ کشمش بھیج دی تاکہ بھوکا نہ مر جاؤں۔"

"بس، بس، بہت ہو چکا" نانا نے بیٹھے بغیر کہا۔ "ایسی باتیں سینکڑوں بار سن چکا ہوں۔ میں ایک دوسری بات معلوم کرنا چاھتا ہوں۔ یہ آخر تم میری بیٹی کو نشانۂ ملامت کیوں بنائے ہوئے ہو؟"

قلندر نے نانا کی طرف کشمش کی تھالی بڑھائی۔

"کھائیے، کھائیے مہمانو، میری دل‌شکنی نہ کیجئے..."

---

* ایک چوکور نیچی میز جسے جاڑوں میں انگیٹھی کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سندل کے ارد گرد فرش پر گدا بچھا دیا جاتا ہے جس پر بیٹھ‌کر لوگ چائے پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور ہاتھ پیر گرم کرتے ہیں۔ اڈیٹر۔

"کیا بات ہے؟ نانا کہاں ہیں؟"
"نانا چلے گئے۔ انہیں جلدی تھی۔"
"کاہے کی جلدی؟"
"چچا بھی چلے گئے۔"
"کہاں گئے؟ نانا کے ساتھ؟"
"نہیں، دونوں الگ الگ گئے" مرات نے جواب دیا اور اپنا تھیلا لئے کہیں بھاگ کھڑا ہوا۔
میں لپک کے ایرکن چچا کے کمرے میں اور پھر امی کے کمرے میں گیا۔
"امی! امی! آپ خاموش کیوں ہیں؟ آپ کہاں ہیں؟ چچا کہاں ہیں؟ آپ چھپ کیوں گئیں؟ میں دیکھ رہا ہوں آپ چھپی ہوئی ہیں! دیکھ رہا ہوں!"
ابھی وہ تینوں — امی، چچا اور نانا باہر نکل آئیں گے، ہنس پڑیں گے اور کہیں گے...
"او۔ ہو۔ ہو۔ ہو!" میں زور سے چلایا۔
"او۔ ہو۔ ہو۔ ہو!" صدائے بازگشت سنائی دی اور ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔
میں چلانے اور دروازے پر زور زور سے مکے مارنے لگا۔ پھر ایرکن چچا کے بستر پر جو ابھی گرم تھا اور جس میں دواؤں اور چچا کے جسم کی بو بسی ہوئی تھی، پیٹ کے بل لیٹ گیا اور تکیے میں منہ چھپاکے رونے لگا۔
جی بھرکے رو چکا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ ایرکن چچا گھر میں موجود نہیں ہیں۔
چچا، آخر آپ کیوں چلے گئے؟ اب تو محمودہ اور قلندر خوب خوب بغلیں بجائیں گے۔ سمجھیں گے کہ ہم ہار گئے۔ ہم ابو کو کیا جواب دیں گے؟ ابو یہ سن‌کر کہ ہم آپ کو نہیں روک سکے، مجھ پر اور امی پر کتنے ناراض ہوں گے! امی کتنی بہادر ہیں۔ وہ ان لوگوں سے قطعاً خوف‌زدہ نہیں ہوئیں۔ ان کا مذاق ہی اڑایا لیکن آپ مرد ہوتے ہوئے بھی... ارے چچا...
میں چپ رہتا، آپ سے کچھ نہ کہتا، حتی‌کہ خود اپنے آپ سے بھی اعتراف کرتے ہوئے ڈرتا... لیکن یقین مانیے آپ کی وجہ سے

"هاں، هاں، مجھے پورا یقین ھے۔ میں چاھتا ھوں کہ تم میری بیٹی کے متعلق الٹی سیدھی باتیں بند کر دو۔ اور پاگلوں کے اس ھجوم کو بھی خاموش کر دو جو خود کو بہت پارسا ظاھر کرتا ھے۔ مجھے یہی کہنا تھا... آج میں اور زیادہ غصہ ھونا نہیں چاھتا۔ چلو مغدی!"

"خدا کرے آپ کے خاندان میں خیر و عافیت رھے" قلندر نے دعا کے لئے ھاتھ اٹھاتے ھوئے کہا۔ "آمین!"

ھم لوگ گھر واپس پہنچے تو نانا صحن میں رک گئے۔ کچھ سوچتے رھے پھر ھاتھ دھوئے اور دیر تک انہیں پونچھتے رھے۔ بعد میں ایرکن چچا کے کمرے میں آئے۔

چچا اٹھ‌کے بستر پر بیٹھ گئے اور نانا کو دیکھ‌کر مسکرانے لگے۔

"لیٹے رھئے، لیٹے رھئے... صحت‌یاب ھو رھے ھیں نا؟"

"جی ھاں، کچھ بہتر ھوں۔"

"کوئی بات نہیں، میں خربوزے اور خشک میوے لایا ھوں۔ انہیں کھائیے، فائدہ پہنچے‌گا۔"

پھر نانا نے امی سے پوچھا:

"اور تمہارا کیا حال ھے، نورا؟ بہت مشکلات کا سامنا ھے نا؟ انور نے کیا لکھا ھے؟"

"لکھا ھے کہ لڑ رھے ھیں اور وہ لکھ ھی کیا سکتے ھیں۔ اباجان، آپ عرصے سے نہیں آئے تھے۔"

"بیٹی، بےحد مصروف تھا۔ دریاؤں میں پانی کم ھے۔ کپاس کی فصل کوئی خاص اچھی نہیں ھوئی۔ کسی نہ کسی طرح مشکلات سے بچ نکلا۔"

میں ذرا دیر تک ان لوگوں کی باتیں سنتا رھا پھر اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ سخت نیند آ رھی تھی، ھمیشہ سے کہیں زیادہ۔ شاید اس لئے کہ آج بہت زیادہ گھبرا گیا تھا۔ چنانچہ شام سے پہلے ھی سو گیا۔

جاگتے ھی مرات پر نظر پڑی۔ وہ میرا بازو پکڑے ھوئے مجھے جھنجھوڑ رھا تھا اور بالکل روھانسا سا تھا۔ میں اچھل‌کے کھڑا ھو گیا۔

کیجئے۔ جلد ھی ابو لوٹ آئیں گے اور پہلے ھی کی طرح سب کچھ ٹھیک ھو جائے گا۔

"امی!"

"ھاں، مغدی... میرے پاس آؤ۔"

"جلد ھی ابو لوٹ آئیں گے۔"

"ابو؟ مگر اتنا اندھیرا کیوں ھے؟ رات ھو گئی کیا؟"

"جی نہیں..."

"تمہارے ابو کا خط آیا ھے کیا؟"

"ان کا خط تو کل آئے گا۔ ھم اچھی طرح سو کے بیدار ھوں گے اور مرات خط لے کر آ جائے گا۔"

"ھاں، ھاں، خط آئے گا۔ جاؤ، جاکے باھر دیکھو تو۔ تمہارے چچا کو خط لکھ کے چھوڑ جانا چاھئے تھا۔ وہ یونہی نہیں جا سکتے۔ جلدی کرو نا..."

میں صحن میں نکل کے ذرا دیر کھڑا رھا۔ جی چاھتا تھا اندر واپس جاکے کہہ دوں: "جی نہیں، انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ بزدل ھیں۔" لیکن اسی لمحے مجھے مٹی کے اس ننھے سے سپاھی کا خیال آیا۔ اسے بنانے میں مجھے پورا ایک ھفتہ لگا تھا۔ آنکھیں، ناک، سب کچھ بناکے ھاتھ میں رائفل تھما دی تھی اور سجا دیا تھا۔ میں لپک کے باورچی خانے میں پہنچا اور اسے اٹھاکے زمین پر پٹک دیا: دیکھ! یہ دیکھ! تجھے شرم نہیں آتی؟ میں اور امی، دونوں تیرے لئے آخر کیوں تڑپ رھے ھیں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں ابو کے خط کا تذکرہ کرتا ھوں اور امی تیرے خط کی منتظر ھیں۔ ھمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔ نہ تیرے خط کی، نہ واپسی کی۔ تو ھمیشہ ھی پڑوسیوں سے خوف زدہ رھا۔ تو نے مجھ سے، میری امی سے کبھی بھی محبت نہیں کی۔

"اٹنشن!" ابو نے کہا۔ "ورزش کے لئے کھڑے ھو جاؤ!"

"مغدی!" امی کی آواز سن کر میرے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ "ریکارڈ نہ بجاؤ! یہ تم کیا کر رھے ھو؟"

"میں... میں تو... ابو کی آواز سن رھا ھوں..."

"ریکارڈ مت بجاؤ!"

امی نے ریکارڈ رکھ دینے کو کہا۔

مجھے کچھ شرم محسوس ہو رہی ہے، مرات سے، امی سے یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی۔ آپ بری طرح زخمی ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر جنگ میں کیا ہو رہا ہے؟ ابو نے تو لکھا ہے کہ بہت سے ایسے سپاہی بھی لڑ رہے ہیں جو شدید طور پر زخمی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ چچا بزدل ہیں۔ انہوں نے اس بار بھی بزدلی دکھائی۔ میں بزدلوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ نہیں، میں انہیں معاف نہیں کر سکتا۔ وہ ڈر گئے۔ ہمیں چھوڑکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ امی نے ان کا اتنا علاج کیا، اتنی تیمارداری کی، اتنی مشکلات جھیلیں لیکن وہ دھوکا دےکر بھاگ گئے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ چلے گئے تو چلے جائیں، مجھے ایسے چچا کی ضرورت نہیں...

"ضرورت نہیں!" میں زور سے چلایا اور ایک کان سے سننے لگا کہ چچا واپس لوٹ رہے ہیں کہ نہیں۔ وہ لوٹ آتے... تو میں انہیں معاف کر دیتا... ابھی... ابھی اگر وہ لوٹ آتے...

نہیں، ہرگز نہ معاف کرتا۔ وہ بزدل ہیں!

میں زور سے دروازہ کھول‌کر صحن میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"امی!"

امی، امی، امی! یہ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ جانے کیوں آپ فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی طرح بیٹھی رہیں، گھنٹہ، دو گھنٹہ جیسے بت بن گئی ہوں۔

"امی!"

میں آپ کو پکارتا، چیختا چلاتا اور خوف کے مارے روتا رہا لیکن آپ نے جواب تک نہ دیا۔

جانے کیوں مجھے آپ کو چھوتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ سوچتا تھا آپ پوچھ بیٹھیں کہ چچا کہاں ہیں تو کیا جواب دوں‌گا؟ ان کی بزدلی کے باعث مجھے شرم آ رہی تھی اور آپ کی حالت دیکھ‌کر میرا دل دکھتا ہے۔ ان کی بزدلی تو ناقابل‌معافی تھی لیکن ان کی وجہ سے آخر آپ کیوں اتنی غم‌زدہ ہیں، کیا آپ محسوس نہیں کر رہی ہیں کہ چچا نے ہمیں دھوکا دیا ہے؟.. خیر، کوئی بات نہیں۔ کچھ اور صبر

دوسری بدطینت بڑھیاں تو ان سے تو سپاھی بات تک نہ کریں گے۔ ایک ھی ضرب سے سب کی سب بھاڑ میں چلی جائیں گی۔

میں ابھی اپنے خواب کے انجام تک نہیں پہنچا تھا کہ اسپتال آ گیا اور امی دکھائی دیں۔ وہ سفید اپرن پہنے گیٹ کے قریب ھی کسی عورت کے ساتھ کھڑی تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کوئی بات نہیں نورا، وہ ضرور واپس آ جائیں گے۔ وہ ایسی کمزور حالت میں اکیلے کہیں چلے جائیں، اس کا سوال ھی نہیں اٹھتا..."

"تم کیوں یہاں آ گئے؟" امی نے پوچھا۔ "جاؤ، گھر واپس جاؤ۔"

"ارے، لڑکے کو کیوں بھگا رھی ھو۔ وہ بھی تو فکرمند ھے" اس عورت نے کہا۔ "آؤ بیٹے، ذرا گرمی میں آ جاؤ۔"

"اچھا آؤ، میرے بیٹے" امی نے کہا۔

ھم تینوں گیلری کے اندر انگیٹھی کے پاس ھاتھ سینکنے لگے۔ امی بار بار جاکے باھر جھانکتیں اور پھر اندر آکے ھاتھ سینکنے لگتیں۔ ان کے آنسو اب بھی جاری تھے۔

"امی! ھم لوگ کسی دوسرے سپاھی کو اپنے یہاں لے چلیں۔ مگر ابکے سب سے بہادر اور باھمت زخمی ھی کو لے چلیں گے!"

بعد میں مجھے ایسی بات کہنے کا بےحد افسوس ھوا۔

"تمہیں یہ کہنے کی ھمت کیسے پڑی! جاؤ، گھر واپس جاؤ!"

میں اسپتال سے چلا آیا۔ دل ھی دل میں سوچ رھا تھا کہ امی بہت پچھتائیں گی۔ میرا کیا ھے جدھر نگاہ اٹھے گی، چلا جاؤں گا، ابو کی تلاش میں...

رھے ایرکن چچا تو لاکھ ڈھونڈے جائیں، کہیں نظر نہ آئیں گے۔ وہ امی کو خط بھی نہ لکھیں گے۔ ان کے پاس نہ پنسل ھے، نہ کاغذ۔

بہرحال ایک خط تو انہیں لکھ ھی دینا چاھئے تاکہ امی کی پریشانی دور ھو جائے۔ شرط یہ ھے کہ وہ آئندہ کبھی ھمارے دروازے پر قدم نہ رکھیں۔ میں انہیں معاف نہ کر سکوں گا۔

ویسے گیٹ کے قریب کاغذ، پنسل ضرور رکھ دینا چاھئے تاکہ وہ خط لکھکے امی کو تسکین دے سکیں۔

"ریکارڈ مت بجاؤ، میرے سر میں... بالکل پرانا ہو چکا ہے۔ بھرائی ہوئی آواز سے بجتا ہے... اوہ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے!"

پھر امی باہر سڑک کی طرف لپکیں، غالباً ایرکن چچا کے خط کی تلاش میں۔

اب کیا کروں؟ ان کے پیچھے ہو لوں یا ابو کی آواز سنتا رہوں؟

"اٹنشن!.. پیر... مغدی..." اور ریکارڈ خاموش ہو گیا۔

"ابو!"

وہ خاموش ہو چکے تھے۔ ریکارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔

آخر امی نے اسے توڑ کیوں ڈالا؟ یہ تو ابو کی آواز تھی! ابو نے امی کا کیا بگاڑا تھا؟.. اب مجھ سے باتیں کون کرے گا؟ ایرکن چچا تو بھاگ کھڑے ہوئے، امی خاموش ہیں اور ابو چپ ہو گئے۔ میں تنہا رہ گیا، تنہا، جیسے اسی تاریک اور بھیانک جنگل میں...

"ارے مغدی!" گیٹ کے سامنے پگلی محمودہ نظر آئی۔ ناگن کہیں کی! "تمہارا یہ نیا باپ اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ بھاگ گیا۔ قصہ ختم۔ اب انتظار نہ کرنا..."

"احمق کہیں کی!" میں نے دل ہی دل میں محمودہ کو جواب دیا اور اسپتال کا رخ کیا۔ امی کو وہیں ہونا چاہئے۔ انہیں کسی نہ کسی کا علاج کرتے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے اور شاید کسی دوسرے زخمی کو گھر لے آئیں۔ ایسا کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا! شاید محمودہ سوچتی ہوگی کہ وہ جیت گئی۔ ہونہہ، ناممکن ہے! ہم اپنے گھر میں کسی دوسرے زخمی کی تیمارداری شروع کر دیں گے۔ وہ اپنے بالوں کو نوچتی رہے۔ اور نیا زخمی اس پگلی کو دکھا دے گا کہ میری امی پر تہمت‌تراشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ ان سب کو مزہ چکھا دے گا، ثابت کر دے گا کہ حقیقی سپاہی، بہادر اور طاقتور سپاہی کسے کہتے ہیں۔

کون جانے، امی اس بار بالکل اصلی جنرل ہی کو گھر لے آئیں۔ تب تو غصے اور جلن سے محمودہ کی جان ہی نکل جائے گی۔ جنرل حکم دے گا: "منتشر ہو جاؤ!" پھر کیا مجال جو کوئی حکم عدولی کر سکے۔ وہ تو اپنے سپاہیوں کو، پوری رجمنٹ کو، ایک ہزار بلکہ دس لاکھ آدمیوں کو لے آئے گا۔ وہ لوگ قلندر کا گلا پکڑ کے اسے آسمان پر پہنچا دیں گے اور وہ وہیں رہا کرے گا۔ رہی محمودہ اور

کم‌سن اور ناسمجھ ہو۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"یہ تم اس محبت کی بات کر رہے ہو نا جو فرہاد اور شیریں کے قصے میں پائی جاتی ہے؟ زولوشکا اور سخی شہزادے کی، بوراتینو اور مالوینا* کی جیسی محبت؟"

"ہاں، ہاں، فرہاد اور شیریں کی جیسی محبت۔ اب تم سمجھ گئے۔"

ہاں مرات، بےشک اب کچھ نہ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ محبت... یہ لفظ سب سے پہلے تم ہی نے کہا اور میری سمجھ میں آنے لگا۔ سب لوگ برا بھلا کہتے رہے، گالی گلوج کرتے رہے، غصے اور نفرت کا اظہار کیا لیکن کسی نے محبت کا نام نہ لیا۔ کسی نے نہ کہا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ کاش ذرا پہلے مجھے اس کے متعلق بتا دیا گیا ہوتا، سمجھا دیا گیا ہوتا کہ یہ فرہاد اور شیریں، بوراتینو اور مالوینا ہی کی جیسی محبت ہے یہ وہی جذبہ ہے جس کے تحت لوگ خوش ہوتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، روتے دھوتے اور غمگین رہتے ہیں یا پھر اپنے اندر تبدیلی لاکر فرہاد کی طرح نیک کام کر سکتے ہیں، بوراتینو کی طرح مسرت اور خوش‌بختی کی سنہری کلید تلاش کر سکتے ہیں اور مہیب اور خوفناک کاراباس باراباس سے لڑکے اسے شکست دے سکتے ہیں۔

اچانک میں چونک پڑا، سہم گیا۔ اور ابو؟ میرے ابو کیا کریں گے؟ ابو بھی تو امی سے محبت کرتے ہیں، بوراتینو، فرہاد اور سخی شہزادے کی جیسی محبت۔ تو پھر ابو پر کیا بیتے‌گی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ امی ابو سے بھی محبت کریں اور ایرکن چچا سے بھی؟ اسی طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ ابو اور ایرکن چچا دونوں امی سے محبت کریں؟ اب ایک بار پھر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے...

"اچھا مرات، یہ تو بتاؤ کہ کسی کی محبت کو فنا کرنے‌والے کو لوگ واقعی مار ڈالتے ہیں؟"

---

* بچوں کی کہانیوں کے کردار۔ اڈیٹر۔

مگر وہ پگلی محمودہ پھر نمودار ہوگی اور اس کی باچھیں کھل جائیں گی۔

"کوئی بات نہیں" میں نے اس سے مخاطب ہوکے کہا۔ "آج ہمارے یہاں ایک جنرل آئےگا۔ اسے دیکھ‌کے تمہارے اوسان خطا ہو جائیں گے..."

مرات، مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ اپنے بڑوں پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ ان کے معاملات بہت پیچیدہ اور الجھے ہوئے تھے۔ ابو کہیں محاذ پر لڑ رہے تھے۔ ایرکن چچا ہمارے یہاں رہتے تھے تو گھر کا ماحول اچھا تھا لیکن وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے جاتے ہی امی جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ نانا آتے تو ہنسی مذاق کیا کرتے تھے لیکن وہ بھی بہت جلد واپس چلے گئے۔

ساری صورت حال بدل اور الجھ سی گئی۔ تم بھی ہر وقت اداس اداس سے نظر آتے تھے۔ ہم جانے کیوں بہت دبی ہوئی آواز سے باتیں کر رہے تھے:

"کیا وہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے؟"

"تم بھی طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں سنتے رہے ہو کیا؟ ارے، ہم کسی دوسرے زخمی کو لے آئیں گے، کسی جنرل کو جو چچا سے کہیں زیادہ باہمت ہوگا۔ امی اسپتال گئی ہوئی ہیں۔"

"اچھا، کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری امی اور چچا ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟"

"کیا کہا؟ ذرا پھر تو کہو!"

"ارے بےوقوف، اس میں کون سی خراب بات ہے؟ میں سچ کہتا ہوں، محمودہ کی طرح گندی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ محبت تو جیسا کہ میں نے پڑھا ہے، اتنی اچھی چیز ہے کہ اس کے لئے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں۔"

"جان قربان کر دیتے ہیں؟ لیکن آخر کیوں؟"

"ارے! محبت تو اتنی اچھی، اتنی اچھی چیز ہے کہ اس کی راہ میں حائل ہونےوالوں کو ہلاک تک کیا جا سکتا ہے۔ یہ تم مجھے کھا جانےوالی نگاہوں سے کیوں گھور رہے ہو؟ دراصل تم ابھی بہت

ہم ابھی سوئے نہیں تھے۔ میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور امی میز کے پاس بیٹھی تھیں۔ دونوں ہی منتظر تھے۔ سناٹا چھایا ہوا تھا... صرف گھڑی ہی کو کسی کا انتظار نہ تھا اور حسب معمول اس کی گھنٹیاں بج رہی تھیں — نو، دس، گیارہ...

امی سننے لگیں۔ میں بھی سننے لگا۔ آخر انہیں کس کا انتظار ہے اور مجھے کس کا؟

رات گئے امی کچھ اور بھی زیادہ پریشان ہو اٹھیں۔ بار بار نکل کے صحن میں جاتیں اور وہاں سے کچھ اور بھی زیادہ اداس اور کھوئی کھوئی سی واپس لوٹتیں۔

اچانک مجھے صحن میں ان کے زور زور سے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں اور فوراً ہی صرف قمیض پہنے ہوئے کمرے سے ٹھنڈے صحن میں نکل آیا۔

"لالٹین لاؤ!" امی نے پکار کے کہا۔ "جلدی کرو..."

میں سمجھ گیا۔ بت بنا کھڑا دیکھ رہا تھا لیکن کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ کے سامنے صرف دو سیاہ شکلیں دھندلی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ ایرکن چچا در کے نزدیک پڑے ہوئے ہیں اور امی انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں، پکار رہی ہیں، سسکیاں بھر رہی ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ میں کھڑا جھوم رہا تھا اور شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ان کی واپسی اچھی بات ہے کہ بری۔ اس منحوس لالٹین کی وجہ سے ٹھیک سے یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ زندہ ہیں کہ نہیں۔

مجھے نہیں یاد کہ امی نے کسی کے سہارے کے بغیر اکیلے انہیں کیسے اٹھا کے کھڑا کیا اور کس طرح کمرے تک لائیں۔ انہوں نے چچا کو بستر پر لٹا دیا اور چچا نے آنکھیں کھول دیں تو امی نے ان کے بازو اور چہرے کو سہلانا اور انہیں پیار کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کے لیٹ گیا اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ فوراً سو جاؤں گا تاکہ ایرکن چچا اور امی کو نہ دیکھوں۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ سب محض میرے تصور کا کرشمہ ہے۔ حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ نہ چچا لوٹے ہیں، نہ امی نے ان

"ھاں... اس عقاب کی طرح جس کے بچوں کو چھین لیا جاتا ھے۔"

"تو پھر ابو کیا کریں گے؟ کیا وہ بھی ایرکن چچا کو مار ڈالیں گے؟ اور مرات، کیا یہ ممکن ھے کہ بیک وقت دو افراد سے محبت کی جائے؟ مجھے امی اور ابو دونوں سے محبت ھے اور وہ دونوں بھی مجھے چاھتے ھیں۔"

"بالغ لوگ شاید ایسا نہیں کر سکتے، مغدی۔"

"کر سکتے ھیں! کر سکتے ھیں! تم جھوٹ بول رھے ھو! تمہیں خود ھی کچھ نہیں معلوم! وہ کر سکیں گے، ابو اور امی ایسا کر سکیں گے۔"

ابو، میں آپ سے التجا کرتا ھوں، آپ ایسا کیجئے کہ امی آپ سے محبت کریں اور اگر وہ ایرکن چچا کے بغیر نہیں رہ سکتیں تو ان سے بھی محبت کریں۔ ھر معاملے کو پہلے ھی جیسا رھنا چاھئے۔ کوئی کسی کو ھلاک نہ کرے۔ ابو، آپ اس کی کوئی صورت نکال دیجئے نا۔ آپ تو بڑے سخی ھیں۔ کیا آپ کو افسوس ھے کہ امی ایرکن چچا سے بھی محبت کرتی ھیں؟ لیکن میں تنہا آپ سے محبت کروں گا۔ ایرکن چچا سے مجھے قطعی محبت نہیں۔ مجھ پر کتنے ھی ظلم کیوں نہ کئے جائیں، برابر یہی کہتا رھوں گا: "میں اس ڈرپوک سے محبت نہیں، نفرت کرتا ھوں!"

کون جانے شاید امی ایرکن چچا سے بہت زیادہ محبت کرتی ھوں۔ ممکن ھے امی کے لئے میری اور آپ کی محبت ناکافی ھو۔ امی ایسی ھی ھیں، کوئی انہیں بدل تھوڑی سکتا ھے۔ یاد ھوگا، آپ نے تو خود ھی کہا تھا کہ امی کو تمام لوگوں سے، ساری دنیا سے محبت کرنی چاھئے...

میں نے باھر نکل کے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ھوئے سوچا کہ اگر ایرکن چچا اچانک واپس آ گئے تو...

امی یہی چاھتی ھیں تو خیر، وہ لوٹ ھی آئیں مگر اب میں ان سے محبت نہ کروں گا۔ ابو، میں آپ کے ساتھ سوؤں گا اور ھم دونوں چپکے چپکے طرح طرح کی کہانیاں گڑھیں گے جنہیں چچا نہ سنیں گے۔ میں ان کے ساتھ نہ کھیلوں گا...



6—1483

"ابھی اٹھا، بس ابھی... شرط یہ ھے کہ آپ چلے نہ جائیےگا۔ میں آپ کو خوابوں میں بہت کم دیکھتا ھوں۔"

"ابھی تک سو ھی رہا ھے" امی کی آواز سنائی دی۔ "اچھا ھے سوتا رھے... علی‌الصباح ھی تو سویا ھے۔"

"ھاں امی، تھوڑی دیر اور سو لوں۔ میں آپ اور ابو کو خواب میں بہت کم دیکھتا ھوں۔ اب سب ٹھیک ھو جائےگا۔ ابو واپس آ گئے... مگر ابو، یہ آخر آپ کے ھونٹوں کو کیا ھوا؟ آپ زخمی ھو گئے تھے کیا؟"

"کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ھے۔ ذرا آنکھیں کھول‌کے دیکھو نا" ابو نے مجھے اٹھاکے پلنگ پر بٹھا دیا۔

ابوجان، بالکل صحیح سلامت میری نگاھوں کے سامنے کھڑے تھے! نہیں، میں سو نہیں رہا ھوں۔ میں ان کے ھاتھوں کو پکڑے ھوئے ھوں، یہ رھے ان کے ھاتھ۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا ھوں۔ ھونٹ کچھ عجیب سے ھیں، ان کے ھونٹ نہیں معلوم ھوتے...

"ابو آ گئے!"

میرے پیارے ابو جنگ میں ھلاک نہیں ھوئے، صحیح و سلامت واپس آ گئے۔ وھم نہیں، حقیقت ھے کہ وہ لوٹ آئے۔

"ارے، ارے، روتے کیوں ھو؟ دلیر بنو بیٹے، بوراتینو کی طرح۔ سمجھے؟"

"اچھا، اچھا، ابھی ذرا دیر میں خود کو سنبھال لوں‌گا... رو کہاں رہا ھوں۔ ابو، دراصل آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے میں تھک گیا۔ یقین ھی نہیں آتا تھا کہ آپ لوٹ آئیں‌گے۔ لیکن آپ واپس آ گئے۔ آپ میرے پاس ھیں... مگر ھونٹ... یہ فسطائیوں نے آپ کے ھونٹوں کو کیسا کر دیا؟"

انہوں نے مجھے پلنگ سے اٹھاکے فرش پر کھڑا کر دیا اور میں انہیں تکنے لگا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا، بےحد خوشی بھی محسوس ھو رھی تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فسطائیوں نے ان کے ھونٹوں کو کیسے بگاڑ دیا۔ محاذ پر جاتے وقت وہ بڑے خوبصورت تھے لیکن اب کچھ بدل‌کر لوٹے تھے...

کا بوسہ لیا ہے۔ صرف مجھے ہی ایسا لگا تھا کیونکہ سردی لگنے اور زکام ہو جانے کی بنا پر میں سخت بیمار تھا۔

ایرکن چچا، آپ واپس کیوں آ گئے؟ آخر کیوں؟ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ میں آپ کی عدم‌موجودگی کا عادی ہو چلا تھا اور ابو کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا تاکہ بالآخر ساری باتیں پہلے ہی جیسی ہو جائیں۔

امی آپ کا بوسہ لیں! وہ آپ سے محبت کریں! آپ دونوں جو کرنا چاہتے ہوں، کیجئے، جس طرح رہنا چاہتے ہوں، رہئے۔ آپ لوگ بالغ ہیں۔ میں ایسا رویہ اپناؤں‌گا جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں، جیسے کہ آپ ہمیشہ کے لئے چلے گئے اور دوبارہ لوٹ‌کر نہیں آئے۔ میں اکیلے رہتے ہوئے ابو کا انتظار کروں‌گا۔ طویل مدت تک ان کا انتظار کروں‌گا۔ آخرکار وہ لوٹیں‌گے اور مجھے سب کچھ سمجھا دیں‌گے۔ بالغو، بس اب میں زیادہ نہیں برداشت کر سکتا کیونکہ میری عمر صرف سات سال اور چار مہینے کی ہے...

## ۱۰

"ابو، ابوجان!" ●

وہ میرے پلنگ کے پاس کھڑے اپنے کٹے ہوئے ہونٹ کی وجہ سے کچھ عجب انداز سے مسکرا رہے تھے۔ چہرے سے کچھ زیادہ عمر کے اور آنکھوں سے تھکےماندے لگ رہے تھے۔ قریب ہی امی کھڑی تھیں اور وہ بھی مجھے تکے جا رہی تھیں۔

"ابو، ابوجان!"

مجھے معلوم تھا کہ جاگ گیا ہوں اور آنکھیں کھولیں لیکن یقین نہ آیا کیونکہ یہ صرف خوابوں ہی میں ممکن تھا۔

"مغدی!" ابو کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی ذہن میں دھیرے سے گونجی۔ یہ پہلے جیسی نہیں بلکہ کٹے ہوئے ہونٹوں کے باعث سیٹی بجاتی ہوئی سی تھی۔ "اٹھو مغدی، میں آ گیا..."

"آ گئے؟" میں نے سوچا کہ یقیناً خواب دیکھ رہا ہوں۔

"السلام علیکم، بیٹے... اب اٹھو بھی!"

"جنگ کے متعلق لکھنا ناممکن ھے، بیٹے۔ بہت سی باتیں ایسی ھوتی ھیں جن کے متعلق لکھنا ناممکن ھوتا ھے۔"

ابو دو ھفتے، پورے پندرہ شب و روز ھمارے ساتھ گزاریں گے!

"اچھا ابو، آپ نے زندہ، اصلی جنرل کو بھی دیکھا؟ یہ سچ ھے کہ جنرل بہت طویل قامت، آپ سے دوگنا لمبے ھوتے ھیں؟ اور ان کی آواز یوں ھی بلند ھوتی ھے جیسے ریڈیو پر گونجتی ھے؟"

"میرے جنرل کی آواز مچھر کی جیسی چیں چیں کرنےوالی تھی اور قد؟ قد تو بیٹے، تمہارے قد سے کچھ ھی اونچا تھا۔"

"ایرکن چچا جاگ گئے!" اچانک امی کی آواز سنائی دی...

انہوں نے دروازہ کھولا، در پر ٹھوکر لگنے سے کچھ شرمائے اور آگے بڑھ کے ابو کے پاس پہنچے۔

"السلام علیکم، السلام علیکم! دیر سے جاگنے کی معافی چاھتا ھوں۔ میں محاذ کے عقبی علاقے میں پہنچنے کے بعد گہری نیند سونےوالے سپاھی کی طرح سو رھا تھا۔ کہئے، محاذ کی کیا خبریں ھیں؟"

ایرکن چچا ابو سے جلدی جلدی باتیں کئے جا رھے تھے جیسے ڈر رھے ھوں کہ ابو سے جو کچھ پوچھنا چاھتے ھیں اسے بھول نہ جائیں۔

"فسطائیوں کو ماسکو کے نواح سے مار بھگایا گیا" ابو نے بتایا۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایرکن چچا، ابو کے چغے میں ملبوس تھے جو سائز میں بڑے اور ڈھیلے ھونے کی وجہ سے بھدا لگ رھا تھا اور آستینیں ان سے نہیں سنبھل رھی تھیں۔ ابو چچا سے قد میں ذرا چھوٹے، دانا اور تیزفہم آنکھوں اور چوڑے چکلے شانوںوالے تھے۔ وہ براہ راست محاذ سے، گولیوں کی پوچھار اور موت کے منہ سے زندہ بچ کے آئے تھے۔ امی پاس ھی کھڑی تھیں...

"ایرکن چچا، ابو اصلی تمغہ لائے ھیں" میں نے کہا۔

سب نے میری طرف دیکھا، مسکرائے اور اطمینان کی سانس لی جیسے ان میں سے ھر ایک نے اپنے شانوں سے کوئی بھاری بھرکم پتھر اتار پھینکا ھو۔

ایرکن چچا نے میرے سینے پر ٹنکے تمغے کو احتیاط کے ساتھ چھوتے ھوئے کہا:

"آپ کو کتنے تمغے ملے؟ ھیرو بن گئے نا؟"
"بس ایک تمغہ ملا ھے، وہ بھی روانگی سے ذرا ھی قبل۔"
"تو دکھائیے نا!"
"لو یہ رہا..."
انہوں نے فوراً ھی سامان کے تھیلے سے تمغہ نکال کر میرے سینے پر ٹانک دیا۔
"امی، آپ دیکھ رھی ھیں نا، اصلی تمغہ ھے!.. ابو، اسے امی کو تحفے میں دے دیجئے۔"
"اچھا، بیٹے... نورا، سنا تم نے؟"
امی کچھ کہنا چاھتی تھیں لیکن خاموش رھیں۔ بس میرے پاس آکے تمغے کو چھوکے دیکھا...
"آپ پھر چلے جائیں گے؟ اب نہ جائیے، ابو۔"
"ھاں بیٹے، دو ھفتے بعد مجھے محاذ کو لوٹ جانا ھے... جنگ ابھی ختم تھوڑی ھوئی ھے..."
"میں نے آپ کا کتنا انتظار کیا! امی نے انتظار کیا۔ سب نے کیا۔ اور آپ... اچانک پھر چلے جائیں گے!"
"جنگ ھو رھی ھے، بیٹے۔"
امی دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی رھیں۔ انہیں میری حمایت کرنی چاھئے تھی۔ امی بھی عجیب ھیں۔ پہلے ابو سرکاری دوروں سے لوٹتے تھے تب بھی وہ خوشی سے پھولی نہ سماتیں، ادھر ادھر دوڑی دوڑی پھرتیں لیکن اس وقت ان کی وہ کیفیت نہ تھی۔ شاید وہ خوش ھوتے ھوتے تھک گئی تھیں کیونکہ ابو علی‌الصباح ھی گھر آ گئے تھے جبکہ میں سو رھا تھا۔
"ابو، ایرکن چچا سے ملاقات ھو گئی نا؟ آپ کو یاد ھوگا ھم نے ان کے متعلق لکھا تھا۔"
"ابھی تو نہیں۔ تمہارے چچا سو رھے ھیں..."
"اور آپ وھاں لڑے کس طرح؟ آپ درختوں کے درمیان مضحکہ‌خیز انداز سے پھنس گئے تھے، یاد ھے نا؟"
"بےشک یاد ھے۔"
"آپ صحیح نشانے پر گولی چلاتے ھوں گے؟ ھچکچاھٹ کے بغیر؟ آپ نے جنگ کے متعلق ھمیں کیوں نہیں لکھا؟"

ابو جلد از جلد باهر جاکے اکیلے گھومنے پھرنے کو تڑپ رہے تھے۔ کسی طرح مجھے ساتھ لے جانے پر آمادہ ھی نہیں ہوتے تھے۔ آخرکار میرے اصرار سے مجبور ھوکر بولے:

"اچھا تو، کپڑے پہنو۔"

"لیکن میری ایک شرط ھے۔ آپ اپنا تمغه سینے پر لگا لیجئے۔"

ابو ذرا دیر تک سوچتے رھے، پھر ھاتھ ھلایا اور تمغے کو سینے پر ٹانک لیا۔ ھم دونوں گھر سے نکلے اور ماضی کی طرح ایک دوسرے کا ھاتھ پکڑکے چلنے لگے۔ ابو بھاری بھرکم قدم جماتے چل رہے تھے۔ ان کا ھر قدم میرے دو قدموں کے برابر تھا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے مجھے تقریباً دوڑنا پڑ رھا تھا۔

اس وقت جیسے جان بوجھکے ھر شخص سڑک سے غائب تھا۔ نه کوئی ان کے تمغے کو دیکھنےوالا تھا اور نه ھی کوئی بچه جو مجھ پر رشک کرتا۔

ھاں، محموده ضرور حسب معمول اپنی ڈیوٹی دے رھی تھی۔ غالباً تمام دن اس کا ایک یہی کام ھوتا ھے که اپنے گیٹ کے سوراخ سے ایک ایک راھگیر پر نگاہ جمائے رھے۔ اچانک اس نے سوراخ سے ابو کو دیکھا اور ان کے خیرمقدم کے لئے لپک‌کے باھر نکل آئی۔

"السلام علیکم، انجینیر صاحب! واپسی مبارک ھو، انجینیر صاحب! خدا کا شکر ھے که آپ صحیح سلامت ھیں... یہاں آپ کی عدم‌موجودگی میں ھم سمجھ سے بالاتر کچھ چیزوں کو دیکھتے دیکھتے جیسے اندھے ھو گئے..."

"ایسی بھی کیا بات ھے، پڑوسن جو آپ کی سمجھ سے بالاتر ھے؟"

"ھائے، ساری باتیں آپ کو کیسے بتاؤں!" محموده نے کہا۔ وه ھمارے ارد گرد چکر کاٹ رھی تھی۔ کبھی دائیں جانب آ جاتی، کبھی بائیں جانب۔

"کھڑی ھو جائیے نا؟ یه آپ کو ھو کیا گیا ھے؟"

"ارے انجینیر صاحب، یقین مانیے میں کہی سنی باتوں پر دھیان دینےوالی نہیں۔ خدا کے فضل سے سمجھدار عورت ھوں۔ ڈاکٹرنی صاحبه کے لئے میں محلے بھر سے لڑائی مول لیتی رھی ھوں... لوگ کہتے ھیں که وه کچھ ایسی ویسی ھیں..."

"هاں، اصلی تمغه هے... تم کو اپنے ابو پر فخر کرنا چاهئے!"
"مرات کو بھی ایسا تمغه ملا هوتا!"
"یه تم کس مرات کی بات کر رهے هو، بیٹے؟" ابو نے پوچھا۔
"وهی جو میرے خطوط لاتا هے؟"
"جی هاں۔ آپ کو اس سے متعارف هونے کا موقع ملےگا۔"
"جانے کیوں ادھر زیاده دنوں سے دکھائی نهیں دیا" امی نے کها اور ایرکن چچا نے ان کی هاں میں هاں ملائی۔
یه بالغ لوگ بھی حیرت‌انگیز طور پر مضحکه‌خیز هیں۔ آج سب کو جانے کیا هو گیا هے۔ مجھ پر سوالوں کی بوچھار کئے جا رهے هیں جیسے آپس میں بات کرنے کا کوئی موضوع هی نه هو۔
"میرے ابو بھی زخمی هو گئے تھے" میں نے ایرکن چچا سے کها۔ "ان کے هونٹوں کو دیکھ رهے هیں نا؟ ابو، انهیں بتائیے نا که آپ کا علاج کیسے کیا گیا تھا۔"
"بس یونهی۔ میں نے خود هی مرهم‌پٹی کر دی اور زخم اچھا هو گیا۔"
"مرهم‌پٹی کیسے کر دی؟ جانتے بھی هیں که کیا کهه رهے هیں؟ جراثیم جسم میں پھیل جاتے تو؟" امی بول پڑیں۔
"هونهه، جراثیم! جراثیم گئے بھاڑ میں۔ جنگ میں سب جراثیم جل‌کے خاک هو گئے!"
"پھر بھی" ایرکن چچا نے کها۔ "چھوت کی روک‌تھام کے لئے تدابیر کی جانی چاهئے تھیں۔"
"اور خود آپ کی طبیعت کیسی هے؟"
"بهتر هے، پهلے سے کهیں بهتر" ایرکن چچا کے بجائے امی نے جواب دیا۔
"واپسی کی تیاری کر رها هوں۔"
نهیں، یه دونوں ابو کو دھوکا دے رهے هیں۔ میں جانتا هوں که ایرکن چچا کی طبیعت خراب هے۔ اکثر بخار هو جاتا هے اور امی فوراً امبولنس کار کو بلاتی هیں کیونکه وه خود اپنے خوف پر قابو نهیں پاتیں۔ شاید چچا محاذ پر کبھی واپس نه جا سکیں‌گے۔ امی اب اس کا تذکره تک نهیں کرتیں... خود ایرکن چچا بھی جنگ کو یاد نهیں کرتے...

کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اتنے میں اسے کسی نے خوف‌زدہ کر دیا؛ اور وہ انہیں چاروں طرف بکھرا ہوا چھوڑکے بھاگ کھڑا ہوا۔ دوبارہ واپس آکے اس نے ان کھلونوں کو ترتیب سے نہیں رکھا۔

اس کے بعد ابو ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے رہے جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے، اس طرف دیکھتے رہے جدھر دور دور تک مادر وطن کی حدود پھیلی ہوئی تھیں، جہاں شہر، ندیاں اور جنگلات ابھی جنگ کے شعلوں سے محفوظ تھے۔ وہ اس سمت دیکھ رہے تھے جہاں جنگ ہو رہی تھی۔

وہاں وہ کیا دیکھ رہے تھے؟ کاھے کے بارے میں وہ سوچ رہے تھے؟

ممکن ہے ابو نے وہی سب کچھ دیکھا ہو جسے بعد میں، اس واقعے کے دس سال بعد میں نے اس وقت دیکھا تھا جب سب سے اداس اور ناقابل‌برداشت لمحات میں اس قلعے پر پہنچ‌کے دور دور تک دیکھتا رہا تھا۔ میری نگاہیں اس طرف دیکھ رہی تھیں جدھر خوبصورت مناظر تھے، آفتاب کی شعاعیں اور تازی ہوائیں تھیں۔ میرا جی چاھتا تھا کہ کسی چیز کے بارے میں سوچے اور کہیں رکے بغیر آگے بڑھتا جاؤں کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس طرف انسان اتنا آزاد اور خودمختار ہوگا کہ وہ بہ‌آسانی درخت، پرندے اور بادل میں — ہر پاکیزہ اور بے‌داغ چیز میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

شاید ابو اس وقت اس چیز کا خواب دیکھ رہے تھے جس کا خواب مجھے دس سال بعد دیکھنا تھا... شاید...

لیکن اچانک انہوں نے کہا:

"آؤ، نیچے اتریں! چلو! جلدی کرو!"

ہمارے پیچھے ہر شے دوڑ رہی تھی، سیٹی بجا رہی تھی، ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔

"بہت خوب! بہت عمدہ!" ابو نے نیچے اترکے کہا۔

پھر وہ مجھے ایک بے‌رونق اور سنسان پارک میں لے گئے جہاں ہم ایک پرانی بنچ پر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ میں ابو سے کچھ پوچھ رہا تھا مگر وہ نہ جواب دے رہے تھے، نہ سن رہے تھے۔ بس کبھی سر اٹھاکے میری طرف دیکھتے، جواباً مسکراتے اور خاموش رہتے۔

ہم لوگ پارک سے واپس ہو رہے تھے تو انہوں نے کہا:

ابو کی جتنی تعریف کی جائے کم ھے۔ ان کے چہرے سے کوئی رد عمل نہ ظاہر ہوا۔ صرف میں نے اپنے ھاتھ میں ان کے ھاتھ کی ھلکی سی کپکپاھٹ محسوس کی اور بس۔ انھوں نے کہا:

"محترمہ، آپ نے اس گھوڑی کے متعلق کہاوت سنی ھے نا جو بلا سبب اس انتظار میں لیٹی رھی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ اکھڑ جائے؟"

"سنی تو ھے لیکن..."

"یہ سب سفید جھوٹ ھے۔ اور میں اس "ھمدردی" کے لئے کسی بھی طرح آپ کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔"

محمودہ کسی حیرت‌زدہ بکری کی طرح دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگی:

"آپ برا مان گئے کیا؟.. میرا مطلب... میں تو یونہی... آپ کے خاندان سے دوستی کی خاطر..." اور وہ اچانک اپنے گیٹ کی طرف لپکی۔ "تم مرد نہیں ھو، بزدل ھو! تمھاری بیوی بدچلن ھے اور تم مسکرا رھے ھو۔"

ابو بھی آپے سے باھر ھوکے چیخ اٹھے:

"بڑی شریف بنتی ھو، مجھے اور غصہ نہ دلاؤ!"

ابو وھاں سے چل دئے۔ میں اپنے ھاتھ میں ان کے ھاتھ کی کپکپاھٹ محسوس کر رھا تھا جیسے انھیں ملیریا ھو گیا ھو۔ وہ بار بار کہے جا رھے تھے: "بھاڑ میں جائے! بھاڑ میں جائے!"

ھم ان سڑکوں سے گزر رھے تھے جو میرے لئے بالکل اجنبی تھیں۔ آخرکار جانے کیوں اس قلعے تک پہنچ گئے جہاں شہر کی حدود ختم ھوتی تھیں۔ پھر ھم لوگ سفید، بالکل سفید راستے سے اوپر چڑھنے لگے۔ ابو خاموشی سے میرا بازو پکڑے ھوئے مجھے اوپر کی طرف کھینچے لئے جا رھے تھے اور جانے کیوں سیٹی بجاتے جا رھے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ ھم قلعے کے اوپر جاکے کیا کریں گے۔

بلندترین جگہ پر پہنچ‌کے میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور میں بیٹھ گیا۔ ابو کھڑے کھڑے نیچے شہر کے مناظر کو دیکھ رھے تھے۔ ان کی نگاھیں مٹی کے انھی سو مکعبوں پر مرکوز تھیں جو بےترتیبی سے پھیلے ھوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بچہ چوکھٹوں کے ان

ایرکن چچا کھڑے ھوکے کمرے میں ٹھلنے لگے۔
"پھر کیا ھوا؟" امی نے پوچھا۔
"پھر کیا ھوا؟ پھر ابو نے ریت پر طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے، سمجھ میں نہ آنےوالے نشانات بنائے۔ اس کے بعد ھم لوگ کہاں گئے، یہ اب مجھے یاد نہیں رھا۔"
ابو ھاتھ دھوکے اس کمرے میں داخل ھوئے جہاں ھم سب بیٹھے ھوئے تھے۔
"یقیناً تم سب کچھ بتا چکے ھوگے؟" انھوں نے میرے بالوں کو الجھاتے ھوئے کہا۔
"تم لوگوں کو بھوک لگی ھوگی نا؟" امی نے پوچھا۔
"ھاں، ھاں، ھم بہت بھوکے ھیں!" ابو نے جواب دیا۔ "اتنی تازی ھوا ھے..."
امی باورچی‌خانے میں چلی گئیں تو ھم لوگ کئی منٹ تک خاموش رھے۔ میں انتظار کر رھا تھا کہ خاموشی کو کون توڑتا ھے۔ آخر ایرکن چچا ھی نے سب سے پہلے بولنا شروع کیا:
"میں... میں نے بہت چاھا تھا کہ آپ کی واپسی تک اچھا ھو جاؤں۔ اس صورت میں ھم دونوں ساتھ ساتھ محاذ کو روانہ ھو سکتے تھے۔"
"آپ خوش‌قسمت ھیں کہ تین ھی مہینوں کے بعد اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے ھونے کے قابل ھو گئے" ابو نے جواب دیا۔ "جانے کا وقت بھی آ ھی جائےگا۔"
"جی ھاں، میں خوش‌قسمت معلوم ھوتا ھوں..."
"اور ھماری ڈاکٹرنی کیا کہتی ھیں؟"
"وہ تو کہتی ھیں کہ جلد ھی اچھا ھو جاؤں‌گا لیکن یہ ایک مہمل سی بات ھے۔ اسی کی مجھے فکر بھی ھے۔"
"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔"
"لیکن میں کوئی لولا اپاھچ، کوئی ناتواں تو ھوں نہیں!"
"آپ ضرور اچھے ھو جائیں‌گے۔ ذرا کچھ اور صبر سے کام لیجئے۔ صبر و تحمل تو بہادری کی علامت ھیں۔"
"شکریہ۔"
اتنے میں امی نمودار ھوئیں۔ در پر کھڑے ھوکے ابو اور ایرکن چچا کی باتیں سنیں، پھر دھیرے دھیرے اندر داخل ھوکے میز پر

"اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا! سب ٹھیک ہو گیا!"

ایک بار پھر ہم اجنبی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ ابو تقریباً ہر درخت کے پاس رک رک کے اس کی چوٹیوں کو دیکھتے اور جانے کس سوچ میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے...

"ابو، آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے؟"

لیکن وہ کچھ سن ہی نہیں رہے تھے جیسے میں ان کے ساتھ رہا ہی نہ ہوں۔

میں اصرار کرنے لگا:

"ابو، گھر چلئے۔ آج آپ کچھ ایسا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں جو سمجھ میں آنےوالا نہیں۔"

"ہاں، زیادہ سمجھ میں آنےوالا نہیں" انہوں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کیوں، کیوں!" انہوں نے میرا مذاق اڑایا۔

"کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو مجھے تو فوراً ہی اس کا احساس ہو جاتا ہے۔"

"ارے، تم خوش‌قسمت جو ٹھہرے!"

"اور آپ؟.. آپ خوش‌قسمت نہیں ہیں؟"

"سب بکواس ہے! گھر کے لئے مارچ کرو! لفٹ رائٹ! لفٹ رائٹ!"

•

"امی، امی! میں نے کہا تھا نا کہ ابو آکے آپ کا بدلہ لے لیں گے۔ کاش آپ نے دیکھا ہوتا کہ محمودہ کس طرح سر پر پاؤں رکھ‌کر بھاگی!"

اتنے میں ایرکن چچا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور میز کے پاس بیٹھ‌کے مجھے تکنے لگے۔ ان کا چہرہ کیسا فق پڑ گیا تھا! آخر انہیں ہوا کیا؟ کیا پھر بیماری کا دورہ پڑ گیا؟ اور امی کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی کیوں ہیں؟ وہ رو رہی تھیں کیا؟

"تم لوگ کہاں گئے تھے؟" امی نے پوچھا۔

"قلعے تک۔ بعد میں ابو نے مجھے جانے کن کن سڑکوں پر گھمایا۔ ان سے تو میں پہلے کبھی گزرا ہی نہیں تھا" میں نے جواب دیا۔

سونے سے قبل ہم لیٹے لیٹے یہ دیکھتے رہیں گے کہ چھت پر پرچھائیاں کیسے متحرک ہوتی ہیں، پھر دبی آواز میں تاکہ امی اور ایرکن چچا کی نیند میں خلل نہ پڑے، کہانیاں گڑھیں گے۔ بعد میں ابو مجھے جنگ کے بارے میں بتائیں گے۔

صبح کو میں اپنے خوابوں کی تعبیریں بیان کروں گا: سانپ نظر آئے تو بارش ہوگی، سکے دکھائی دیں گے تو میرے دانتوں میں درد ہوگا اور فرہاد ماموں مرحوم نظر آئیں تو مجھے معلوم نہیں کہ اس کی تعبیر کیا ہوگی۔

ابو نے کہا:

"دیکھو، آج تمہیں کوئی کہانی نہ سناؤں گا۔ سڑکوں پر گھومتے گھومتے تم بہت تھک گئے ہو۔ کل، پرسوں اور باقی تمام پندرہ راتوں میں بخوشی کہانیاں سناتا رہوں گا۔"

انہوں نے مجھ سے تو سو جانے کو کہا لیکن خود نہیں سو رہے تھے۔ میں کن انکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکا جھپکا کے بار بار ٹھنڈی سانسیں لئے جا رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ میں سو ہی نہیں رہا ہوں تو جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا:

"سو جاؤ نا!"

"آپ میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیجئے، فوراً ہی سو جاؤں گا۔"

ذرا دیر تک چپ چاپ لیٹا رہا جیسے سو گیا ہوں۔ اس کے بعد ضبط نہ کر سکا:

"ابو، ایرکن چچا آپ کو پسند ہیں نا؟ یہ سچ ہے نا کہ وہ نیک آدمی ہیں؟"

"میں سو رہا ہوں۔"

لیکن وہ سو کہاں رہے تھے۔

"آپ چچا سے دوستی کر لیں گے نا؟"

وہ کچھ ایسا انداز اختیار کئے ہوئے تھے جیسے سن ہی نہ رہے ہوں۔

"کتنا اچھا ہوا کہ آج ہم سیر کرنے گئے۔ کل سب کے سب ایک ساتھ سیر کرنے نکلیں گے۔ منظور ہے نا؟ امی اور ایرکن چچا بھی ساتھ ہوں گے۔"

دسترخوان لگانا شروع کر دیا۔ خشک میووں، ڈبل روٹی اور نان کی انہی دنوں جیسی افراط تھی جب ابو محاذ پر نہیں گئے تھے۔

"میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں" ابو نے کہا۔ "چھری اور پلیٹیں اپنی پرانی جگہ پر ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

ابو باورچی‌خانے سے چھری اور پلیٹیں لے آئے اور ہمیشہ کی طرح میزبانی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے روٹی کاٹ کاٹ‌کے سب کی پلیٹوں میں رکھنے لگے۔

"بہت عمدہ خربوزہ ہے!" انہوں نے ایک خربوزے کو ہاتھ میں اچھالتے ہوئے کہا۔

سب لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو ابو نے اپنی عادت کے بموجب خربوزے کو کاٹنے سے قبل اسے میز پر گھمانا شروع کر دیا۔

میز پر بالغ پھر خاموش ہو گئے اور خربوزہ کھانے لگے۔

بعد میں امی برتن دھونے کے لئے باورچی‌خانے میں چلی گئیں۔ ابو نے پہلے ہی کی طرح ان کی مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن امی نے انہیں روک دیا۔ ہم تینوں میز پر بیٹھے رہے۔

چچا، ابو کو خلوص دل سے دیکھ رہے تھے۔ ابو کے جذبات بھی دوستانہ تھے اور اس ماحول کو دیکھ‌کر مجھے بےحد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے عادی ہو جائیں‌گے، یقیناً ان میں گہری دوستی پیدا ہو جائےگی۔ امی جو اس وقت بڑی فکرمند نظر آ رہی ہیں، پھر پہلے ہی جیسی ہو جائیں‌گی اور ہم چاروں – میں، امی، ابو اور ایرکن چچا ایک ساتھ خوشحالی اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے لگیں‌گے۔ کاش یہ دن جلد ہی آئے!

پھر یہ بحث دیر تک جاری رہی کہ کون کہاں سوئےگا۔ آخرکار طے پایا کہ امی میرے کمرے میں سوئیں‌گی اور میں ابو کے ساتھ بڑے کمرے میں جہاں عموماً گرمیوں میں سویا جاتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر لیٹیں‌گے اور ہمیں سردی نہ لگےگی۔ میں رات میں کمبل کو سنبھالتا رہوں‌گا تاکہ ابو کے اوپر سے کھسک نہ جائے۔ ٹھنڈے بستر میں پہلے میں جاکے لیٹ رہوں‌گا تاکہ وہ کچھ گرم ہو جائے اور تب ابو آکے بغل میں لیٹ جائیں‌گے۔

"غالباً" سے دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم تینوں — میں، ابو اور نانا ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں۔

قیام کے تیسرے روز نانا نے لذیذ اور عمدہ پلاؤ پکایا۔ کھانے کے وقت گرم سندل کے پاس بیٹھے بیٹھے ہم لوگوں نے کپاس اور خربوزے کی اقسام اور سردیوں کے متعلق باتیں کیں. پھر ابو یا نانا نے (مجھے ٹھیک سے یاد نہیں) امی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تم مجھے کیا سمجھا رہے ہو؟" نانا نے کہا۔ "تمہارے محاذ پر جاتے ہی نورا نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ دقیانوسی طرز کی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتیں!"

ابو دیر تک خاموش رہے۔ اس دوران ہم نے پلاؤ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ آخر ابو نے جواب دیا:

"ہم ان کے بارے میں جانتے ہی کیا تھے؟ صرف اتنا کہ وہ زندہ‌دل، فیاض، نیک اور لاڈلی ہیں۔ مجھ سے اور مغدی سے محبت کرتی ہیں اور بس!"

"نورا کو اس کے علاوہ اور ضرورت بھی کس چیز کی تھی؟"

"ممکن ہے وہ خود بھی سوچتی رہی ہوں کہ انہیں جو کچھ میسر ہے، کافی ہے اور ممکن ہے یہ صورت نہ رہی ہو۔ شاید انہیں ہمیشہ یہ احساس رہا ہو کہ وہ اس سے زیادہ کی اہل اور مستحق ہیں۔"

"بہرحال ان کے پاس اپنے حالات سے غیرمطمئن رہنے کا کبھی بھی کوئی جواز نہیں تھا!"

ایسا لگتا تھا کہ جیسے ابو، نانا کی باتیں سن ہی نہ رہے ہوں۔ انہوں نے بڑی دھیمی آواز میں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، کہا:

"لیکن ہم معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکے اور پہنچنا بھی نہیں چاہتے تھے..."

نانا کچھ اور کہنےوالے تھے لیکن جیسے ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا:

"مغدی، تم باہر جاکے گھومو پھرو نا۔"

"بیٹھے رہنے دیجئے" ابو بول اٹھے۔ "معاملے کا تعلق مغدی سے بھی ہے۔ میرے بیٹے کو بہت کچھ سمجھنا چاہئے... ہاں تو بعد میں

میں کچھ اور بھی کہنے لگا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ رات میں سوؤں‌گا نہیں بلکه ابو کو دیکھتا رهوں‌گا کیونکه وہ خود بھی نہیں سو رہے تھے۔

صبح کو ھر بات کا انجام عمدگی سے ھوا، بالکل کہانیوں کی طرح۔ ابو نے میرے اوپر کمبل اتار پھینکا اور ھدایت کی:

"اٹھو بیٹے، تمھارے نانا کے یہاں چلیں‌گے۔ دیکھ رہے ہو کہ بالکل تیار ھوں۔"

"ابھی اٹھا، ابو"

کھڑکی سے میں نے امی کو صحن میں دیکھا۔

"امی، ارے امی! ہم لوگ نانا کے یہاں جا رہے ھیں!"

امی نے ٹھہرکے پہلے ابو کو، پھر مجھے دیکھا...

"امی، آپ بھی چلئے۔ آپ کے بغیر ھمیں اکیلاپن محسوس ھوگا۔ چچا کو بھی ساتھ لے چلیں‌گے۔"

"تمھارے چچا کو سردی لگ سکتی ھے" امی نے کہا۔ پھر انہوں نے اضافه کیا: "گرمیوں میں جب وہ اچھے ھو جائیں‌گے تو سب لوگ ساتھ نانا کے یہاں چلیں‌گے۔"

"تو آپ نه چلیں‌گی؟"

"ٹھیک ھی تو ھے مغدی، تمھارے چچا کے سردی لگ جانے کا ڈر ھے" ابو نے امی سے اتفاق کیا۔

میں نے سوچا تو خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا کہ چچا کا گھر پر رھنا واقعی بہتر ھوگا۔ گرمیوں میں ہم لوگ ضرور گاؤں جائیں‌گے۔

سردیوں میں نه درختوں پر چڑھا جا سکتا ھے، نه سیب اور خوبانی توڑنے کا سوال ھوتا ھے اور نه ھی ندی میں نہانے اور گھاس پر کھیلنے کودنے کا۔ گھر کے اندر گرم سندل میں پاؤں پھیلاکے بیٹھے رھنا پڑتا ھے اور کھانے کو صرف خشک خوبانی ملتی ھے اور خشک نان...

گاؤں پہنچ کر پہلے میں نانا سے کچھ روٹھا روٹھا سا رہا کیونکه پچھلی بار وہ ھمارے یہاں سے چپ چاپ چلے آئے تھے۔ ان کے سوالوں کے جواب بھی بس "ھاں"، "نہیں" ھی سے دئے۔ خود ابو بھی ان کی باتوں کے جواب مختصراً "ھاں"، "نہیں"، "ظاھر ھے" اور

ان دونوں سے بھی آگے نکل جاؤں گا۔ میں بھی باعزم اور باھمت انسان بنوں گا۔ میں بھی کوئی کارنامہ انجام دوں گا۔ کسی شخص کا علاج کروں گا اور جب اسے اچھا کر دوں گا تو ابو ضرور کہیں گے: اب مغدی بھی بالکل دوسرا ھی انسان بن گیا...

... اگلے روز ھم تینوں – میں، ابو اور نانا ایک ساتھ شہر میں امی کے پاس واپس آ گئے۔

اس کے ساتھ ھی ساتھ کہانی ختم ھوتی ھے، مرات۔ جنگ بےحد طویل ثابت ھوئی۔ دن گزرتے جا رھے تھے لیکن جنگ تھی کہ ختم ھونے کا نام ھی نہیں لیتی تھی۔

مرات، اس کے بعد ایک بار پھر ھم دونوں مختلف لوگوں تک وہ منحوس سیاہ کاغذات پہنچانے لگے، ایک بار پھر ابو کے مزاحیہ خطوط کا انتظار کرنے لگے، دن گننے لگے کہ وہ کب واپس لوٹیں گے۔

صرف ھم ھی نہیں بلکہ سبھی اپنے عزیزوں کی جنگ سے واپسی کے منتظر تھے، سبھی آس لگائے بیٹھے تھے... صرف ایرکن چچا ھی ایک ایسے تھے جن کا کسی کو انتظار نہیں تھا، صرف چچا ھی اپنا گھر تلاش نہ کر سکے حالانکہ میری امی نے ان کی صحت‌یابی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ میرے ابو کے محاذ جنگ پر واپس روانہ ھوتے ھی ایرکن چچا اس دنیا سے چل بسے۔

وہ زمانہ ھم سب سے بہت دور جا چکا ھے پھر بھی میری امی کبھی کبھی اداس ھوکر اشکبار ھو جاتی ھیں۔ ایسے موقعوں پر ابو ان سے خاص طور پر بڑی ھمدردی اور محبت سے پیش آتے ھیں۔

پته چلا که کوئی شخص ایسا بھی ھے جس کے لئے نورا کوئی کھلونا نہیں، تفریح کا ذریعه نہیں بلکه پوری زندگی ھے۔ جی ھاں، پوری زندگی۔ اس کی ضرورت پڑنے لگی اور نورا نے جو کچھ ھم سے چھپا رکھا تھا وہ آخرکار باھر پھوٹ نکلا۔ اب وہ بالکل مختلف شخصیت کی مالک ھیں – باعزم اور باھمت شخصیت کی۔ آپ سمجھ رھے نا، اباجان؟ میری رائے میں وہ ایرکن سے اس لئے محبت کرتی ھیں که ایرکن کو ان کی ضرورت ھے۔ جس شخص نے نورا کو بالکل مختلف کردار اپنانے میں مدد کی وہ ان کو عزیز ھے۔"

"اور تم لوگ؟ تم پر اور مغدی پر کیا بیتےگی؟"

"میرے اور مغدی کے لئے بھی نورا کی بہت ضرورت ھے..."

"ابوجان!" میں ان کی بات کاٹتے ھوئے بول پڑا۔ میں ابو کو پہلی بار اتنا زیادہ اداس اور پریشان دیکھ رھا تھا اور جی چاھتا تھا که رو پڑوں۔

میں کمرے سے باھر نکل آیا۔ پھر سرد، برفیلے کھیتوں میں منڈلانے لگا۔ میرے جوتوں کی ایڑیاں برف سے ڈھکی ھوئی زمین پر ٹپ ٹپ کی آوازیں پیدا کر رھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یه کسی شخص کی آوازیں ھوں، جیسے میں کسی شخص سے باتیں کر رھا ھوں۔

جی ھاں، میں کافی دنوں سے دیکھتا، سوچتا اور بھانپتا آ رھا تھا که امی ایک مختلف شخصیت کی مالک بن گئی ھیں۔ لیکن بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا که امی کے اندر پیدا ھونےوالی یه تبدیلی اچھی ھے یا بری۔ ابو نے کہا تھا که امی ایک باعزم اور باھمت انسان بن گئی ھیں۔ ھم اس معاملے کی ته تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی که وہ باعزم اور باھمت ھو جائیں، خودمختار ھو جائیں تاکه سارے معاملات کو خود ھی سنبھال لیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا که یه اچھی بات ھے یا بری۔ میں تو ڈرتا رھتا تھا که وہ خودمختار بن جائیں‌گی تو ان سے کیا سلوک کیا جائےگا۔ لیکن ابو نے کہا که یه بہت اچھا ھوا۔ اب ھمارے یہاں سب افراد باعزم اور باھمت ھیں، ابو بھی اور امی بھی۔ مجھے بھی انھی کا جیسا بننے کی حتی‌الامکان کوشش کرنی چاھئے۔ رونا دھونا نه چاھئے۔ نرم مزاج لڑکا نه ھونا چاھئے۔ میں تو



7—1483

# دوسرا سفر

ایویلینا شیویداکوفا
کے نام

## ۱

قائپ اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں انسان کو ڈر نہیں ہوتا کہ وہ مہلک بیماری، لو لگنے، سانپ کے ڈسنے، مچھلی کے زہر، اندھےپن، بہرےپن، کھانسی یا کسی کی نظر لگنے کا شکار ہو جائےگا۔ اس کی عمر کی یہ وہی منزل ہے جہاں انسان اس دن کا انتظار کرنے لگتا جس دن اس کے آبا و اجداد دوسری دنیا سے آکر اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

بوڑھا ہر صبح کو صحن میں آکے اونٹ کی کھال کے بستر کو سوکھنے کے لئے کھونٹی پر لٹکا دیتا اور دور، بہت دور ٹیلے پر نظریں جماکے کچھ سوچتا رہتا تھا...

سوچتا رہتا تھا وہ انسان آخر کیسے پیدا ہوا تھا جس سے اس جزیرے پر زندگی شروع ہوئی۔ قدرت نے آخر اسے کیسے بنایا تھا؟

قائپ کا خیال تھا کہ اس پہلے انسان کو طوفان نے جنم دیا تھا۔ یہ طوفان ٹیلے کے ایک غار میں چھپا ہوا تھا۔ ایک بار وہ غار سے باہر نکلا، ریت سے مل‌کے تازہ‌دم اور خوش‌لباس ہو گیا اور سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے اپنی تیزی و تندی سے سمندری پتھروں کو اکھاڑ پھینکا، چیلوں کو خوف‌زدہ کر دیا اور آخرکار تھکن سے چور ہوکے سمندر کے کنارے پہنچا اور وہیں ٹھہر گیا۔

اور پانی، ہوا اور سورج نے اسے مٹی کے کھمبے میں تبدیل کر دیا۔ اس کھمبے نے انسان کی شکل اختیار کرکے چیلوں کو متحیر کر دیا۔

یرملائی اپنے دوست کی ان باتوں پر معترض نہ ہوا۔ وہ قائپ کو یہ احساس نہیں دلانا چاھتا تھا کہ ان باتوں سے دلچسپی نہیں رکھتا ھے جو قائپ کی زندگی کے تجربات کی آئینہ‌دار تھیں۔ جزیرے کے دوسرے لوگوں کی طرح یرملائی خود بھی اپنے تجربات ھی کے سہارے زندگی بسر کر رھا تھا...

سمندر کا پانی ان کے جزیرے سے پھر پیچھے ھٹتا جا رھا تھا۔ یہ دیکھ‌کر لوگوں نے کہنا شروع کیا: مچھلیاں ھمارے ھاتھوں سے نکلی جا رھی ھیں۔ مدتوں قبل ان کے آبا و اجداد کو یہ دیکھنا پڑا تھا کہ صحرا نے دریا اور جنگل کو اپنے آپ میں جذب کر لیا۔ اب وہ سمندر کو پیچھے ھٹنے پر مجبور کر رھا تھا۔ قانون قدرت ھی یہی ھے کہ جو کمزور ھوتا ھے وہ مٹ جاتا ھے اور اپنی جگہ صحرا کے لئے خالی کر دیتا ھے...

## ۲

رات کو جب جزیرے کے لوگ مچھلی کے شکار کے منتظر تھے، قائپ نے خواب میں ایک چیل کو دیکھا۔ بوڑھا آھیں بھرتا ھوا جاگ اٹھا اور بستر پر بیٹھ‌کے خیالوں میں کھو گیا۔ اسے یقین ھو گیا کہ اس کی موت کا دن دور نہیں ھے۔ اسے معلوم تھا کہ خواب میں چیل کو دیکھنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

بوڑھا دنیا سے کوچ‌کر جانے کو تیار بھی تھا۔ جو کام اسے کرنے تھے وہ غالباً سب کے سب پورے ھو چکے تھے: سمندری پودوں سے گھر کی نئی چھت بنا لی تھی۔ اس گھر میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا اور بہو رھیں‌گے؛ جن لوگوں سے پہلے اس کے جھگڑے ھوئے تھے ان سے میل ھو چکا تھا: سارے قرضے بےباق کر چکا تھا؛ اتنا کم کھانا پینا سیکھ لیا تھا کہ جسم کو زیادہ بار نہ برداشت کرنے پڑے اور آخری کام کے طور پر بیٹے کو راضی کر لیا تھا کہ وہ آقچی میں کارخانے کی ملازمت چھوڑ‌کے جزیرے میں واپس آ جائے، بیوی کے ساتھ رھے اور قائپ کے بجائے گھر کی دیکھ بھال اور مچھلیوں کا شکار کرے۔

ایک دن قائپ اپنے دوست یرملائی کے ساتھ کھلے میدان میں بیٹھا ہوا تھا تو اس نے اسے ریت کے اس کھمبے کے متعلق بتایا۔

"دیکھو بھئی، وہ رہا انسان" قائپ نے ریت کے کھمبے کی طرف دیکھتے ہوئے آھستہ سے بوڑھوں کی سی بوکھلاھٹ کے ساتھ کہا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ کھمبا قریب آ جائےگا اور یرملائی اس میں انسان کے اداس چہرے کو دیکھ سکےگا۔

یرملائی نے بوڑھے دوست کی یہ باتیں سنیں تو کھمبے کے انسان کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثنا میں اس نے اچانک اس کھمبے کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھا اور یہ سوچ‌کے تیزی سے گھر کی طرف بھاگا کہ تیز ہوائیں چھت کو زمین پر ڈھیر کر دیں گی۔

لیکن قائپ طوفان کے باعث کھڑا نہ ہو سکا، زمین پر گر پڑا اور ریت اس کے منہ میں بھر گئی۔ خوش‌قسمتی سے اسی وقت کچھ لوگ وھاں پہنچ گئے اور انہوں نے ادھمرے بوڑھے کو ریت کے غار سے باھر نکال لیا۔ یہ وھی لوگ تھے جو قائپ کے ساتھ ایک ھی بستی میں رھتے تھے اور جن سے ملنے جلنے میں قائپ کو مدتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک بار قائپ کو کھال کے نیچے ایک سانپ دکھائی دیا جسے نکال‌کے اس نے باھر دھوپ میں پھینک دیا۔ شام کو اس نے پھر اس سانپ کو دیکھا جو تیز شعاعوں میں سوکھ‌کے لکڑی ھو گیا تھا۔ بوڑھے نے سانپ کی آنکھوں میں جھانکا تو دنگ رہ گیا: مردہ سانپ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک برقرار تھی۔

"دیکھو بھئی" قائپ نے یرملائی کے پاس جاکے اسے سانپ دکھاتے ہوئے کہا۔ "مر چکا ھے لیکن اس کی آنکھیں زندہ ھیں کیونکہ سانپ نہ اداس ھوتے ھیں، نہ حیران" یہ کہتے ہوئے اس نے ھاتھ سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تاکہ یرملائی دیکھ لے کہ سانپ کی آنکھوں میں قائپ کی آنکھوں کی جیسی چمک باقی ھے۔

قائپ سمجھتا تھا کہ سانپ پہلے درختوں کی جڑیں تھے۔ زمین کے اندر وہ ریت میں رھتے تھے جو ان کی زندگی کے لئے ھوا کی بہ‌نسبت زیادہ موزوں تھی۔ بعد میں اسی ریت سے جزیرے کا پہلا انسان پیدا ھوا۔

پاس ھے ھی نہیں۔ یرملائی اور دوسرے لوگ اسے اپنی کشتیاں دینے سے رھے کیونکه وه سب ساحل پر تمام کشتیوں کو یکجا کئے ہوئے مچھلی کا شکار شروع ھونے کے منتظر ھیں۔ چیرمین آرالوف نے خصوصی حکم کے بغیر نجی ضروریات کے لئے کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا ھے۔

بستی خالی پڑی ھے۔ جزیرے کے سب لوگ شکار شروع ھونے کے انتظار میں ساحل پر دوسری رات گزار رھے ھیں۔ بستی میں صرف بھیڑیں ادھر ادھر منڈلاتی اور گھروں کی ڈیوڑھیاں سونگھتی نظر آ رھی ھیں۔

بخارا سے آئے ھوئے جوتےساز بھی ساحل ھی پر سو رھے ھیں۔ انہوں نے خود کو بچھوؤں سے محفوظ رکھنے کے لئے اونی رسیاں ریت پر رکھ دی ھیں۔ انہیں آئے ھوئے ایک ھفته ھو رھا ھے لیکن اسی شکار کے باعث جزیره نہیں چھوڑ سکے۔ یه بخاراوالے کاروباری لوگ ٹھہرے۔ انہوں نے یہاں بھی کام تلاش ھی کر لیا اور گزشته روز تمام دن مچھیروں کے بال، مونچھیں اور داڑھیاں کاٹتے بناتے رھے۔

اوسیتیائی ولادیمیر شراب کی صراحی ھاتھ میں لئے ھوئے خوابیده جوتےسازوں کے درمیان احتیاط کے ساتھ چل رھا تھا۔ کل شام کو ان لوگوں نے اس کے گھر میں مےنوشی کی تھی اور اس کا خیال تھا که آج بھی کریں گے۔ جب اسے معلوم ھوا که بخاراوالے سب سو گئے تو وه اداس ھوکے اپنے پہریدار دوست کے ساتھ شراب پینے کے لئے گودی کی طرف چلا گیا۔

قائپ نے ایک ٹیلے پر پہنچ کے کپڑے اُتارے اور پانی میں اترنے سے قبل دوران خون تیز کرنے کے لئے بدن کو ریت سے رگڑنا شروع کر دیا۔

پھر پانی میں اترکے کوئی نصف گھنٹے تک تیرنے کا مقام تلاش کرتا رھا۔ یه جگه نه ملی تو کنارے کے قریب اتھلے پانی کے اندر ھی لیٹ گیا۔

پانی میں اترنے سے قبل اس نے جس جگه صاف کپڑے رکھے تھے وھاں اب اسے یرملائی کا بیٹا پروشکا دکھائی دیا۔ یه چوده ساله لڑکا اپنے چہرے سے بڑوں جیسا تھکامانده نظر آ رھا تھا اور بیٹھا ھوا قائپ کی طرف دیکھے جا رھا تھا۔

قائپ کو یہ ڈر ضرور تھا کہ وہ موت کے بعد نئی پریشانیوں سے دوچار ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری دنیا کا سفر آسان نہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو اچھے برے سبھی جاتے ہیں اور یہ دنیا قریب ہی کسی صحرا میں واقع ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نیا جنم ریت کی شکل میں ہو کیونکہ ریت لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

وہ سوچتا کہ شاید تیز ہوائیں اس ریت کو جزیرے میں پھیلاتی ہوئی سمندر تک پہنچا دیں اور یہاں اسے مچھلیاں کھا لیں۔ پھر وہ مچھلیوں کے پیٹ سے نکل کے کسی اجنبی ملک میں پہنچ جائے گا جہاں آرام و سکون کی تلاش میں دنیا کے خاتمے تک چکر لگاتا رہے گا لیکن اسے نہ کہیں آرام میسر ہوگا، نہ سکون۔

قائپ جانتا تھا کہ دوسری دنیا میں جانے کے لئے اس کے پاس وقت بہت ہی کم ہے اس لئے اس نے فوری طور پر زیلیونی جزیرے کو روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اسی جزیرے پر جنم لیا تھا لیکن عائشہ کو تکلیف پہنچانے کے خیال سے کسی زمانے میں وہاں سے چلا آیا تھا... یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ بوڑھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سوچنے لگا... عائشہ جب بھی یاد آتی، اسے زردآلو کی خوشبو محسوس ہونے لگتی۔ یہ خوشبو آخر کہاں سے آتی تھی؟ یہ ایک گرم دن کا واقعہ تھا۔ قائپ ساحل پر جھاڑیوں میں کھڑا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد مینڈک اچھل کود رہے تھے۔

حال ہی میں اس کی ملاقات اس جزیرے کے ایک مچھیرے سے ہوئی تھی جس نے بتایا تھا کہ عائشہ زندہ ہے۔ اکیلی رہتی ہے۔ پہلے کی طرح اب بھی سمندری پودے اکٹھا کرتی ہے اور مچھلیوں کو گرم ریت میں سکھاکے جزیرے میں آنے والوں کے ہاتھ فروخت کرتی ہے۔

اسی جزیرے میں جسے قائپ نے چھوڑ دیا تھا، اس کے والد اور دوسرے رشتےداروں کی قبریں ہیں۔ اب یہ لوگ اسے بلا رہے ہیں اور اس کے لئے وہاں جلد از جلد پہنچنا ضروری ہے۔

وہ جزیرہ دور نہیں ہے اور یہاں سے لوگوں کو کہرے میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

لیکن قائپ جانتا تھا کہ وہاں پہنچنا آسان نہ ہوگا۔

وہاں جانے کے لئے کشتی کی ضرورت ہے اور کشتی قائپ کے

کے ہم‌خاندان قاراقلپاق، تاجک، ازبیک اور یورال کے وہ کاسک شامل تھے جو سو سال قبل جزیرے میں آ بسے تھے۔

پہریداروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک موٹر بوٹ کو دیکھ‌کر یا فضا میں راکٹ سگنل کی آواز سن‌کر سب لوگوں کو بیدار کرکے شکار پر روانہ کر دیں۔

مچھیروں کو سیویرنی نامی جزیرے پر پہنچنا تھا جہاں چیرمین آرالوف ان کا انتظار کر رہے تھے۔ پڑوسی جزائر کے ماہی‌گیروں کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔

چیرمین آرالوف نے سگنل کے بغیر شکار شروع کرنے یا اجازت کے بغیر جزیرہ چھوڑنے‌والوں کو سخت سزا دینے کا اعلان کیا تھا۔

ماہی‌گیروں کو توقع تھی کہ مچھلیوں کا ایک بہت بڑا غول جزیرے کے پاس سے گزرکے دریا کے ڈیلٹے کی طرف روانہ ہوگا اور ڈیلٹے کے قریب اسے گھیرے میں لےکر مچھلیاں پکڑی جائیں‌گی۔

چند روز قبل دیا جانےوالا سگنل غلط ثابت ہوا تھا۔ لوگ کشتیاں لےکے ڈیلٹے تک گئے لیکن مچھلیوں کا غول دکھائی نہ دیا۔ اس نے یا تو اپنی منزل بدل دی تھی، یا پھر طیاروں سے دریا کا جائزہ لینےوالے ہواباز کسی دوسری چیز کو مچھلیوں کا غول سمجھ بیٹھے تھے۔

اب تمام لوگ زمین کی تنگ پٹی پر اکٹھا تھے۔ کھانا پکا رہے تھے، کھا رہے تھے اور محبت بھی کر رہے تھے۔ کل شام کو اسی پٹی پر بوڑھے قالی‌خان کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔

قائپ نے بید کی جھاڑیوں میں چھپ‌کر اپنی نگاہیں سوئے ہوئے لوگوں پر جما دیں۔ اسے بدمزاج، بوڑھا، اونگھتا ہوا پہریدار مسلمان‌بیک سلگی ہوئی مشعل کو الگ رکھتا دکھائی دیا۔ باقی لوگ نیم تاریکی میں ٹھیک سے نظر نہ آئے لیکن ان کے بیٹھنے کے انداز سے وہ سمجھ گیا کہ قاشچا، پلوان، وانکا بیزبارودی بھی موجود ہیں...

اچانک قائپ کو جانے کیوں وہ رات یاد آئی جب ٹیم لیڈر جانچ کے لئے آیا تھا اور ماہی‌گیروں کو سوتے دیکھ‌کر ان کا مذاق اڑانے کا فیصلہ کیا تھا – قائپ ہی کی طرح وہ بید کی جھاڑیوں میں چھپ گیا اور زور سے چیخ‌کے پکارا:

یرملائی نے اسے قائپ کی طبیعت کا حال معلوم کرنے کو بھیجا تھا اور کہا تھا کہ بوڑھے کی طبیعت خراب ہو تو اسے مچھلی کا تیل دے دینا۔ پروشکا نے دیکھا کہ قائپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو وہ ذرا دیر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا پھر پانی میں داخل ہو گیا۔ پروشکا کو اپنے پاس آتے دیکھکر بوڑھا ناراضی سے بڑبڑانے لگا - وہ کسی کو دیکھنا نہیں چاھتا تھا۔

"میرا پیچھا کر رہے ہو کیا تم؟" قائپ نے پانی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اباجان کے کہنے پر آپ کے لئے مچھلی کا تیل لایا ہوں۔"

"مجھے مچھلی کے تیل کی کیا ضرورت ہے؟ جاؤ، واپس جاؤ... نہیں، ٹھہرو۔ تم لنگرگاہ سے آ رہے ہو نا؟"

"جی ہاں، وہیں سے۔ وہاں ٹیم لیڈر آیا تھا۔ سب کو ڈانٹ پھٹکارکے واپس چلا گیا۔"

"سب کشتیاں بندھی ہوئی ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ اباجان پہرہ دے رہے ہیں... مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مچھلیاں پکڑنا چاھتے ہیں نا؟" پروشکا نے چالاکی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ دوسرے لوگ بھی تو پکڑتے ہی ہیں..."

یہ سن‌کے پروشکا نے منھ میں انگلی دبا لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قائپ مذاق کر رہا ہے یا سچ مچ چوری چھپے مچھلیاں پکڑنا چاھتا ہے۔ دراصل سبھی کو معلوم تھا کہ قائپ کبھی چراکے مچھلیاں نہیں پکڑتا حالانکہ اسے بھی ضرورت ہوتی ہے۔

"اچھا، تم اب واپس چلے جاؤ" قائپ نے اس انداز سے کہا کہ پروشکا نے محسوس کیا کہ وہ اسے ھمراز بنا رہا ہے۔ اب پروشکا کو پورا یقین ہو گیا کہ قائپ مچھلی پکڑےگا۔

پروشکا چلا گیا تو قائپ صاف کپڑے پہن‌کے لنگرگاہ کی طرف چل دیا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی راستے میں نہ ملے اور پریشان نہ کرے۔

رات ہونے کو تھی اس کے باوجود جزیرے کے بیسوں خاندان اپنے گھروں کو چھوڑے ہوئے ساحل پر اکٹھا تھے۔ ان میں قزاخ، ان

اسے کیا خبر تھی کہ اس کی آمد سے قبل پروشکا، یرملائی سے بات کر چکا ھے:

"سنیے ابا، قائپ چچا نے بھی چوری چھپے مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ کا یہ خیال غلط ثابت ھوا کہ وہ بڑے پارسا ھیں۔ وہ تو..."

"خاموش رھو! تم کچھ سمجھتے بھی ھو؟" یرملائی نے بیٹے کی بات کاٹ‌کر کہا تھا۔

قائپ جس وقت اپنے دوست کے پاس آ رھا تھا، اسی وقت یرملائی ریت پر بیٹھا قائپ کے بارے میں سوچ رھا تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کے خیالات اس کے ذھن میں منڈلا رھے تھے لیکن وہ خود کو قائپ کی مذمت پر آمادہ نہیں کر سکا تھا اور اداس ھوکے اونگھ گیا تھا۔

شاید قائپ کا مچھلیاں پکڑنے کو جی چاھتا ھے۔ رات ھوتے ھی مچھیرے، پہریداروں کے پاس آتے اور انہیں کشتیاں فراھم کرنے پر راضی کر لیتے ھیں۔ پہریدار یہ سوچ‌کے کہ آج تو شکار ھوگا نہیں، خود اپنے لئے خطرہ مول لےکر کشتیاں دے دیتے ھیں۔ بعد میں چوری سے پکڑی ھوئی مچھلیوں میں پہریداروں کو بھی حصہ ملتا ھے۔

"تم صبح تک کشتی واپس نہ کر سکوگے" یرملائی نے ذرا ٹھنڈے دل سے قائپ سے کہا۔

"صبح ھونے سے پہلے کشتی ضرور واپس آ جائےگی۔ گھبراؤ نہیں" قائپ نے اس اندیشے سے کہ یرملائی کشتی دینے سے انکار نہ کر دے، تیزی سے جواب دیا۔

"ھوشیار رھنا!" یرملائی نے کشتی دینے پر راضی ھوتے ھوئے کہا۔ اسے مایوسی ھوئی کہ دوست نے اسے ھمراز نہیں بنایا۔

وہ چھوٹی کھاڑی کی طرف چلے گئے۔ وھاں تک پہنچنے کے لئے انہیں دلدلی پودوں میں الجھتے ھوئے سے گزرنا پڑا۔ بید کی جھاڑیوں میں ٹھہری ھوئی بھاپ انہیں سانس نہیں لینے دے رھی تھی اور ان کے جسموں کو پیلے لسلسے پانی سے تر کئے دے رھی تھی۔

راستے میں انہیں کچھ لوگ ایک کشتی پر سوار ملے جو بید کی جھاڑیوں میں پھنس‌کے کنارے پر پہنچنے کا راستہ تلاش کر رھے تھے۔ یہ لوگ کچ کچ کرتے اور گالیاں بکتے ھوئے زور زور سے چپو

"ارے قاشچا!" قاشچا اچانک جاگ اٹھا اور اس کے ھاتھ سے گوشت کی وہ بوٹی زمین پر گر گئی جسے کھائے بغیر ھی سو گیا تھا۔ ٹیم لیڈر کی چیخ سے دوسرے لوگ بھی جاگ اٹھے اور قاشچا کی حالت دیکھکر قہقہے لگانے لگے۔ انہوں نے ڈھکیل ڈھکیل کے بوڑھے کو ریت پر گرانے کی کوشش کی اور وہ شرماتا ھوا مخالف سمت میں رینگتے رینگتے تاریکی میں غائب ھو گیا۔

بید کی جھاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے قائپ کو کشتیوں کی چرمراھٹ سنائی دے رھی تھی جن کے پہلوؤں سے لہریں ٹکرا ٹکراکے انہیں جھلا رھی تھیں۔ وہ کشتیوں کو نہیں دیکھ پا رھا تھا کیونکہ وہ جھاڑیوں کے پیچھے کھاڑی میں بندھی تھیں۔ اس کا دوست یرملائی پہرہ دے رھا تھا۔

قائپ دبے پاؤں پانی سے نکلا اور چپکے سے یرملائی کے قریب آکر زمین پر بیٹھ گیا۔

آھٹوں پر کان لگائے رکھنےوالا یرملائی فوراً ھی جاگ اٹھا اور اس کی نگاھیں قائپ کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے سوچا کہ بوڑھے کا چہرہ کچھ بدل سا گیا ھے: گہری جھریاں جن پر نمک کے نشانات پڑے تھے، کچھ ھموار ھو گئی تھیں۔ بغیر داڑھی کے رخساروں پر جن پر پہلے داڑھی نہیں تھی، کالے کالے بال نکل آئے تھے، آنسو بھری آنکھوں میں کمزوری کی پیلاھٹ کی جگہ التماس کی چمک نے لے لی تھی۔

"کیا ھوا، خیریت تو ھے؟" یرملائی نے پریشان ھوکے پوچھا۔

قائپ کی سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

"تم بیمار ھو گئے ھو کیا؟" یرملائی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"دراصل مجھے ایک کشتی کی ضرورت ھے۔ صبح ھونے سے پہلے ھی واپس کر دوں‌گا" قائپ ایک سانس میں کہہ گیا۔ اور دوسرے ھی لمحے اسے سخت حیرت ھوئی۔ حیرت کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ جھوٹ بولا حالانکہ وہ اس کا عادی نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ یرملائی نے کچھ پوچھے گچھے بغیر ھی اثبات میں سر ھلا دیا۔

جزیرے پر جسے قائپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا تھا، مشعل کی ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی جیسے وہ قائپ کو آخری سلامی دے رہی ہو۔

کچھ دیر بعد قائپ کو کئی مشعلوں کی چمکتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ روشنیاں لائٹ ہاؤس کی روشنی سے ہمکنار ہونا چاہتی ہوں۔

قائپ نے اپنے خیالات کے ہجوم سے پیچھا چھڑاکے ارد گرد نظر دوڑائی تو اسے یرملائی کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس نے پانی کی چھپا چھپ سے اندازہ لگایا کہ یرملائی صحیح سلامت کنارے پر پہنچ گیا ہے۔

## ۳

قائپ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ماضی کو یاد کرتا یا مستقبل کا خیال کرتا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔

اس کی کشتی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ سمندر کے ایک ایک پتھر، ایک ایک چٹان اور ایک ایک لہر سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ کچھ دیر بعد کشتی اس آبی پٹی میں داخل ہوگی جو جزیرے کو سمندر سے الگ کرتی ہے۔ پھر اس آدھی ٹوٹی ہوئی چٹان کے قریب سے گزرےگی جس پر شکستہ لائٹ ہاؤس کھڑا ہے۔ اس کے بعد کشتی ایک دریا کے بھاؤ پر چلےگی۔

ویسے تو یہ بڑا سست‌رفتار دریا ہے لیکن سمندر میں گرتے وقت اس میں بلا کی تیزی و تندی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کشتی کو اپنی گرفت میں لےکے چکر دے دیتا ہے۔ اس موقعے پر پل بھر کے لئے چپو ہاتھوں سے چھوٹ جائیں تو کشتی تین چار چکر کھانے کے بعد الٹ جاتی ہے اور ماہی‌گیر سمندر میں گر پڑتا ہے۔ کشتی سے گرنےوالے لکڑی کے کندے اور ٹیڑھے میڑھے ہو جانےوالے ڈبے اس کے سر پر ضرب لگانے لگتے ہیں۔ اس تیز بھاؤ میں پہنچتے ہی مچھیرے کو شجاعت اور چابک‌دستی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور

چلا رہے تھے لیکن راستہ تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ان کی کشتی کنارے سے دور ہوکر گھنی جھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔

قائپ پانی میں چھپ گیا اور یرملائی کشتی کے پاس جاکے لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔

وہ ایک پڑوسی جزیرے کے ماہی‌گیر تھے اور جزیرہ پسچانی کے لوگوں کی طرح وہ بھی شکار شروع ہونے کے انتظار میں رات گزار رہے تھے۔ نصف شب کو سگنل سن‌کے پسچانی کی طرف روانہ ہو گئے تھے کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ مچھلیوں کا غول انڈے دینے کے لئے اسی جزیرے کی طرف گیا ہے۔

یرملائی نے انہیں بتایا کہ شکار شروع ہونے کا سگنل ابھی نہیں دیا گیا ہے۔ یہ سن‌کے مچھیرے خوش ہو گئے اور اپنی کشتی کا رخ موڑکے اپنے جزیرے کی طرف چل دئے۔

کچھ دیر تک یرملائی اور قائپ کو ان لوگوں کی آوازیں اور چپوؤں کی چھپ چھپ سنائی دیتی رہی۔ یہ مچھیرے کافی دور نکل گئے تو ان میں سے کسی نے کوئی گیت چھیڑا لیکن سمندر نے گیت کی آواز کو اتنا بگاڑ دیا کہ معلوم ہوتا تھا یہ انسان کی نہیں، کسی بھٹکی ہوئی چڑیا کی آواز ہے۔ کچھ دیر بعد یہ ساری آوازیں بالکل ہی مدھم پڑ گئیں۔

آخرکار یرملائی اور قائپ کھاڑی پر پہنچ گئے۔ یرملائی کے دل میں یہ خواہش کروٹیں لینے لگی کہ قائپ کے ساتھ ریت پر بیٹھ‌کے سگریٹ سلگائی جائے اور باتیں کی جائیں لیکن قائپ کو جانے کی جلدی تھی۔ اس نے ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کیا جس پر نئے دن کی علامات دھیرے دھیرے نمودار ہو رہی تھیں – نیا دن جو قائپ کے لئے جانے کیسا ثابت ہو۔

یرملائی نے ایک بڑی سی کشتی منتخب کرکے اس کی زنجیر کھولی اور اسے پانی میں اتار دیا۔ قائپ نے کشتی پر سوار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے چکنی مٹی پر پیر رکھا اور پھسل‌کے گر پڑا۔ اس کی ٹھوڑی میں چوٹ تو لگی لیکن درد کا احساس نہ ہوا۔

آخر اس نے کشتی پر سوار ہوکے اپنی جگہ سنبھال لی۔

یرملائی کشتی کے قریب ہی تیرتے ہوئے اسے ڈھکیل‌کے آگے بڑھا رہا تھا۔

اچانک قائپ کو اپنے والد اسحاق کا خیال آیا۔
"انھوں نے مجھے پیدا کیا۔ میری پرورش کی تاکہ دنیا کو دیکھ سکوں۔اب وہ چاھتے ھیں کہ ان کے پاس واپس چلا جاؤں۔ اسی طرح میں بھی اپنے بیٹے کو بلا لوں گا۔ دوسری دنیا میں شاید ھم سب ایک خاندان کی شکل میں رھیں گے۔"
قائپ کی نگاھوں میں بچپن کی وہ تصویریں پھر گئیں جنھیں اس نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا تھا۔
"اس سال طوفانوں کے باعث سمندر میں مچھلیاں نہیں تھیں" بوڑھا یاد کرنے لگا۔ "اب تو خیر، سمندر بہت بدل چکا ھے۔ شاید بہت زیادہ تھک چکا ھے جبھی تو اسے قدیم زمانے کا جیسا غصہ نہیں آتا۔ اب تو وہ ساحل پر حملہ کرکے پتھروں اور سیپیوں کو سمیٹتا اور فوراً ھی واپس چلا جاتا ھے... اب تو سمندر خاصا فیاض ھو گیا ھے لیکن اس سال اسے لوگوں کی لاشوں کی ضرورت تھی...
میرے والد مٹی کے کوزے بناتے تھے لیکن انھیں کوئی خریدتا نہیں تھا اس لئے وہ انھیں سمندر میں پھینک دیا کرتے تھے۔ وہ بڑی اداسی کے ساتھ مذاق اڑاتے ھوئے کہا کرتے تھے: "نبی سلیمان میرے کوزوں میں جنوں کو بند کرکے رکھیں گے..."
والد اپنے لئے نیا مکان بناکے اس میں اکیلے رھنے لگے۔ میں والدہ کے ساتھ پرانے مکان ھی میں رھتا تھا۔ والد کی محبت سے محرومی کے بعد والدہ پاگل سی ھوکے رہ گئی تھیں لیکن والد ان کے ساتھ نہیں رھنا چاھتے تھے۔ عورت کے جسم میں، مرد کے جسم کے برعکس، بڑھاپے میں بھی زندگی اور محبت کا رس باقی رھتا ھے۔ والدہ ستر سال کی عمر میں بھی بالکل لڑکیوں کی طرح پاگل ھوئی جا رھی تھیں۔
ایک بار والدہ کو علی الصباح خواب میں چیل نظر آئی۔ اس روز میں اور والدہ صحن میں کام کر رھے تھے۔ والد کوٹھری سے نکل کے دوسری طرف جانے لگے۔ والدہ نے سوچا کہ وہ جلانے کی لکڑیاں لانے جا رھے ھیں۔ کہنے لگیں اپنے ابا کو رسی لے جاکے دے دو۔ بیوی کو شوھر کے ارادوں کا کہاں علم ھوتا ھے۔ وہ کہاں جانتی ھے کہ شوھر گھر سے باھر کیوں جا رھا ھے۔ شوھر بھی اس

صرف اسی صورت میں وہ کشتی کو بھی بچا سکتا ھے، اپنی جان کو بھی۔ اس کے بعد دوسرے دھاروں کی لہریں کشتی کو جھلاتی ھوئی زیلیونی جزیرے تک لے جاتی ھیں مگر زیلیونی کے ساحل کے قریب مچھیرے کو کچھ اور بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ھے۔

قائپ کو بتایا گیا تھا کہ جوار بھاٹا کے دوران کشتی دریا کے کنارے تک نہیں پہنچ سکتی۔ موجیں کشتی کو اچھالتی ھوئی کنارے کی طرف ڈھکیل لے جاتی ھیں لیکن اچانک کشتی کھینے کا امکان ختم ھو جاتا ھے اور وہ انتہائی تیزی سے جزیرے کے گرد چکر کھانے لگتی ھے۔ ایسا لگتا ھے جیسے کوئی چیز کشتی کو اپنی طرف کھینچ رھی ھو، اسے اس وقت تک کنارے سے نہ لگنے دینا چاھتی ھو جب تک جوار بھاٹا ختم نہ ھو جائے۔

کشتی جزیرے کے کنارے سے دکھائی دیتی ھے اور اسے رسیوں سے کھینچ کے کنارے لگایا جا سکتا ھے لیکن کنارے پر عموماً مقامی اسپتال میں زیر علاج مریض ھی بیٹھے رھتے ھیں۔ یہ بےچارے خود تو مچھیرے کی مدد نہیں کر سکتے لیکن پاس پڑوس میں تندرست آدمی گھوم پھر رھے ھوں تو مدد کے لئے ان کو بلاکر اس کی جان ضرور بچا سکتے ھیں۔

خوش‌قسمتی سے ایسے دن زیادہ نہیں ھوتے جب دریا کا بہاؤ اتنا بھیانک ھو۔ دوسرے دنوں میں دریا پرسکون رھتا ھے اور کشتیاں بہ آسانی زیلیونی جزیرے تک پہنچ جاتی ھیں۔

قائپ کی کشتی دو بار تیز چکر کھانے کے بعد دریا کے اس حصے میں داخل ھو گئی جہاں اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں پیدا ھو سکتا تھا۔ اب اس نے چپو پانی سے نکال لئے اور گھری سانس لےکے کشتی میں لیٹ گیا - وہ بخار میں مبتلا ھو چکا تھا۔ قائپ نے سوچا کہ دریا کے بہاؤ سے لڑتے لڑتے وہ اپنے جسم کی بچی کھچی قوت سے بھی محروم ھو چکا ھے اور وقت سے پہلے ھی موت اسے اپنی آغوش میں لے لےگی۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاھتا تھا۔ ابھی تو اسے اپنے آپ سے، اس دریا سے جس پر اس کی زندگی بسر ھو رھی تھی، اور مچھلیوں اور بحری پرندوں سے ضروری باتیں کرنی تھیں۔

"میں ڈر گیا" قائپ نے مزید سوچا۔ "والد کے پاس پہنچا لیکن وہ اس طرف دیکھ رہے تھے جس طرف خرگوش بھاگا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ نیم‌مردہ سے ہو گئے ہوں۔ پھر وہ اپنے جسم کی بچی کھچی آخری قوت کا سہارا لےکر کھڑے ہو گئے۔ والد اس حقیقت سے ناواقف معلوم ہو رہے تھے کہ اچھے کام صرف زندہ انسان کر سکتا ہے، مردہ انسان تو ہر کام کو خراب کر دیتا ہے۔

والد کھڑے ہوکر جھاڑیوں کو ٹھیک کرتے اور جانوروں کو آزادی دیتے ہوئے صحرا کے اندر قدم بڑھانے لگے۔ ان کے اندر زندگی کی جتنی حرارت باقی تھی اسے بھی لو جیسی گرم ہوائیں اپنے ساتھ لے گئیں...

ان کی حالت دیکھکر میں رونے لگا اور لوگوں کو بلانے کے لئے بستی کی طرف بھاگا۔ ہم لوگ واپس آئے تو والد ہمیں ریت پر پڑے نظر آئے۔ ان کے اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ یہ وہ چیلیں تھیں جو قانون فطرت کے بموجب ان کی لاش کو کھانے کے لئے آئی تھیں..."

قائپ نے پریشان ہوکے بمشکل کشتی کے کنارے کو ھاتھ سے پکڑا اور اٹھکے بیٹھ گیا۔ اسے زیلیونی جزیرہ کہرے میں لپٹا ہوا کسی سیاہ چٹان جیسا نظر آیا۔

یہ قائپ کا آبائی جزیرہ تھا!

اس جزیرے پر پتھروں اور ٹیلوں کے درمیان درخت کھڑے ہیں۔ ان کے گھیرے میں ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ اس جزیرے کی ہریالی کو دیکھکر لوگ بےحد متاثر ہوتے اور اسے ایک معجزہ تصور کرتے ہیں، ایک ایسی جگہ جہاں طویل سفر اور تھکن کے بعد آرام میسر ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی اتفاق نہیں کہ اس جزیرے پر ایک بڑا اسپتال واقع ہے جہاں تمام جزائر کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔

اس جزیرے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس پر لوگوں اور کسی آھنی آلے کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں جیسے قریب ہی کہیں پتھر کی چکی کام کر رہی ہو۔ تو یہ آوازوں کا جزیرہ بھی ہے...

اب اس کے ساحل کا کیا حال ہے؟ قائپ کا آبائی جزیرہ اس کے لئے اپنے دروازے کھولےگا کہ نہیں؟ اس کی کشتی کو ساحل

بات سے بےخبر رھتا ھے که اس کی بیوی کب اس دنیا سے کوچ کر جائے گی۔ مجھے بھی اپنی بیوی کے ارادوں کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مرتے وقت کسی کو تکلیف نہیں دی - سوتے میں موت آئی اور وہ اس کے ساتھ دوسری دنیا کو چلی گئیں۔ دوسری دنیا میں مردوں کو بلانےوالا شاید بوڑھی عورتوں کو نہیں بلاتا۔ مرد دوسرا جنم لیں گے تو بےجسم اور لاجنس ھوں گے اور اکیلے زندگی بسر کریں گے...

والد خشک دریا کی ته پر چل رھے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے نمک سے چرمراھٹ پیدا ھو رھی تھی۔ مجھے یه دیکھ‌کے سخت حیرت ھوئی که وہ اتنی زیادہ احتیاط کے ساتھ چل رھے ھیں۔ جیسے ڈر رھے ھوں که چھوٹے چھوٹے بھونروں پر پاؤں رکھ دیں گے جو غضبناک ھوکر ان کے پتلون سے لپٹ جائیں گے، ان کے پیروں میں کاٹ کھائیں گے...

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس جگه پر پہنچ گئے جہاں انہوں نے ایک پھندا چھپا رکھا تھا۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک‌کے پھندے سے نیم‌مردہ خرگوش کو باھر نکالا۔ میں نے سوچا که اب وہ خرگوش کی گردن مروڑکے اسے بغل میں دبا لیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا نه کیا۔ انہوں نے تو اپنی قمیض کی پٹیاں پھاڑکے خرگوش کے زخمی پنجوں پر لپیٹ دیں اور دوسرے زخموں پر سکساؤل پودے کی جڑ رکھ دی۔ اس کے بعد خرگوش کے منه میں اپنی زبان ڈال‌کے اس کے حلق میں پانی پہنچایا... خرگوش کو نئی زندگی مل گئی اور مڑ مڑکے دیکھتے صحرا میں بھاگ گیا...

مجھے معلوم تھا که والد نے بھی دوسرے چرواھوں، شکاریوں اور ماھی‌گیروں ھی کی جیسی زندگی گزاری ھے۔ انہوں نے بھی اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے بہت سے جانوروں کو ھلاک کیا ھے، بہت سی گھاس اور جھاڑیوں کو اکھاڑکے ایندھن بنایا ھے اور بہت زیادہ مچھلیاں پکڑی ھیں۔ اب جبکه ان کے دوسری دنیا کو جانے کا وقت آ گیا تھا، وہ اپنے گناھوں کا کفارہ ادا کرنا چاھتے تھے۔ وہ فطرت کی بحالی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے جو زندہ لوگ کبھی نہیں کرتے۔ انہوں نے یه ارادہ اس لئے کیا تھا که وہ خود کو دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ محسوس کرتے تھے...“

قائپ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ اسی وقت کشتی ایک بار پھر ڈگمگائی اور بوڑھا گر پڑا۔ کسی نے کشتی پر رسی پھینک دی اور تحکمانہ انداز میں کہا:

"باندھ دو!"

قائپ نے رسی تھام لی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس چیز کو باندھ دے۔ وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ قصہ کیا ہے اور اسے اب کیا کرنا چاہئے کہ آواز دینےوالا شخص ناراض نہ ہو۔

صاف ظاہر تھا کہ اس آدمی کو قائپ کی ذہنی حالت کا اندازہ ہو گیا کیونکہ اس نے گالی دیتے ہوئے کہا:

"جلدی کیوں نہیں کر رہے ہو تم؟ جلدی کرو، جلدی! اب آگے بڑھو... سنو، رسی کو ھاتھ سے نہ جانے دینا! کشتی کی نوک کی طرف بڑھو۔ یہ تم کدھر بڑھ رہے ہو؟ اچھا، اب باندھو! یہ باندھ کس طرح رہے ہو؟ گرہ لگاؤ۔ سنا تم نے، گرہ لگاؤ!"

کشتی کی نوک سے بندھی ہوئی رسی تن گئی۔ کشتی کے باھر پھر سیٹی بجی اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

قائپ نے سوچا کہ اس کی جان بچ گئی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ زیلیونی جزیرے کے کچھ لوگ اسے دیکھکے مدد کے لئے آ گئے ھیں۔ شاید جہازرانی کے ماھر لوگ ھیں جو کشتی کے بہہ جانے کا خطرہ پیدا ہوتے ہی اسے بچا لینے میں مہارت رکھتے ھیں۔

قائپ نے اس خیال سے کہ دوسرے لوگ اسے بچانے کے کوشاں ھیں تو خود اس کا کشتی میں بیکار لیٹے رھنا کوئی معنی نہیں رکھتا، ان کی مدد کے لئے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ابھرتی ہوئی لہریں اسے اٹھنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ان کے جھٹکے سے بار بار پیٹھ کے بل گر پڑتا تھا۔

وہ صرف اتنا دیکھ سکا کہ اس کی کشتی کو کوئی موٹربوٹ گھسیٹے لئے جا رہی ہے اور یہ موٹربوٹ خالی ہے۔

تو وہ لوگ جن کی آوازیں ذرا دیر قبل اسے سنائی دی تھیں، آخر کہاں گئے؟ کیا کشتی کو موٹربوٹ میں باندھکے پانی میں اتر گئے ھیں اور اب کشتی کے پیچھے پیچھے تیرتے ہوئے آ رہے ھیں؟ شاید انہوں نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ موٹربوٹ کی تیزرفتاری

سے لگنے دے گا کہ نہیں؟ قائپ نے سوچا کہ آبائی جزیرے پر پہنچے بغیر ھی دنیا سے اٹھ جانا بہت باعث ذلت ھوگا۔

اس خیال کے دل میں آتے ھی قائپ نے چپوؤں کو پانی میں ڈال کے ساحل تک پہنچنے میں کشتی کی مدد کرنا شروع کر دیا لیکن کشتی پر الٹا اثر ھوا اور وہ مخالف سمت میں چلنے لگی جیسے انجانے راستے پر کسی انسان کا سہارا نہ لینا چاھتی ھو۔

قائپ کو بےحد تھکن محسوس ھوئی اور اس نے اپنی کوششیں ترک کرکے کشتی میں لیٹ جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ ھونا ھے وہ تو بہرحال ھوکر رھےگا۔

وہ آنکھیں بند کئے دیر تک لیٹا رھا۔ آخر جب اس کے چہروں پر لہروں کے چھینٹے پڑنے لگے تو اسے اندازہ ھوا کہ بہاؤ کا رخ بدل رھا ھے...

"مجھے اس عورت سے ضرور ملاقات کرنی چاھئے" اس نے سوچا۔ "ساحل پر پہنچ کے میں اسے دیکھوں گا... اب تو بہت بوڑھی ھو گئی ھوگی۔ اس مچھیرے نے بتایا تھا کہ وہ اسپتال کے قریب دھوئیں میں تیار کی ھوئی مچھلیاں فروخت کرتی ھے۔ میں وھاں جاؤں گا اور وہ مجھے ضرور ملےگی... اچھا ھی ھوا کہ میرا بیٹا واپس آ گیا اور اب اپنی بیوی کے ساتھ ایک ھی کوٹھری میں رھتا ھے۔ میں نے اسے نہ بلا لیا ھوتا تو وہ اب تک اسی جزیرے پر مقیم ھوتا۔ بڑھاپے میں کیا میں نیک آدمی بن سکا ھوں؟ ھاں، ھم زندگی کے آخری ایام میں پریشانیوں سے تھک کے نیک بن جاتے ھیں لیکن بہت تاخیر کے بعد... اور جو لوگ پہلے کبھی بدمعاش تھے انہیں زندگی کے آخری لمحات میں دکھ ھوتا ھے کیا؟ اور جن لوگوں کے ضمیر ھوتا ھی نہیں، وہ کیا محسوس کرتے ھیں؟ وہ کس طرح دوسری دنیا میں جاتے ھیں؟ کیا لوگوں کو ڈر نہیں ھوتا کہ دوسری دنیا میں انہیں جواب دینا پڑےگا؟.."

اچانک قائپ کو کچھ شور غل سنائی دیا۔ کشتی ڈگمگاکے دوسری سمت چلنے لگی اور کسی نے زور سے پکارا:

"ٹھہر جاؤ، ورنہ گولی چلا دوں گا!" بوڑھے کو کشتی کے بغلی حصۂ کے عقب میں کوئی لمبی سیاہ چیز چٹان کی طرح نظر آئی۔

تقریباً دوگنا لمبا، اور کچھ اس انداز سے چوکس کہ قائپ نے بھاگنے کی کوشش کی تو فوراً گولی مار دےگا۔

"ارے سنو، کنارے پر آ جاؤ۔ بھاگنے کی ھمت نہ کرنا۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچےگا۔"

پو پھٹ چکی تھی۔

قائپ نے کشتی سے نکل‌کے جنریرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ جاننا چاھتا تھا کہ آخر اسے کہاں لایا گیا ھے۔ اسے ایک بہت ھی چھوٹا، بس کوئی پچاس قدم ھی لمبا خالی جزیرہ نظر آیا۔ ایک لائٹ ھاؤس اور ٹیلے کے نزدیک ایک سفید مکان کے سوا یہاں اور کچھ بھی تو نہ تھا۔ بوڑھے نے اس پر نگاہ دوڑاتے ھی اسے پہچان لیا۔

ایک آدمی جس سے پہلے کبھی قائپ کی ملاقات نہیں ھوئی تھی، کودکے اس کی کشتی میں داخل ھوا، چپوؤں کو نکال‌کے الگ پھینکا اور کچھ تلاش کرنے لگا۔

"ارے، وہ ھیں کہاں؟ پانی میں پھینک دیں نا؟" اس نے قائپ سے دریافت کیا۔

قائپ کی سمجھ ھی میں نہ آیا کہ وہ کیا دریافت کر رھا ھے۔ اس کو تو نہ اس آدمی میں کوئی دلچسپی تھی، نہ ھی جزیرے کی کسی چیز میں۔

آخرکار وہ آدمی جس کا نام علی‌بابا تھا، پرمسرت انداز میں بول اٹھا: "ارے، یہ رھی۔ مجھے مل ھی گئی!" اور اس نے کشتی سے ایک چھوٹی سی مری ھوئی مچھلی اٹھاکے قائپ کو دکھائی تاکہ کوئی شک نہ باقی رہ جائے کہ سچ مچ مچھلی ھی ھے۔ اس کے بعد اس نے اسے بڑی احتیاط سے ناک پونچھنے کے رومال میں رکھ‌کے چھپا لیا جیسے یہ مچھلی نہیں کوئی طلائی سکہ ھو جو سمندر میں اچانک اس کے ھاتھ لگ گیا ھو۔

"ھے تو یہ بہت ھی چھوٹی سی مچھلی لیکن اسی کی وجہ سے تمہیں دو سال کی سزا بھگتنی پڑےگی!"

قائپ کو پانی میں کھڑے رھنا اچھا نہ لگا اور وہ اجنبی کی بات ختم ھونے سے قبل ھی کنارے کی طرف چلا گیا۔

"ارے، تم کہاں چل دئے؟" علی‌بابا نے اس کے پیچھے لپکتے

کے باعث وہ کشتی سے باھر آ سکتا ھے۔ اب اگر وہ پانی میں گر پڑا تو یہ لوگ اسے ڈوبنے تو بہرحال نہ دیں گے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ لوگ اس کی کشتی کو پکڑنے میں عجلت کیوں نہیں برت رھے تھے؟ بوڑھے کا سر بار بار کشتی کے کناروں سے ٹکراتا رھا اور اسے ایسا لگا کہ وہ بےھوش ھو رھا ھے۔ پھر بھی اسے زندہ بچ جانے کی امید تھی۔ وہ مایوس نہیں ھونا چاھتا تھا۔

اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ نہ ھوا ھوتا تو وہ اب تک زیلیونی جزیرے پر پہنچ بھی چکا ھوتا۔

لیکن موٹربوٹ کو کیا ھو گیا؟ کیا بڑی موٹر بوٹیں بھی مدوجزر کے وقت کنارے تک نہیں پہنچ سکتیں؟ کیا ان لوگوں نے اسی وجہ سے موٹربوٹ کو چھوڑ دیا ھے؟ کیا بوٹ کا کیپٹن بےسہارا ھوکر تن تنہا مدوجزر کا مقابلہ کر رھا ھے؟

ان خیالات کے دل میں آتے ھی قائپ نے کیپٹن کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنا سر نہ خم کرےگا۔ مرےگا تو صرف اسی صورت میں جب بچنے کی کوئی صورت نہ رہ جائے گی...

## ۴

قائپ انہی خیالات میں کھویا ھوا کشتی میں لیٹا رھا اور موٹربوٹ صحیح سلامت ایک گمنام جزیرے میں پہنچ گئی جو ماھی‌گیروں کے حلقوں میں «کے-۳۴» کے نام سے مشہور تھا۔ گودی کے قریب پہنچ کے موٹر بوٹ رکی اور دوسرے لمحے قائپ کی کشتی بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔

"باھر نکل آؤ!" بوڑھے کو موٹربوٹ سے حکم دیا گیا۔

اس آواز کو سن کے قائپ کھڑا ھو گیا۔ اس کا سر اب بھی چکرائے جا رھا تھا۔

اس کو حکم دینےوالا بندوق لئے پانی میں کھڑا تھا۔ قائپ سے

علی بابا نے مچھلی‌والا رومال جیب سے نکال‌کے میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے قائپ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا:

"کہو، تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟"

اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس بوڑھے کو کبھی پہلے بھی گرفتار کرنا پڑا تھا کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور آخر اسے یقین ہو گیا کہ بوڑھا کبھی پہلے اسے نہیں ملا تھا۔

وہ اس خیال سے مشتعل ہو گیا کہ بوڑھا اب تک سزا کے بغیر چوری چھپے مچھلیاں پکڑتا رہا ہے اسی لئے خوف‌زدہ نہیں ہے اور علی‌بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال‌کے اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے خود کو اس سے برتر تصور کرتا ہو۔

علی بابا نے فیصلہ کیا کہ وہ بوڑھے کے ماضی کے جرائم کو معاف نہ کرے‌گا اور اسے ساری باتوں کے لئے جوابدہ ہونا پڑے‌گا۔

"تمہی جیسے لوگوں نے تو سمندر کو بازار بناکے خالی کر دیا!" اس نے قائپ سے کہا۔ "آخر ہماری مشہور مچھلیاں بریم، کارپ اور گل مچھوں‌والی مچھلیاں کہاں غائب ہو گئیں؟"

قائپ کھڑے کھڑے کھڑکی سے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں علی‌بابا کی باتیں نہ سننے کی سکت تھی نہ سمجھنے کی۔ کچھ اس کی سمجھ میں آیا بھی تو اس خیال سے خوف‌زدہ نہ ہوا کہ علی‌بابا اسے چور سمجھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں چور تھوڑی ہوں۔ یہ اجنبی جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق تھوڑی ہے۔

"آخر کون سے جزیرے سے آئے ہو تم؟" علی‌بابا نے پوچھا۔

قائپ نے جزیرے کا نام بتایا تو اس نے ریڈیو پر پسچانی جزیرے سے روابط قائم کرکے مچھیروں کی ٹیم کے لیڈر سے بات‌چیت شروع کر دی:

"سنو بھئی، میں نے تمہارے ایک آدمی کو پکڑ لیا ہے۔ اسے آقچی پہنچانے‌والا ہوں۔ دوسرے مچھیروں کو تنبیہ کر دو کہ وہ چوری چھپے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش نہ کریں۔ سمجھ گئے نا؟"

قائپ کا حال سن‌کے ٹیم لیڈر نیپیس نے گالی دی لیکن بوڑھا سمجھ نہ سکا کہ نیپیس نے کس کو گالی دی ہے حالانکہ وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا کیونکہ یہ آواز پسچانی سے آ رہی تھی۔

ھوئے کہا۔ "تمہیں جانے کی اجازت کس نے دی؟ ٹھہر جاؤ! پہلے اجازت لو تب آگے بڑھو!"

قائپ اس کی باتوں کو نظرانداز کرتا ھوا کنارے پر پہنچ گیا۔ علی بابا نے اسے کنارے پر کھڑے دیکھ‌کر سوچا کہ پانی میں واپس بلانے کی ضرورت نہیں۔

اس نے خود کنارے پر پہنچ‌کے آگے بڑھنا شروع کیا اور قائپ کو حکم دیا:

"آؤ، میرے ساتھ چلو۔ یہاں بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ھے۔ سمندر میں کودوگے تو موت سے بچنے کا کوئی سوال ھی نہیں۔ اب تمہارے لئے دو ھی راستے کھلے ھیں: موت یا دو سال کی قید! بولو، کون سا راستہ اختیار کرنا پسند کروگے؟"

قائپ سمجھ گیا کہ وہ سمندر اور مچھلیوں کا نگراں ھے۔ اس کے بعد اس نے علی بابا کے سوالات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"یہ تم خاموش کیوں ھو؟" علی بابا نے غصے میں پوچھا۔ "خیر، کوئی بات نہیں۔ ضرورت پڑےگی تو بولنے لگوگے۔"

قائپ نے صرف ایک سکنڈ کے لئے اس شخص کی طرف دلچسپی کے ساتھ دیکھا پھر یہ سوچتے ھوئے کہ یہ مغرور اور بےوقوف آدمی ھے، اسے دوبارہ نظرانداز کرنے لگا۔

سفید مکان کے دروازے کے اترنگ میں مردہ عقاب لٹکا ھوا تھا۔ علی‌بابا کے دروازہ کھولتے ھی عقاب ھلنے لگا اور اس کا ایک پر نیچے گر پڑا۔

مکان ایک ھی کمرے پر مشتمل تھا جس میں ایک میز پر ریڈیو ٹرانسمیٹر رکھا ھوا تھا۔ کمرے کی چاروں کھڑکیوں پر سمندر کی نگرانی کرنے کے آلات رکھے تھے اور بحری طوفانوں کے دوران علی‌بابا کمرے سے باھر نکلے بغیر سمندر کی نگرانی کر سکتا تھا۔

"یہ ھے میرا قلعہ" علی بابا نے میز کے پاس بیٹھتے ھوئے اس لہجے میں کہا جیسے اسے بوڑھے کے آنے سے خوشی ھوئی ھے کہ اب وہ اکیلا نہیں رھےگا۔

قائپ نے جواب میں سر ھلایا جیسے اسے علی‌بابا کا یہ کمرہ اچھا لگا ھو۔

بھی ممکن ھے۔ وہ ساحلی میلیشیاوالے کو جزیرے ھی پر بلا لے۔ لیکن وہ یہ تدبیر نہیں اختیار کر سکتا کیونکہ بوڑھا قاتل تو ھے نہیں اور میلیشیاوالے جزیرے میں آنے میں جلدی کرنے سے رھے۔ بوڑھے کو یہاں سے لے جانے کے لئے ھو سکتا ھے کہ وہ تین چار دن بعد آئیں۔

علی‌بابا نے سوچا کہ اس وقت ان جزائر کے تمام لوگوں کو صرف شکار کی فکر ھے اور اسے کامیاب بنانے کے لئے قانون‌شکنی پر بھی آمادہ ھیں۔ آقچی کے کارخانے مچھلی کے بغیر ظاھر ھے کہ کام نہ کر سکیں‌گے...

یہ سب سوچ‌کے علی‌بابا نے پسچانی سے دوبارہ ریڈیو کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔

"اچھا یہ بتاؤ، مچھلیوں کی کیا خبر ھے؟ ان کا غول آخر آئے‌گا بھی کہ نہیں؟"

"ھوابازوں کا کہنا ھے کہ اب آنے ھی والا ھے..." نیپیس کا جواب ملا۔

"کس مچھلی کا غول ھے؟ بریم کا؟"

"کون کہہ سکتا ھے؟ اگر صرف بریم ھی ھوئیں تو قیمتی مچھلیاں پکڑنے کا منصوبہ پورا ھو جائے‌گا۔"

"بریم ملیں‌گی، ضرور ملیں‌گی" علی‌بابا نے یقین کے ساتھ کہا۔

"خدا کرے ایسا ھی ھو۔ بریم ھاتھ لگیں تو دو تین تم کو بھی بھیج دوں‌گا" یہ کہہ‌کے نیپیس نے علی‌بابا سے پوچھا: "جس آدمی کو تم نے گرفتار کیا ھے اس کا نام کیا ھے؟"

قائپ نے اپنا نام بتایا۔

"قائپ ھے اس کا نام۔ تم اس کو جانتے ھو؟"

ریڈیو پر ایک بار پھر گالی سنائی دی۔

"ارے کیا ھو گیا، بابا؟ آپ نے تو کبھی بھی... چوری چھپے مچھلیاں نہیں..." نیپیس نے کچھ اس انداز سے دریافت کیا کہ قائپ نے ٹیم لیڈر کی حیرت کا اندازہ لگا لیا۔ "آپ نے تو کبھی بھی یہ حرکت نہیں کی۔ لوگ تو آپ کی ایمانداری کی مثال دیتے ھیں۔ آپ جانتے ھیں... اب کیا ھوگا؟.. اب آپ پر مقدمہ چلے‌گا..."

"ارے، یہ دوستی کی باتیں ختم بھی کرو! ایسا ھی اچھا مچھیرا ھے تو اس نے قانون‌شکنی کیوں کی؟" علی‌بابا نیپیس کی باتوں کے دوران بول پڑا۔

نیپیس جانتا تھا کہ علی بابا مچھیروں کو گرفتار کرکے بہت خوش ہوتا ہے۔ شکار کے موسم کے آخر میں مچھیروں کا جلسہ ہوگا تو وہ بےشک ٹیم لیڈروں کو مچھلیاں پکڑنے سے متعلق منصوبے کی عدمتکمیل کے لئے قصوروار ٹھہرائےگا۔ اور یہ ضرور کہےگا کہ مچھیروں کے باشعور نہ ہونے اور کبھی کبھی چوری چھپے مچھلیاں پکڑ لینے کی ذمےداری ٹیم لیڈروں اور مچھیروں کی انجمن کے چیرمین پر عاید ہوتی ہے۔

"اچھی بات ہے" نیپیس نے جواب دیا۔ "ابھی میں سب لوگوں کو بلاکے سمجھا دوںگا... لیکن... علیبابا، سنو نا... اس وقت تو ہم لوگ شکار شروع کرنے کے منتظر ہیں..."

"یہ سب بیکار کہہ رہے ہو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم کو بخوبی معلوم ہے کہ کتنی بار قانونشکنی کر چکا ہوں!.."

"سنو نا، شکار ختم ہوتے ہی میں اس مچھیرے کو سزا دے دوںگا" ریڈیو پر آواز سنائی دی۔ "تم سے التماس ہے کہ اسے چھوڑ دو۔ اس وقت تو ایک ایک آدمی کی، ایک ایک کشتی کی ضرورت ہے! کسی نے شکار میں حصہ نہ لیا تو چیرمین مجھے بڑی سخت سزا دیںگے۔"

"بس کہہ بھی چکو۔ اب میں قانونشکنی کرنے سے رہا... تمہارے یہاں کے لوگوں کو شرم تو نہیں آتی" یہ کہہکے علیبابا نے جھٹ سے ریڈیو بند کرتے ہوئے گفتگو منقطع کر دی۔ قائپ نہ سمجھ سکا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا: اپنے اختیارات کے استعمال کے لئے یا دل کی آگ بجھانے کے لئے۔

پھر علی بابا نے بوڑھے کی طرف مڑتے ہوئے کہا:

"سن لیا نا تم نے؟ تمہارے خلاف عدالتی کارروائی کی جائےگی۔ ابھی رپورٹ تیار کرکے تم کو آقچی لے جاؤںگا" علی بابا نے آخری الفاظ دھیرے دھیرے کہے جیسے سوچنے کے لئے وقت چاہتا ہو۔

وہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھے کو آقچی لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ رپورٹ لکھنے، کمگو بوڑھے سے تمام تفصیلات دریافت کرنے اور اسے موٹربوٹ میں بٹھاکے آقچی پہنچانے میں ڈھائی گھنٹے سے زیادہ ہی وقت لگ جائےگا... اس طرح وہ دوپہر سے قبل اس شخص کو میلیشیا کے حوالے نہ کر سکےگا۔ ویسے ایک دوسری صورت

"تم نے یہاں سے بھاگ کھڑے ہونے کا ارادہ کیا تو سمندر میں ڈوب جاؤگے۔ یہ دیکھو، کنارا کتنا اونچا ہے۔ یہاں سے تم سمندر میں کودے تو پتھروں سے ٹکراکے تمہاری ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔ مطلب یہ کہ یہ کنارا تمہارے لئے مفید نہ ثابت ہوگا۔ آؤ، اب اور آگے چلیں۔"

دوسرے کنارے پر پہنچ کر علی‌بابا نے ریت کے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا جس کی چوٹی بالکل سفید تھی۔ اس پر نگاہیں جمانے سے آنکھوں میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔

"ٹیلے کی چوٹی پر نمک جم کے پتھر ہو گیا ہے" علی‌بابا نے وضاحت کی۔ "تم مجھ سے بھاگ کھڑے ہونے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس ٹیلے پر پہنچ کے نمک سے تمہارے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ تمہارے ٹیلے کی ڈھلان پر وہ داغ نظر آ رہا ہے نا؟ یہ اس عقاب کا خون ہے جسے تم نے میرے دروازے پر دیکھا تھا۔ وہ سمندری بھاپ سے بے‌ہوش ہوکے چوٹی سے نیچے گر پڑا تھا..."

تھکاماندہ قائپ ریت پر بیٹھ گیا۔ جزیرے کی ان خصوصیات کا اسے پہلے ہی سے علم تھا۔ علی‌بابا کو یہ بات معلوم نہ تھی اس لئے وہ اس جزیرے کے متعلق جسے سمندر نے ایک پھندا سا بنا دیا تھا، بڑے شوق سے تمام معلومات فراہم کرتا رہا۔

"جزیرے میں صرف ایک ایسی جگہ ہے جو تمہارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے" علی‌بابا نے قائپ کے قریب ریت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ جگہ جہاں میری موٹربوٹ کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد تم کو فرار کے راستے میں حائل ہونےوالی کوئی چیز نہ ملے گی۔ لیکن کیا تم سوچتے ہو کہ بات اتنے ہی پر ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں، اس جگہ سمندر اتنا پرسکون نہیں جتنا دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے۔ پہلے تو تمہیں ضرور محسوس ہوگا کہ پرسکون لہریں خود ہی تمہاری کشتی کو آگے بڑھائے لئے جا رہی ہیں۔ تم کو اسے چپوؤں کے ذریعے بڑھانے میں قوت نہ صرف کرنی پڑے گی۔ لیکن یہ صورت صرف شروع ہی میں پیدا ہوگی۔ بعد میں جب تمہاری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی اور آرام سے بیٹھنے کی بنا پر نیند آ جائے گی تو اچانک لہریں تمہاری کشتی پر ٹوٹ پڑیں گی اور اسے دو تین بار مروڑ کے تمہارے تابوت میں بدل دیں گی..."

قائپ نیپیس کو جواب دینا چاهتا تها لیکن اسے ان لوگوں سے اپنی صفائی اس طرح پیش کرتے ہوئے اچها نہ لگا جیسے وہ واقعی مچهلی چور ہو۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔

"تم نے ٹهیک ہی کہا، علی‌بابا۔ اب عدالت ہی کے سامنے جواب دیں جاکے" نیپیس نے صورت حال کو پیچیدہ نہ بنانے کی غرض سے علی‌بابا کی حمایت کی۔ "لیکن آخر وہ خاموش کیوں ہیں؟ بات کیا ہے؟ ان کی طبیعت تو ٹهیک ہے نا؟ انہیں کچه بولنے پر مجبور کرو نا!"

قائپ نے نیپیس کے مخلصانہ رویے کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے کونے سے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"میں ٹهیک ہوں، نیپیس..."

"سن لیا تم نے؟" علی‌بابا نے پوچها۔

"ہاں، خیر ٹهیک ہے۔ وہ جزیرے پر واپس آئیں‌گے تو ان سے سختی سے بات‌چیت ہوگی" یہ کہہ‌کے نیپیس نے ریڈیو بند کرنے کا ارادہ کیا لیکن اسی لمحے اسے علی‌بابا کی آواز سنائی دی:

"ٹهہرو، ٹهہرو! تم نے سوچا بهی ہے کہ وہ کیسے واپس آئےگا؟"

"اپنی کشتی میں" پسچانی سے جواب ملا۔

"لیکن بهاگ کهڑا تو ذمےداری تمہی پر عاید ہوگی!"

"وہ بهاگیں‌گے نہیں۔ اِن کا ضمیر انہیں بهاگنے ہی نہ دےگا۔ اس قسم کے واقعے کے لئے وہ اپنے آپ کو کوستے رہیں‌گے۔"

"اس کے لئے کوسنا ضروری ہے۔ اس کے ساته ہمارا سلوک وہی ہوگا" علی بابا نے کہا۔

"اچهی بات ہے، خدا حافظ!"

...دوپہر ہونے کو تهی لیکن قائپ ابهی تک علی‌بابا کا مہمان بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قیدی بنا بیٹها تها۔ دراصل علی‌بابا کی ایک عجیب سی عادت تهی۔ ماہی‌گیری سے متعلق قوانین کی خلاف‌ورزی کرنے کے سلسلے میں جسے بهی پکڑتا تها اسے اپنے اس جزیرے کی جس پر وہ فخر کرتا تها، سیر ضرور کراتا تها۔

جزیرے کے ڈهلواں جنوبی کنارے پر پہنچ‌کے اس نے قائپ سے کہا:

روس واپس جا رہے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے۔ مجھے کوئی نہیں لے گیا کیونکہ مجھے اپنی بیمار والدہ کی تیمارداری کرنی تھی۔ میں ان دنوں کتنے سال کا تھا؟ بیس سال کا اور میری عائشہ اٹھارہ سال کی... میں اور کریم‌بائے ہم‌عمر تھے... میری طرح وہ بھی اب بوڑھا ہو گیا ہوگا نا؟..

آقچی میں رہنےوالا، ایک کارخانےدار کا یہ بیٹا جب بھی ہمارے جزیرے پر آتا، مجھے ہمیشہ کچھ خوف سا محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے کوئی مصیبت نازل ہونےوالی ہو۔ میں پریشان ہوکے عائشہ کو اذیتیں پہنچانے لگتا۔ ایک بار کریم‌بائے آیا تو میں نے والدہ سے کہا کہ وہ عائشہ کو اپنی کوٹھری میں چھپائے رکھیں۔ عائشہ میری بیوی تھی اس لئے مجھے اسے مارنے پیٹنے کا بھی حق حاصل تھا۔ ہر مہینے عائشہ کے والد کو آدھی کشتی مچھلیاں عائشہ کی تکالیف کے معاوضے ہی کے طور پر تو دیتا تھا...

کریم‌بائے جزیرے پر جانوروں کا شکار کرنے اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے آتا تھا۔ دو خوش پوش نوجوان بھی اس کے ساتھ آتے تھے۔ یہ کم‌گو، لمبے تڑنگے اور طاقتور نوجوان جن کی کمر سے بخارا کے خنجر لٹکتے رہتے تھے، مجھے خوف‌زدہ کر دیتے تھے...

کریم‌بائے کارخانےدار کا بیٹا ہونے کے باوجود نیک اور شریف نوجوان تھا۔ اس کی کشتی ایسی چیزوں سے بھری ہوتی تھی جو ہمارے جزیرے کے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی ہوتی تھیں اور آقچی میں اس کے باپ کی دوکان سے خریدی جا سکتی تھیں۔ وہ بوڑھوں کے لئے وادکا، بچوں کے لئے پھل اور مٹھائیاں اور عورتوں کے لئے پوت اور کپڑے لاتا تھا۔ سب کو کھلے میدان میں اکٹھا کرکے یہ تحفے پیش کرتا اور لوگ اس کی فراخدلی سے متاثر ہوکے اپنے اپنے تحائف لئے ہوئے واپس چلے جاتے...

ایک بار کریم‌بائے نے مجھے ایک گھڑی تحفے میں دی اور مجھے اس کے استعمال کا طریقہ سمجھایا۔ یہ گھڑی زیلیونی اور پسچانی جزائر کے درمیان کہیں سمندر میں گر گئی۔ شاید وہ اب بھی وہاں سمندر کی تہ میں پڑی ہوگی...

ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ کریم‌بائے اپنے باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک بار اس نے لوگوں سے کہا کہ اباجان مر جائیں‌گے اور وہ

# ۵

قائپ کی کشتی زیلیونی جزیرے کی طرف چلی جا رہی تھی۔

بوڑھے کو معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس قسم کے واقعات نہ پیش آئیں گے جن سے علی‌بابا کے جزیرے میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ دوبارہ علی‌بابا کا سامنا نہ ہوگا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب اس کے لئے جو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے وہ لوگوں سے نہیں بلکہ سمندری پتھروں یا اتھلی جگہوں سے ہوگا۔ نیپیس بھی خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے فکرمند ہوکے کہ اتنی دیر ہو جانے کے باوجود قائپ واپس کیوں نہیں لوٹا، اسے تلاش کرنے کے لئے کوئی کشتی بھیج سکتا تھا۔ ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ شکار کی تیاریوں میں مصروف ہوکے کشتی بھیجنا بھول ہی جائے۔

دوپہر کو قائپ علی‌بابا کے جزیرے سے واپس لوٹ رہا تھا تو سمندر کا پانی دھندلا سا تھا جس پر لہروں کے باعث جگہ جگہ سیاہ دھبے سے نظر آتے تھے۔ دیر سے ہوائیں نہیں چلی تھیں اور سمندر خاصا پرسکون تھا۔ اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پانی نے گوشت کی جیلی کی شکل اختیار کر لی تھی جسے لہریں ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہی تھیں۔ پانی اتھلا ہونے کی وجہ سے ان ٹکڑوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

قائپ پوری طاقت سے چپو چلا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہاتھ میں پانی لےکے منھ پر چھڑک لیتا تھا جس سے سر کا چکر ختم ہو جاتا تھا۔ اسے بےحد بھوک لگی ہوئی تھی۔

لیکن کیا خبر تھی کہ سفر اتنا طویل ہو جائےگا۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو چلتے وقت کھانے کے لئے کچھ ساتھ لے لیتا۔

اب سمندر بالکل خالی تھا۔ اس کے اوپر پرندے تک نہیں اڑ رہے تھے۔ وہ اداس تھا اور ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا۔ ان یادوں سے نجات حاصل کرنا قائپ کے بس ہی میں نہیں تھا۔

"یہ ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے۔ امیر لوگ عوام کی قسمت کے مالک تھے۔ روس میں جنگ چھڑ گئی تھی اور روسی، جزیرے کو چھوڑکے

میں عائشه کو لعنت ملامت کرکے جھاڑیوں کے درمیان واقع ایک میدان میں پہنچا اور وهاں ریت پر لیٹ گیا۔ مجھے توقع تھی که وہ جھاڑیوں سے نکل‌کے میرے پاس آئےگی اور همیشه کی طرح معافی مانگےگی...

سخت گرمی پڑ رهی تھی۔ سمندر سے بھاپ ابھر ابھرکے ریت پر چھا گئی تھی اور مینڈک پانی سے نکل‌کے میرے ارد گرد اچھلتے کودتے پھر رهے تھے۔ ان کی شکایت‌آمیز ٹرٹراهٹ سن‌کے ایک چیل میرے سر پر منڈلانے لگی...

دھوپ کی تیزی اور بھاپ کی وجه سے مجھے الساهٹ محسوس هوئی اور اونگھ گیا۔ نیم‌خوابی کی اس حالت میں مجھے بھوتوں کی تصویریں سی نظر آنے لگیں۔ پهلے تو جانے کیسے لوگوں کے آڑے ترچھے چھرے دکھائی دئے پھر ایک لنگڑی لولی گھوڑی نظر آئی جو پانی میں اترکے تیرنے لگی۔ میں چونک‌کے آنکھیں کھولتا لیکن دوسرے هی لمحے نیند سے پھر پلکیں جھپک جاتیں...

یوں هی ریت پر پڑے پڑے کوئی ایک گھنٹه گزر گیا۔ اتنے میں اچانک میرے دل میں تشویش کے شعلے سے بھڑک اٹھے اور میں اٹھ‌کے ادھر ادھر جھانکنے لگا – ایسی مکمل خاموشی چھائی هوئی تھی جس میں انسان کو اپنے خوف تک کی آواز سنائی دیتی هے...

میں عائشه کو پکارنا چاهتا تھا لیکن سو جانے کے باعث حلق اور هونٹ خشک هو رهے تھے۔ منه سے آواز هی نهیں نکل رهی تھی۔ زور سے آواز نکالنے کے بجائے منه هی منه میں بڑبڑا رها تھا...

آخر میں ان جھاڑیوں کے پاس پهنچا جهاں عائشه کو چھوڑ گیا تھا۔ مجھے پیاس لگی هوئی تھی اور جسم کی هر جنبش سے سر چکراتا تھا۔ میں نے سوچا که بھاپ نے مجھے مدهوش کر دیا هے اور اپنے اوپر لعنت بھیجی که الساهٹ دور کرنے کی کوشش کے بجائے ریت پر لیٹ‌کے سو گیا تھا...

کچھ اور آگے بڑھ‌کے سکساؤل کی جھاڑیوں کے گھیرے میں پهنچ گیا۔ یه خشک جھاڑیاں پتھروں کی طرح مضبوط تھیں اور هوا کے جھونکے تک ان کے اندر نهیں آ پا رهے تھے۔ میں سمجھ گیا که راسته بھول گیا هوں: مجھے وہ چھوٹی سی خالی جگه نهیں ملی جهاں عائشه کے ساتھ بیٹھا هوا تھا...

خود ان کی جگہ سنبھالےگا تو وہ جزیرےوالوں کے استعمال کے لئے روسیوں سے ایک تیزرفتار جہاز خریدےگا اور ان کی مچھلیوں کی دوگنی قیمت دیا کرےگا تاکہ جزیرے پر سب کے سب امیر بن جائیں، کوئی مریض یا غریب نہ رہ جائے...

اس دن جب کریم‌بائے آخری بار زیلیونی پر آیا تھا، اس نے بخارا کے لمبے لمبے بالے عائشہ کو تحفے میں دئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دوسری لڑکیوں کی بہ‌نسبت عائشہ سے زیادہ التفات برت رہا ہے۔ اس کے دوست بھی اس روز کچھ ایسا انداز اختیار کئے ہوئے تھے جیسے کوئی خاص بات ہونےوالی ہو۔ وہ زیر لب باتیں کر رہے تھے، دھیرے دھیرے ہنس رہے تھے۔

وہ لوگ شکار کے لئے جزیرے میں دور تک نکل گئے تو میں عائشہ کو چشمے کے قریب سکساؤل کی جھاڑیوں میں لے آیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے اس سے کیا کہا یا کیا مانگا تھا۔ شاید میری خواہش تھی کہ وہ کریم‌بائے کے تحفے کو پھینک دے۔ دراصل میں اسے برا بھلا کہنے ہی کے لئے اس جگہ لے گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی مصیبت سر پر منڈلا رہی ہے...

عائشہ سے میں پہلے بھی اکثر لڑتا جھگڑتا رہتا تھا لیکن کریم‌بائے کے ان دوروں کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے جھگڑوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ہر بار جھگڑے کا باعث میری تندمزاجی اور جھلاہٹ ہی ہوتی تھی۔ بےچاری عائشہ تو ہمیشہ ہی خاموش رہتی۔ میرے ظلم و ستم پر احتجاج کرنے کی کبھی بھی ہمت نہیں کرتی تھی۔ گھر سے دور جاکے جھاڑیوں میں چھپ جاتی اور آنسو بہاتی رہتی...

اس منحوس دن عائشہ مجھ سے انصاف کی طالب تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم اور التماس کی جھلک تھی جیسے اسے بھی کسی مصیبت کا اندیشہ رہا ہو...

عائشہ فطرتاً میری بہ‌نسبت زیادہ حساس واقع ہوتی۔ بہت سی چیزیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی، اسے متاثر کرتی تھیں۔ وہ چاند گرہن یا رنج وغم کو دل سے محسوس کرتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ قدرت سے، اپنے خیالات کے اعتبار سے خدا سے زیادہ قریب ہے...

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اس اجنبی جزیرے پر چلا جائے یا کشتی کا رخ موڑ دے؟ اس نے سوچا کہ کیوں نہ علی‌بابا کے پاس واپس جاکے درخواست کرے کہ وہ پسچانی سے یرملائی کو بلا دے۔ اس نے کھایا پیا تو تھا نہیں اور جسم کی آخری قوت بھی جواب دینے کو تھی۔ اس نے سوچا کہ یرملائی کے ساتھ پسچانی پہنچ جائے‌گا اور رات کو سب لوگوں کے سو جانے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے آبائی جزیرے کے لئے روانہ ہوگا۔

پھر اسے خیال آیا کہ نہیں، یہ طریقہ معقول نہیں۔ علی‌بابا اسے دیکھ‌کے اس کی ایمانداری پر شک کرے‌گا اور کون جانے اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو۔

یہ سب سوچ‌کے قائپ نے اسی انجانے جزیرے پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ مچھیرے اس پر توجہ مبذول نہ کریں‌گے اور وہ زیلیونی کا راستہ معلوم کرکے ان سے رخصت ہو جائے‌گا۔ نہیں، پہلے تو ان سے کچھ کھانے کے لئے مانگنا ہوگا۔

قائپ نے اپنی کشتی جزیرے کے قریب روک دی لیکن خشکی پر قدم رکھنے کے بجائے پانی میں لیٹ‌کے کشتیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں اور جزیرے کا جائزہ لینے لگا۔ جزیرہ برف کی سل کی طرح سفید اور ہموار تھا لیکن پسچانی جیسا کم‌آباد اور پرسکون نہیں تھا۔ قائپ نے دو تین مشینیں دیکھیں جو نمک نکال رہی تھیں۔ نمک سے لدی ہوئی چھوٹی بڑی کشتیاں اسے کسی دوسری جگہ لے جانے میں مصروف تھیں۔

کشتی قائپ کے قریب آئی تو اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے اس نے پوچھا کہ زیلیونی کہاں واقع ہے۔

قائپ کی مدد کے سلسلے میں ان لوگوں نے یاد کرنا شروع کیا کہ زیلیونی جانے کے لئے کشتی کو کس سمت میں چلانا چاہئے۔ کسی نے دائیں طرف اشارہ کیا تو کسی نے بائیں طرف۔ بحث مباحثے میں ان کے درمیان ہاتھاپائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

قائپ سمجھ گیا کہ ان لوگوں کو زیلیونی جزیرے کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ اس نے اس سوال پر ان لوگوں کے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے امکان کو ختم کرنے کے لئے ان سے پسچانی کا پتہ

میرے سامنے جھاڑیاں اتنی گھنی اور موٹی تھیں کہ دو قدم آگے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ اور آگے بڑھا لیکن یہاں بھی جھاڑیاں ھی جھاڑیاں تھیں۔

اچانک کریم‌بائے اور اس کے دوست میرے سامنے آ گئے۔ کریم‌بائے تو مجھے دیکھتے ھی بدحواس ھو گیا لیکن اس کے دوستوں نے اپنے چہروں سے کسی جذبے کا اظہار نہ ھونے دیا... ان کی آنکھوں کے گوشوں میں البتہ حقارت‌آمیز ھنسی کی چمک نمودار ھو گئی...

میں نے سر ھلایا اور مخالف سمت میں چلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن میں ابھی ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکا تھا کہ کریم‌بائے جھاڑیوں کو توڑتا ھوا میرے سامنے سے بھاگ کھڑا ھوا جیسے اس نے شیطان کو دیکھ لیا ھو...

یہ دیکھ‌کے میں دنگ رہ گیا۔ لیکن کریم‌بائے کے دوست نہ بھاگے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خاموش کھڑے رھے... مجھے محسوس ھوا کہ ان کے ارادے خطرناک ھیں چنانچہ ان کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک‌کر رحم کی بھیک مانگنے لگا...

انہوں نے مجھ پر ترس کھایا، مجھے ایک طرف گھسیٹ‌کے پیروں پر کھڑا کیا اور دور جھاڑیوں میں ڈھکیل دیا۔ میں منہ کے بل ریت پر گرا لیکن وھاں سے بھاگ کھڑے ھونے کے ارادے سے فوراً ھی اٹھ کھڑا ھوا۔ سکساؤل کی وہ جھاڑیاں اب بھی میرے سامنے تھیں لیکن آوازیں نہیں سنائی دے رھی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ میں مار پیٹ سے بچ گیا تھا!.."

... قائپ نے بےچینی سے چپو پانی سے باھر نکال لئے۔ علی‌بابا سے نجات پاکر اسے بےحد خوشی ھوئی تھی اور اس کے ذھن میں خیال تک نہیں آیا تھا کہ کشتی کو کس طرف لے جانا چاھئے۔

اسے ایسا لگ رھا تھا کہ کشتی پانی کے دھارے میں داخل ھو جائےگی اور اسے زیلیونی جزیرے تک لے جا سکےگا۔ کشتی بائیں جانب مڑکے چل رھی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اس نے صحیح راستہ اپنایا ھے...

لیکن کافی دیر کے بعد جب اسے افق پر کسی اجنبی جزیرے کے خطوط نظر آئے تو اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ھے۔

تھے۔ اس نے سوچا کہ بگلے مچھلیوں کا راستہ تلاش کرکے ان کی طرف سے انسان کی توجہ ہٹانا چاہتے ھیں۔

تھوڑی دیر بعد قائپ کو ایک اور آباد جزیرہ ملا۔ ساحل پر دو بوڑھے جنھوں نے اپنے پاؤں پانی میں ڈال رکھے تھے، سوتے نظر آئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مسافر ھیں اور طویل سفر کے بعد آرام کر رھے ھیں۔ اتنے میں ایک اور بوڑھا وھاں آیا۔ اس نے کشتی سے ایک بوری نکال‌کے اسے بمشکل کھولا اور ایک بڑی سی خشک نان نکال‌کے اس کے تین ٹکڑے کئے۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو جگانا شروع کیا۔

دونوں بوڑھے جاگ اٹھے۔ انھوں نے پہلے تو بڑبڑاتے ھوئے تیسرے بوڑھے کو گالی دی پھر روٹی کھانے لگے۔

قائپ کی کشتی آگے بڑھی اور تینوں بوڑھے اس کی نگاھوں سے اوجھل ھو گئے۔

شام تک اس کی کشتی چھوٹے بڑے درجنوں جزیروں کے پاس سے گزر چکی تھی۔ وہ ان میں سے زیادہ‌تر جزائر تک سفر کر چکا تھا اور پہلے سے واقف تھا لیکن بعض جزائر اس نے پہلی بار دیکھے۔ یہ غیرآباد سنسان جزیرے حال ھی میں وجود میں آئے تھے۔ سمندر نے پتھروں اور چٹانوں کو اوپر اٹھاکے جزیروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ بوڑھے کو ان کے قریب سے گزرتے ھوئے ایسا لگا جیسے چپوؤں کی سرسراھٹ سن‌کر سمندری گھاس گردن اٹھاکے یہ معلوم کرنے کے لئے اس کی طرف دیکھ رھی ھو کہ اس کے آرام میں کس نے خلل ڈال دیا۔

قائپ کو ان جزیروں سے خاص طور سے دلچسپی تھی کیونکہ یہ سمندر کی تہ سے ابھرے تھے جہاں کشتیوں اور لوگوں کی قبریں تھیں۔

بڑے جزیروں پر ایک نگاہ ڈال‌کے ھی قائپ کو احساس ھو رھا تھا کہ عوامی اقتدار کے پچاس برسوں میں یہاں کتنی زبردست تبدیلیاں رونما ھوئی ھیں۔ جہاں پہلے ریگ‌زار تھے وھاں اب بستیاں اور کارخانے نظر آ رھے تھے۔ بندرگاھوں پر مال‌بردار کشتیاں اور نمک، ٹین اور گرانیٹ سے لدے ھوئے بڑے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ صاف ظاھر ھو رھا تھا کہ سمندر کو معجزہ تصور کرنےوالے لوگوں نے

پوچھا۔ لوگوں نے خوش ہوکے جواب دیا کہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ جزیرہ کہاں واقع ہے۔ لیکن ان لوگوں میں ایک بار پھر بحث اٹھ کھڑی ہوئی جس سے قائپ کو یقین ہو گیا کہ انہیں پسچانی کا راستہ بھی معلوم نہیں ہے۔ کچھ کہہ رہے تھے کہ پسچانی، آقچی کے قریب واقع ہے جبکہ دوسروں کا خیال تھا کہ یہ جزیرہ شمال میں ہے جہاں سے قزاخستان کی استیپیاں شروع ہوتی ہیں۔

آخرکار ان لوگوں نے قائپ کو روٹی، تلی ہوئی مچھلی اور پینے کا پانی دیا اور کہا کہ آج رات یہیں آرام کر لو۔ کل تازہ دم ہوکے پھر سفر کرنا۔

قائپ نے اس تجویز کے لئے شکریہ ادا کیا لیکن جزیرے پر رات بسر کرنے کی دعوت منظور نہ کی اور اپنی کشتی پر سوار ہوکے روانہ ہو گیا۔

اسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ روٹی کے لقمے منہ میں رکھتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

قائپ کو یقین ہو گیا کہ اب اس کی کشتی محض اتفاق ہی سے زیلیونی یا پسچانی تک پہنچ سکتی ہے۔

کشتی کافی دور تک آگے نکل آئی تو اس نے مڑکے جزیرے پر نظریں ڈالیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یہ سالیونی نام کا وہی جزیرہ ہے جسے اس نے برسوں قبل دیکھا تھا۔

اس وقت وہ چھوٹا سا بچہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس کے والد نے یہ محسوس کرکے کہ اس کے دنیا سے کوچ کرنے کے دن بہت قریب آ گئے ہیں، بیٹے کے ساتھ تمام جزائر کے سفر کا فیصلہ کیا تھا۔ اب قائپ کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ دراصل اس کا باپ اپنی آبائی سرزمین کو آخری بار سلام کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت سالیونی میں کوئی نہیں رہتا تھا اور اس کا شمار غیرآباد جزائر میں ہوتا تھا۔ اب تو خیر، اس جزیرے پر خاصی آبادی تھی اور مقامی لوگ مچھلیاں پکڑنے اور نمک نکالنے کا کام کرتے تھے۔

جزیرے کے ارد گرد سمندر پر انسانی زندگی کی چھاپ پائی جاتی تھی - قائپ کی کشتی کے اوپر بگلے خاموشی سے پرواز کر رہے

میں اسی قسم کے خیالات میں کھویا ہوا تھا اور مجھے عائشہ کا خیال تک نہ آیا جسے میں جھاڑیوں میں چھوڑ آیا تھا...

اچانک مجھے کراھنے کی آوازیں سنائی دیں۔ غور سے سنا تو سمجھ میں آیا کہ کوئی انسان آھیں بھر رہا ھے... میرے پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی اس لئے پیٹ کے بل رینگنے لگا، سر جھاڑیوں میں ٹھونس کے ان کے اندر ٹٹولنے لگا۔ روشنی جھاڑیوں کے اندر تک نہیں پہنچ رہی تھی اور مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک میرا ھاتھ ایک کچھوے پر پڑا اور میں کراھیت محسوس کرکے چیخ اٹھا۔ اس سے قبل کبھی بھی کچھوے سے نہیں ڈرا تھا...

مجھے اپنے قریب کچھ پھڑپھڑاھٹ سی سنائی دی۔ کچھ اور آگے رینگا تو ایک عورت نظر آئی جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے... میں بمشکل ھی اسے پہچان سکا۔ یہ میری عائشہ تھی۔ میں یہ سوچ کے خوف سے کانپ اٹھا کہ عائشہ یہاں کیوں پڑی ھے؟ اس حالت میں؟.. نہیں، نہیں یہ عائشہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے پکارنا شروع کیا لیکن جواب میں زمین پر پڑی ہوئی عورت کی صرف آھیں ھی سنائی دے رہی تھیں...

اچانک میرے لئے سب کچھ ختم ہو گیا۔ آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ہوائیں سرد ہو گئیں۔ میرے دماغ میں، دل میں کچھ بھی باقی نہ رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا دل ان ساری چیزوں سے محروم ہوا جا رہا ھے جن سے اس میں حرارت پیدا ہوتی تھی۔ میری رگوں میں خون جما جا رہا تھا...

عائشہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نگاھوں میں نہ خوف تھا، نہ التجا تھی اور نہ ھی وفاداری۔ ان میں تھکن کے سوا کچھ بھی نہ تھا...

میں صبح تک اس کے پاس بیٹھا رہا..."

قائپ کو دور افق پر رات کی بےشمار روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی کشتی کسی شہر میں پہنچنے کو ھے۔ ان روشنیوں کو دیکھ کے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ مچھیروں کا صدر مقام آقچی ھے۔

ماھی‌گیری شروع کرکے اپنی زندگیوں کو نعمتوں سے معمور کر دیا تھا۔

جزائر کی دلدل جو پہلے طاعون کا باعث بنتی تھی، خشک ھو چکی تھی اور اب اس پر دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔

یوں ھی ایک جزیرے کے بعد دوسرے کے قریب سے گزرتی قائب کی کشتی چلی جا رھی تھی۔

ساحلی علاقوں پر لوگوں کو ایک کشتی اور اس پر سفید کپڑوں میں ملبوس، لمبی داڑھی‌والے دبلے پتلے بوڑھے کو دیکھکے حیرت ھو رھی تھی۔ لوگ بحث کرنے لگتے تھے کہ آخر یہ بوڑھا ھے کون۔ بعض لوگ بوڑھے کو مچھلی چور سمجھکے اس کی بہادری کی داد دینے لگتے تھے کیونکہ دن کے وقت چراکے مچھلیاں پکڑنا ایسا ھی مشکل کام تھا جیسے طوفان کے دوران سمندر میں تیرنا۔

دوسروں کا خیال تھا کہ یہ بوڑھا ان تین مچھیروں کی تلاش میں نکلا ھے جو ھفتے بھر قبل مچھلیاں پکڑنے گئے تھے اور اب تک لاپتہ تھے۔

جو لوگ بالکل ھی قیاس نہ لگا پاتے وہ بوڑھے کی کشتی کے پیچھے بک بک جھک جھک کرنے لگتے۔

قائپ ان کی آوازوں کو سن ھی نہیں رھا تھا۔ وہ تو خیالوں میں کھویا ھوا تھا، ماضی کی تصویروں کو دیکھ رھا تھا۔ یہ تصویریں اسے تسلی تو نہیں لیکن حقیقت پر نظر ڈالنے کا موقع ضرور دے رھی تھیں۔

"میں جھاڑیوں میں راستہ بناتا ھوا کریم‌بائے کے ساتھیوں سے دور بھاگ رھا تھا۔ شام کو گھر پہنچنے کے بعد ھی میں نے دیکھا کہ میرا چہرہ اور ھاتھ بری طرح سوج گئے تھے۔ والدہ نے مرھم‌پٹی کرتے وقت میرے جسم سے سکساؤل کے متعدد کانٹے نکالے...

میں کافی دیر تک بھاگتا رھا۔ آخر جب بدن کی قوت جواب دے گئی تو ایک میدان میں ٹھہرکے زمین پر گر پڑا۔ میرا خوف اب ختم ھو چکا تھا۔ میں سوچ رھا تھا کہ جھاڑیوں میں آخر کیا ھوا تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ کریم‌بائے مجھے دیکھکے ڈر کیوں گیا تھا؟ اس کے ساتھی مجھے مارنا پیٹنا کیوں چاھتے تھے؟ شاید اس لئے کہ میں ان کے مالک کی کمزوری کا گواہ تھا؟ شاید وہ چاھتے تھے کہ میں اپنی زبان سی لوں؟..

روانہ کر دیا گیا۔ لوگوں کو جب پتہ چلا کہ آپ کشتی لےکے چلے گئے ھیں تو خاصا ھنگامہ کھڑا ھو گیا" پروشکا نے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کشتی کا چاروں طرف سے جائزہ لیا اور اسے کشتی کے ٹھیک حالت میں ھونے کا یقین ھو گیا تو اس نے کہا: "مجھے آج شام کو واپس لوٹ جانا تھا لیکن اس خیال سے کچھ دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا کہ سمندر میں کہیں آپ راستہ بھول گئے تو بندرگاہ پر ضرور ھی آئیں گے۔ یہاں تو مجھے اتنی زیادہ کشتیاں نظر آئیں کہ سر چکرانے لگا! سب لوگ شکار کے انتظار میں ھیں۔ رات ھوگی تو سب لوگ کشتیوں ھی پر سو بھی جائیں گے۔ چچا، آپ نے سنا شکار شروع ھو گیا نا؟ کہیں ایسا نہ ھو کہ میں اور ابا اس میں شریک نہ ھو سکیں..."

قائپ پروشکا کے سہارے اس کی کشتی میں داخل ھوکے بیٹھ گیا...

پروشکا نے اپنے والد یرملائی کی تقلید کرتے ھوئے کہا:

"خدا کا شکر ھے! اچھا ھی ھوا کہ کشتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ جو کچھ ھوا، ٹھیک ھی ھوا!"

پرانی مال‌بردار کشتی، آخری طاقت سے سیٹی بجاتی اور قائپ کی کشتی کو گھسیٹتی ھوئی چل دی۔

قائپ کو ھنسانے کی کوشش میں پروشکا قریب سے گزرنےوالے جہازوں اور کشتیوں کی طرف مڑ مڑکے بار بار چلا رھا تھا:

"ارے، تم نے مچھلی کی آنکھ کھا لی ھے یا نشے میں ھو؟ ھاں، ھاں، تمھی سے کہہ رھا ھوں۔ ارے اے، میری کشتی سے مت ٹکراؤ۔ اپنی جان سے ھاتھ دھونا چاھتے ھو کیا؟ تمہیں خدا کا ڈر نہیں کیا؟"

قائپ بیٹھا پروشکا کی ان باتوں سے لطف‌اندوز ھو رھا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ یرملائی سے جھوٹ بولا تھا اور وہ اداس ھو گیا۔ اس وقت یرملائی کہاں ھوگا؟ شاید سمندر میں کہیں مجھے تلاش کر رھا ھوگا؟ شاید وہ لکڑی کے کندوں اور ٹیڑھے میڑھے ھو جانےوالے بکسوں کو تاریکی میں میری کشتی تصور کر رھا ھوگا؟ ان چیزوں کو وہ ٹارچ کی روشنی میں دیکھتا اور ھر شخص سے پوچھتا ھوگا کہ راستے میں کوئی بےوقوف بوڑھا تو نہیں ملا جو نہ جھوٹ بول سکتا ھے، نہ دوسروں کی طرح چوری کر سکتا ھے۔ وہ خود بھی دکھی

اس نے بندرگاہ کو دور ھی سے دیکھکے پیچھے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ ساحل پر کوئی اسے دیکھ لےگا لیکن اس جگہ سے چپ‌چاپ نکل جانا بھی مشکل تھا۔ اس کی کشتی کے قریب سے مچھلیوں کے شکار کا سامان لادنےوالے جہاز اور مال‌بردار کشتیاں گزر رھے تھے۔ ان کی سیٹیوں کی آوازیں اور روشنیاں بوڑھے کو بےچین کر رھی تھیں۔

ایک بار تو اس کی کشتی ایک چھوٹے مسافر جہاز سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس کے بعد چنگی کی موٹر بوٹ نکل‌کے سمندر میں آ گئی اور اس کی چیخ سنائی دی۔

قائپ نے اپنی کشتی کو دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن ادھر بھی کشتیاں اور جہاز دکھائی دئے۔ ایسا لگتا تھا کہ سمندر میں کوئی خالی جگہ ھی نہیں باقی رہ گئی۔

قائپ یہ دیکھکے کہ اس کی کشتی آگے نہیں نکل سکتی، اپنے اوپر لعنت بھیجنے لگا۔ اتنے میں پسچانی کی ایک مال‌بردار کشتی اس کے قریب آئی اور اس سے آواز ابھری:

"قائپ چچا!"

قائپ نے مڑکے دیکھا۔ پروشکا بہت سی کشتیوں اور جہازوں کے درمیان ایک کشتی پر کھڑا ھوا ھاتھ ھلا ھلاکے اسے اپنے پاس بلا رھا تھا۔

قائپ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو وہ قائپ کی کشتی میں چلا آیا اور اس نے کشتی کو خود اپنی کشتی سے باندھنے میں قائپ کی مدد کی۔ پروشکا اپنے والد کی طرح پرسکون اور متوازن مزاج کا مالک تھا لیکن قائپ سے اچانک ملاقات ھو جانے سے کچھ گھبرا سا گیا تھا اور بوڑھے کو وفادار نگاھوں سے دیکھتے ھوئے جلدی جلدی سب کام کر رھا تھا۔ اس نے اپنے والد کے لہجے کی نقل کرتے ھوئے کہا:

"میں یہاں نمک لینے کے لئے آیا ھوں۔ پہلے ابا آیا کرتے تھے لیکن کل انہیں نہیں آنے دیا گیا۔ انہیں تو کل آپ کی تلاش میں

"جی نہیں" پروشکا نے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ ابا بہت ہی ضدی ہیں... آپ کی تلاش میں نکلتے وقت انہوں نے کہا تھا: «جب تک انہیں ڈھونڈ نہ لوں گا واپس نہ لوٹوں گا»۔ لیکن میں ان پر سبقت لے گیا اور آپ کو ڈھونڈ ہی نکالا..."

"تم بہت اچھے لڑکے ہو..." قائپ نے پروشکا کی تعریف کرتے ہوئے کہا اور ایک بورا بچھاکر اس پر لیٹ گیا۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو اس کے کان بجنے سے لگے اور اس کی نگاہوں کے سامنے سمندر تھرتھراتی ہوئی موجوں کے درمیان بہت سے سفید جزائر تیرتے ہوئے معلوم ہوئے۔ نہ جانے لوگ کیسے ہنس رہے تھے، اسے دیکھکے مسکرا رہے تھے، منہ چڑھا رہے تھے اور اسے آنکھ مار رہے تھے جیسے وہ اس سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتے ہوں۔ مختصراً یہ کہ قائپ نے کل اور آج جو کچھ دیکھا تھا وہ سب ایک بار پھر نظر آیا۔

اس سے قبل اس نے سمندر کو کبھی بھی خواب میں نہیں دیکھا تھا۔

قائپ نے آنکھیں کھولیں تو سمندر کی تصویریں ایکدم غائب ہو گئیں مگر کانوں میں ہلکی ہلکی گونج باقی رہی۔

یہ کیفیت بےخوابی کے باعث نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے دل میں عائشہ کی یاد کا درد تھا جس نے وہ بھیانک تصویریں پیدا کیں۔ اس نے سوچا کہ آج رات ہی کو وہ اس دنیا سے کوچ کر جائے گا۔

قائپ اٹھکے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور پروشکا کے پاس آ گیا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس حالت میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔

اس نے دیکھا کہ سمندر سے رات کو بھی بھاپ اٹھ رہی ہے اور اس کے اوپر ہلکی سی نقاب کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ کشتی کے لالٹین کی روشنی بمشکل ہی اس نقاب کو توڑکے سمندر کو تھوڑی دیر تک منور کر پا رہی تھی۔

لیکن کشتی آسانی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پروشکا کو اس کے کسی چیز سے ٹکرا جانے کا ڈر نہیں تھا اور وہ سیٹی بجائے بغیر ہی اسے چلائے جا رہا تھا...

لیکن کہیں دور دوسرے جہاز اور کشتیاں زور زور سے سیٹیاں

ہے اور دوسروں کو بھی دکھ دے رہا ہے۔ سویرے سویرے ہی واپس لوٹنے کا وعدہ کرکے گیا تھا لیکن دو دنوں سے غائب ہے۔ آخر شیطان اسے کہاں اڑا لے گیا؟

پھر قائپ کو پسچانی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا جزیرے کے لوگ یہ سن‌کر کہ قائپ چوری چھپے مچھلیاں پکڑنے گیا ہے، کتنی حیرت میں پڑ گئے ہوں‌گے! جو لوگ خود مچھلیاں چوری کرتے رہے ہیں وہی اب اس کی مذمت کر رہے ہوں‌گے۔ گالی دیتے ہوئے کہتے ہوں‌گے: آخر وہ اس موقعے پر کیسے چل دیا جبکہ شکار کی وجہ سے ایک ایک کشتی کی ضرورت ہے؟ کیا یہ وہی قائپ ہے جسے سب لوگ شریف اور دانش‌مند تصور کرتے تھے، جو اتنا نیک تھا کہ مکھی کو بھی نہیں ہلاک کر سکتا تھا؟ آخرکار اس کے دل میں بھی چوری سے مچھلیاں پکڑنے کی خواہش پیدا ہو ہی گئی نا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بڑے بوڑھوں اور شریف کہلانے‌والوں کے دل ہمیشہ عیار ہوتے ہیں!..

ہاں، پسچانی کے لوگ اس کے بارے میں یہی سب کہتے ہوں‌گے۔ ویسے وہ، قائپ کبھی کبھار جھوٹ ضرور بولتا رہا ہے۔ یہ وہی جھوٹ ہے جو وہ یرملائی سے بولا تھا اور جس کے بغیر لوگ زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ ایسے جھوٹ کو عموماً نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس بار تو قائپ کے جھوٹ سے خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا...

قائپ نے یہ دیکھ‌کے کہ پروشکا خاموش ہوکر کشتی چلا رہا ہے، اندازہ لگایا کہ وہ لوگ کھاڑی سے نکل‌کے کھلے سمندر میں داخل ہو چکے ہیں۔

بوڑھے نے سونے کا فیصلہ کیا اور اس کی تیاری کرتے ہوئے پروشکا سے دریافت کیا کہ پسچانی کس وقت پہنچیں‌گے؟ پروشکا نے جواب دیا:

"ٹھیک صبح ہوتے ہی پہنچیں‌گے۔ آپ سو جائیے، میں جاگتا اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہوں‌گا۔ شاید کہیں ابا بھی نظر ہی آ جائیں۔ وہ تو پوری توجہ اور قوت سے آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکے ہوں‌گے۔"

"وہ جزیرے پر پہنچ گئے ہوں‌گے" قائپ نے پروشکا کو تسکین دینے کے لئے کہا۔

"ارے سنو، یہ زیلیونی جزیرہ کہاں ہے؟ تم کو تو معلوم ہونا چاہئے..."

"جی ہاں، معلوم تو ہے!" پروشکا نے کچھ حیرت کے ساتھ جواب دیا۔ "میں کئی بار وہاں جا چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ وہاں کشتیاں کنارے تک نہیں پہنچ پاتیں۔ بس ارد گرد کے چکر کاٹتے کاٹتے ڈوب جاتی ہیں..."

"زیلیونی جانے کا کوئی سیدھا راستہ بھی ہے؟"

"جی نہیں۔ پسچانی سے گزرنے کے بعد ہی وہاں پہنچنا ممکن ہے۔ کسی دوسرے راستے کا مجھے علم نہیں۔"

"یاد کرو۔ ذرا ٹھیک سے یاد کرو، پروشکا!"

پروشکا ذرا دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا:

"سوچ لیا میں نے، چچا قائپ... جی ہاں، ایک راستہ ایسا ہے لیکن ہمارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ ہم زیلیونی جائیں اور اس کے بعد صبح سے پہلے ہی پسچانی لوٹ آئیں۔ واپس نہ پہنچوں گا تو لوگ سوچیں گے کہ ابا کی طرح میں بھی جانے کہاں چلا گیا۔ کہیں گے کہ ہمارا سارا خاندان ہی ناقابل اعتبار ہے۔"

پروشکا کی باتیں سن کے قائپ کو زیلیونی روانہ ہو جانے کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ خود کشتی چلائے گا اور اسے کسی بھی پتھر یا چٹان سے ٹکرانے نہ دے گا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کو کسی نے بھی زیلیونی کا راستہ نہیں سمجھایا تھا جیسے سب لوگوں کو احساس ہو گیا ہو کہ وہ وہاں کس لئے جا رہا ہے۔ یہ نیک لوگ چاہتے ہی کب ہیں کہ وہ مچھیروں اور شکاریوں کی دنیا سے چل بسے۔ اس کی زندگی ان لوگوں کے لئے کبھی بوجھ تو ثابت نہیں ہوئی تھی...

قائپ جانتا تھا کہ پسچانی واپس ہونے کے بعد مچھلیوں کا شکار ختم ہونے تک اسے وہاں سے نکلنے کا موقع ملنے سے رہا۔ نیپیس پہریداروں کو ہدایت کر دے گا کہ بوڑھے کو قطعاً کشتی نہ دی جائے۔ قائپ کو جزیرے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ نمک پیسنا، بوجھ لادنا اور جال بننا پڑے گا۔ وہ کام کرتا رہے گا یہاں تک کہ ایک زور ٹھوکر کھاکے زمین پر ڈھیر ہو جائے گا...

بجاتے گزر رہے تھے۔ ان کی آوازوں کی گونج قائپ کو دوزخ کی چیخ پکار جیسی معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن اس وقت قائپ موت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے دل میں زندہ رہنے کی پہلے سے زیادہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ دراصل اسے اس رات اور کل کے دن کی بہت ضرورت تھی۔

"کوئی شخص سمندر میں پانی کے بغیر کتنا وقت گزار سکتا ہے؟" پروشکا نے اپنے والد کی فکر کرتے ہوئے پوچھا۔

"انسان پانی کے بجائے مچھلی سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے" قائپ نے جواب دیا۔

"لیکن تھکن کے باعث اس کی کیا حالت ہو جائے گی؟"

"ارے نہیں۔ انسان تھکن سے چور ہو یا نہ ہو، سمندر کی لہریں اس کی کشتی کو ساحل تک پہنچا ہی دیں گی۔"

"اور سمندری پتھر؟ زیرآب چٹانیں؟" پروشکا نے نامکمل جملوں میں پوچھا۔

"سمندری پتھر صرف بڑے جہازوں کے لئے خطرناک ہوتے ہیں، کشتیوں کے لئے نہیں..."

"آپ کا مطلب ہے کہ انسان سمندر میں مر نہیں سکتا؟ تو کیا؟.."

"سمندر میں مرتا وہ ہے جو خود اپنا دشمن ہوتا ہے" قائپ نے گول مول جواب دیا۔

"ابا تو خود اپنے دشمن کبھی بھی نہیں رہے" پروشکا نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کے اس نے پوچھا:

"آپ تھکے نہیں، قائپ چچا؟ سو جائیے۔ کل جب مچھلی کا شکار شروع ہو جائے گا تو کسی کو سونے کا موقع نہ ملے گا۔ شکار نہ ہوگا تو دوسرا کام تو نکل ہی آئے گا۔ ہمیں نمک پیسنے پر تو لگا ہی دیا جائے گا۔ کنارے پر بیٹھیں گے اور چکیاں گھما گھماکے مچھلیوں کا آٹا پیسیں گے... وہ چکیاں اس کام کے لئے موزوں بھی ہوں گی کہ نہیں؟"

قائپ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"خود ابا آقچی آئے ہوتے تو انہیں اچھا نمک مل جاتا۔ انہیں سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں نا۔ مجھے تو اچھا نمک نہیں ملا۔ کیا کروں؟.."

قائپ نے پروشکا کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا:

کو اپنی کشتیاں ڈبو دینے اور جال پھاڑ ڈالنے پر راضی کر لے۔ وہ چاھتے تھے کہ یہ چیزیں مچھیروں کی انجمن کو نہ ملیں۔ قائپ کو اپنے زخمی بیٹے کی یاد آئی جسے وہ آقچی سے لئے جا رھا تھا۔ تب بھی وہ راستہ بھول گیا تھا... اسے وہ دن بھی یاد آیا جب پسچانی میں کسی شخص نے مچھلیوں کی چوری کی تھی اور قائپ کو ٹیم لیڈر کی حیثیت سے عدالت میں جواب دینا پڑا تھا۔ اس کی طویل زندگی میں کوئی خاص ایسا معاملہ نہ تھا جس کا وہ جواز نہ پیش کر سکتا۔ عائشہ کے معاملے کے علاوہ اس نے باقی تمام معاملات میں انصاف اور ایمانداری کا ثبوت دیا تھا۔ کبھی ایک بات بھی تو ایسی نہیں کی تھی جس سے دوسروں کو دکھ پہنچتا...

اس کے برعکس وہ خود انصاف سے کام لیتے ہوئے دکھ جھیلتا رھا تھا، ھر معاملے میں دانشمندی نے اس کی مدد کی تھی۔

اتنے میں عائشہ کا معاملہ ایک بار پھر اس کے ذھن میں کروٹیں لینے لگا:

"اس کے بعد میں نے جزیرہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ لوگوں نے اس واقعے کی بنا پر مجھ پر کیچڑ اچھالنا یا لعنت بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل اس وقت تو کسی کو اس واقعے کا علم ھی نہیں تھا... اس کا علم تو جزیرےوالوں کو بہت دنوں بعد ھوا ھوگا... میرا خیال تھا کہ جھاڑیوں میں جو کچھ ھوا تھا اس کی ذمےداری ھم سب پر – مجھ پر، کریمبائے پر اور عائشہ پر عاید ھوتی ھے۔ میں پہلے بھی ڈرتا اور عائشہ کو متنبہ کرتا رھا تھا۔ اسی لئے میں اسے کریمبائے کی آمد پر گھر میں بند بھی کر دیا کرتا تھا۔ شاید عائشہ نے خود ھی کریمبائے کو موقع فراھم کر دیا تھا...

شام کو میں نے کھلے میدان میں بیٹھے ھوئے لوگوں کے پاس جاکے اعلان کیا کہ میں دوسرے کام پر جا رھا ھوں۔ میں جانتا تھا کہ میرے جانے کے بعد عائشہ کے کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کا سوال ھی نہ اٹھےگا۔ وہ میری واپسی کا انتظار کرےگی۔ اسے صرف اس صورت میں نجات ملےگی جب جزیرے کے لوگوں کو معلوم ھو جائے کہ میرا انتقال ھو گیا ھے...

صبح کو جب میں طویل سفر پر روانگی سے قبل سو رھا تھا،

زیلیونی پر اسے بہرحال پہنچنا ہی چاہئے! کسی نہ کسی طرح وہاں جانا ہی چاہئے!

مگر پھر پروشکا پر کیا بیتےگی؟ وہ صبح سے پہلے واپس نہ پہنچا تو قائپ اور پرملائی کو جوابدہ ہونا پڑےگا۔ مچھلیوں کے شکار کا زمانہ نہ ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ پروشکا راستہ بھول گیا۔ اس وقت تو پروشکا نمک لےکے جا رہا ہے جو مچھلیوں کو سکھانے کے لئے بہت ضروری ہے۔ پروشکا ٹھیک ہی کہہ رہا کہ لوگ اس کے سارے خاندان کو بدنام کرنے لگیں گے۔

ویسے بھی کسی بوڑھے آدمی کو آخر حق ہی کیا ہے کہ وہ زندہ لوگوں کو پریشان کرے۔ اس کی وجہ سے یرملائی تو پریشانی میں مبتلا ہی ہو چکا ہے!

قائپ نے پروشکا پر ایک نگاہ ڈالی اور اسے اندازہ ہوا کہ لڑکا تھک چکا ہے اور اس کے قدموں میں کھڑے رہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

اس نے چپو سنبھال لئے اور پروشکا نے سونے کی تیاری کرتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ سمندر میں ادھر ادھر نظر دوڑاتے رہئےگا کیونکہ ابا کی کشتی کسی بھی وقت سمندر میں نظر آ سکتی ہے۔

قائپ دیر تک پروشکا کے کروٹیں بدلنے کی آوازیں سنتا رہا۔ دراصل پروشکا کو اپنے والد کی فکر تھی اور وہ سو ہی نہیں پا رہا تھا۔

آخرکار اس کی آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کوئی برا خواب دیکھکے آہیں بھرتا ہوا جاگ اٹھا۔ اس نے بڑی پریشانی کے عالم میں سمندر پر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی خاص چیز نظر نہ آئی تو پھر سونے چلا گیا۔ قائپ اپنے خیالوں میں کھویا کھویا سا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اسے ڈر تھا کہ ماضی کی یادیں دوبارہ اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آئیں گی۔ ان سے بچنے کی کوشش میں اس نے دوسری باتوں کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اس جزیرے پر گیا تھا جہاں اب مچھلیوں کی دیکھ بھال سے متعلق نگراں چوکی قائم ہے اور جہاں کبھی مچھلیوں کے امیر تاجر قائپ کو اس مطالبے سے پریشان کرتے تھے کہ وہ مچھیروں

جیسے اظہار ہمدردی کرنا چاھتی ھوں۔ عائشه کوٹھری سے باھر آئی اور مجھے دیکھکر بوڑھیوں سے کہا: «اب انہیں اٹھانا چاھئے»۔ میں نے محسوس کیا که عائشه کے دل میں ھمدردی کا جذبه دم توڑ چکا تھا اور انتقام کے جذبے نے اس کی جگه لے لی تھی۔ یه جذبه بوڑھیوں کے مجھے مارنے پیٹنے سے پیدا ھوا تھا...

عورتیں کوٹھری کی دیواروں پر ٹنگا ھوا بھیڑ کا خشک گوشت اتارنے لگیں۔ اس اثنا میں عائشه نے مجھے قوت‌بخش شربت تیار کرکے دیا جس میں بھیڑ کی چربی اور سکساؤل کی پتیوں اور ایک گھاس کا عرق شامل تھا۔ میں نے اس سے آنکھیں چار کیں تو وہ چیخیں مار مارکے رونے لگی۔ ایسا لگتا تھا که خوف اور ترس کے جذبات سے اس کا دل بھر آیا ھے۔ لیکن بوڑھیوں کی پرمعنی نگاھوں کے مدنظر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑی اور میرے سینے پر بیٹھکے مجھے بددعا دینے اور کوسنے لگی...

بڑے بوڑھے قریبی میدان میں ریت پر بیٹھے ھوئے تھے جسے ھوائیں رات کے دوران دوسرے جزائر سے اڑاکے لائی تھیں۔ یه نرم ریت بوڑھوں کے دلوں میں سستی، لطافت اور اداسی کی کیفیت پیدا کر رھی تھی۔ «یہاں کی فضا کیسی گرم اور عمدہ ھے» مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ «جی ھاں، یه کسی کے بدن کی گرمی ھے۔ لوگوں کے جسموں کی گرمی ان کی موت کے بعد بیکار تھوڑی جاتی ھے» دوسری آواز آئی۔ «موت ھر چیز کو صاف کر دیتی ھے۔ انسان کی ریت صاف ھوتی ھے خواہ وہ زندگی میں بدکردار ھی کیوں نه رھا ھو...»

اتنے میں کسی نے میری طرف اشارہ کرتے ھوئے کہا: «اس کا باپ بھی بڑا منحوس تھا۔ میں گزشته سردیوں میں صحرا میں گیا تو مجھے وھاں اس کی لاش ملی۔ میں نے اسے ایک غار میں دفن کرنے کا فیصله کیا لیکن لاش کو جیسے ھی ھاتھ لگایا وہ بکھر گئی۔ میں یه دیکھکے دنگ رہ گیا که اس کی ریت بھی سفید رنگ کی تھی...»

وہ بوڑھے کالے رنگ اور روکھے مزاج‌والے تھے۔ ان کے چہروں پر بےشمار جھریاں تھیں اور آنکھیں اتنی تنگ تھیں که لگتا تھا وہ بھنوؤں سے دیکھتے ھیں۔ انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا اور میں ان کے سامنے سر جھکاکے کھڑا ھو گیا...

عائشه جزیرے کے اس حصے میں گئی جہاں بڑی بوڑھیاں سمندری پتھروں پر خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے ان کے قریب پہنچ کے زور سے چیخ ماری:

«میرا محبوب جا رہا ہے، میرا شوہر مجھے چھوڑکے جا رہا ہے...» شوہر کو رخصت کرنے کے لئے بیویوں کو اسی طرح چلانا چاہئے تھا۔ عائشه کی چیخ کے ساتھ ہی رخصت ہونے کے موقعے کی ایک مخصوص رسم شروع ہوئی جس میں مجھے بھی حصه لینا تھا...

ایک بوڑھی عورت نے عائشه کا ہاتھ پکڑکے اس سے دھمکیآمیز لہجے میں کہا:

«اسے ظالم کہو! اب وہ تمہارا ظالم شوہر ہوگا!»

عائشه یه برداشت نه کر سکی۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے اپنی آستین سے چہرے کو ڈھک لیا۔ لیکن بوڑھیاں اسے میرے گھر کے اندر ڈھکیلتے ہوئے کہے جا رہی تھیں: «چلو، کہو نا لڑکی۔ سب کو یہی کرنا پڑتا ہے...»

عائشه نے بوڑھیوں کی طرف دیکھا اور خوف‌زدہ ہو گئی۔ اسے ان کی آنکھوں میں انتقام کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ بوڑھیاں میری کوٹھری کے اندر آئیں۔ انہوں نے مجھے بیدار کیا اور اپنے کالے کالے، سوکھے سوکھے ہاتھوں اور پیروں سے مارنے پیٹنے لگیں۔ آخر مجھ سے کراہے بغیر نه رہا جا سکا۔ یه بوڑھیاں بےحد سوکھی سمٹی نظر آ رہی تھیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے ان پر کبھی شباب آیا ہی نہیں تھا، وہ اتنی بدصورت ہی پیدا ہوئی تھیں...

ان کے انتقام کا سبب دراصل میری جوانی تھی۔ جزیرے پر صرف مردوں ہی کو جوانی کی عمر پانے کی اجازت تھی۔ بوڑھیاں مارتے مارتے نڈھال ہو گئیں تو انہوں نے مجھے کوٹھری سے باہر نکالا۔ مجھے ان کا مقابله کرنے کا کوئی حق نه تھا۔ عام رسم ہی یہی تھی۔ جزیرے سے باہر جاتے وقت مردوں کے لئے اپنی بیویوں اور دوسری عورتوں کی مار کھانا ضروری تھا...

میں آرام کرنے کے لئے ریت پر لیٹ گیا۔ اس وقت صرف بھیڑیں ہی میرے پاس آکے مجھے چاروں طرف سے سونگھ رہی تھیں

آواز میں دوہرانے لگا: «میں اپنا گھر، جہاں میری پیدائش ہوئی تھی، چھوڑکے جا رہا ہوں... اگر میں اپنی بستی میں واپس نہ لوٹوں تو مچھلیاں مجھے کھا جائیں...»

میں ان الفاظ کو ادا کر رہا تھا اور بوڑھی عورتیں میرے منہ پر قبر کی گیلی ریت لیپ رہی تھیں۔ میں نے بڑھیا کے الفاظ دوہراتے ہوئے کہا: "اگر میں کسی شخص کی موت کا باعث بنوں تو میری آنکھیں آندھی میں پھوٹ جائیں..."

یہ سنتے ہی عائشہ جو بوڑھی عورتوں کے ساتھ یہ رسم انجام دے رہی تھی، سسکیاں بھر بھرکے رونے لگی... وہ مجھے مار رہی تھی اور چیخ چیخ کے کہہ رہی تھی: «مجھے معاف کر دو، معاف کر دو!» بوڑھیاں اسے مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ پاؤں پکڑکے معافی مانگے جا رہی تھی۔ میں اٹھا اور قبرستان سے سر پر پاؤں رکھکے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے ساحل پر پہنچا اور اپنی کشتی پر بیٹھکے تیزی سے چپو چلانے لگا۔ کشتی جزیرے سے دور ہوتی جا رہی تھی جہاں میں نے عائشہ کو چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ اکیلی زندگی بسر کرے، دکھ درد جھیلے، اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرے..."

۷

پروشکا سو رہا تھا لیکن کبھی آہیں بھرتا، کبھی ہاتھ پاؤں سمیٹ لیتا اور کبھی پھر پھیلا دیتا۔ وہ سمندر میں ہمیشہ اسی طرح سویا کرتا تھا۔ دراصل چاندنی کشتی میں داخل ہوکے اس کی نیند حرام کر دیتی تھی۔

پروشکا نے زیلیونی کو خواب میں دیکھا۔ کشتیاں اس جزیرے کے قریب آنے میں ناکام ہوکے کھنکتی ہوئی چاند کی طرف سفر کر رہی تھیں۔ وہ چاندنی کی سفید پٹی پر اوپر کی طرف اٹھتیں اور دھند میں غائب ہو جاتیں...

قائپ چپو چلائے جا رہا تھا۔ اس کے دل کی ٹیس ختم ہو چکی تھی۔

معمر عورتیں مٹی کے تھالوں میں گوشت لےکے آئیں اور بوڑھوں کے پاس بیٹھ گئیں۔ عائشه ایک تھال اٹھاکے سب کو گوشت پیش کرنے لگی۔ سب لوگ خاموشی سے مزے لے لےکے گوشت کھا رہے تھے اور ھڈیاں میرے پاس پھینکتے جاتے تھے...

کھانا ختم ہوگا۔ یه معمر افراد مسافر کی سلامتی کے لئے دعا مانگیں گے اور میں ھڈیوں کو اکٹھا کرکے اپنی کشتی میں رکھ لوں گا۔ یه ھڈیاں سفر ختم ھونے تک میری کشتی میں رکھی رھیں گی اور مجھے اپنے خاندان، آبائی سرزمین کی یاد دلاتی رھیں گی۔ میں اگر خاندان اور وطن کو فراموش کر دوں گا تو میری موت کے بعد میری لاش کو سمندر کی مچھلیاں کھا لیں گی...

گوشت سے پیٹ بھرکے بوڑھے میری طرف تکنے لگے۔ میں کمر جھکائے ھڈیاں اکٹھا کرکے ایک بوری میں رکھ رھا تھا۔ کبھی کبھی میری نظریں عائشه پر بھی پڑ جاتیں۔ میں خوش ھو رھا تھا که میں نے اس سے انتقام لے لیا۔ عائشه ادھ مری سی نظر آ رھی تھی جیسے اسے میرے مذموم منصوبے کا علم ھو...

اس نے چار بھیڑوں کی ھڈیوں سے بھری ھوئی بوری کو اٹھاکے کندھے پر لادنے میں میری مدد کی اور بوڑھی عورتوں نے مجھے وھاں سے بھاگ کھڑے ھونے پر مجبور کیا۔ میں بمشکل ھی دوڑ پا رھا تھا۔ متعدد بار تو گر بھی پڑا۔ آخرکار اس ٹیلے پر پہنچ ھی گیا جہاں خاندانی قبرستان واقع ھے۔ لوگوں نے موت کو محض اتفاقی چیز سمجھتے ھوئے قبرستان کے لئے ایک ویران جگه منتخب کی تھی۔ کسی کو خیال تک نہیں آیا تھا که اس جگه کو خوبصورت بنایا جائے اور قبرستان کی مستقل دیکھ بھال کی جائے...

میں کندھے پر بوری لادے ھوئے عائشه اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ جزیرے کے پہلے آدمی کی قبر کو تلاش کرنے لگا۔ ساری قبریں ایک جیسی تھیں اور کسی کو معلوم نه تھا که وہ قبر کہاں ھے۔ پھر ایک بڑھیا نے ایک قبر کی طرف اشارہ کیا: «یه رھی وہ قبر!» اور ھم سب اس کے پاس جاکے گھٹنوں کے بل جھک گئے...

ایک بڑھیا نے قبر پر مٹی کے برتن سے پانی انڈیلا اور باقی لوگ قبر کی ریت کو پانی میں ڈالنے لگے۔ پھر اس بڑھیا نے مجھ سے کہا: «میں جو کچھ کہوں اسے دوھراؤ!» اور میں آنکھ بند کرکے دردناک

وقت شروع ہو سکتا ہے۔ نمک پیسنے کا کام شکار سے قبل ہی مکمل نہ ہوا تو سب کو تکلیف اٹھانی ہوگی۔ جب شدید گرمی سے سڑتی ہوئی سبز رنگ کی مچھلیوں کو ریت میں گاڑ دیا جائےگا اور بھوکے کتے مچھلیوں کی آنتوں کو سڑکوں پر پھیلا دیں‌گے تب یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ نمک تیار نہ ہونے میں کس کا قصور ہے۔

قائپ نے ٹھنڈی سانس بھری اور ایک بار پھر خیالوں میں کھو گیا خواہ ان سے دل میں درد ہی کیوں نہ پیدا ہو۔

"میں نے زیلیونی کے قریب واقع جزیرے پسچانی پر پہنچ‌کے نئی زندگی شروع کر دی۔ میں نہیں چاھتا تھا کہ جزیرےوالوں کی نگاھوں میں اجنبی ھی بنا رھوں اس لئے بڑے بوڑھوں کے مشورے سے ایک مقامی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ مجھے لوگ ھنس‌مکھ اور بےفکر نوجوان تصور کرنے لگے۔ خوب جی بھرکے قہقہے لگاتا، سمندر میں تیرتے ہوئے گیت گاتا اور ھم‌عمر نوجوانوں سے کشتیاں لڑتا۔

میں نے آقچی کے بازار میں لومڑی کی کھال کی گرم ٹوپی اور زرد رنگ کے لانگ بوٹ بھی خرید لئے جنھیں پہن‌کے ساحلی علاقے میں گھومتا پھرتا اور حسیناؤں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا رھتا۔

میری عجیب و غریب شرارتیں جزیرےوالوں کو بری نہیں لگتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے: «ذرا زیادہ عمر کا ھوگا تو یہ ساری شرارتیں خود ھی ختم ھو جائیں‌گی اور خاندان کا ذمےدار سرپرست اور اچھا مچھیرا بن جائےگا...»

اس کے بعد پھر کبھی زیلیونی کو دیکھنا نصیب نہ ھوا۔ گھر بار کی فکروں میں تیزی سے وقت گزرتا رھا۔ بعد میں میرے ایک بیٹا پیدا ھوا اور سب سے بڑی بات یہ ھوئی کہ نیا زمانہ آ گیا۔ نیا زمانہ اپنے دامن میں بہت سے ایسے واقعات لےکے آیا جنھوں نے مجھے اپنے اور دوسروں کے جذبات و اقدامات کو بالکل مختلف نگاھوں سے دیکھنے پر مجبور کر دیا...

مچھلی کے امیر تاجروں اور سودخوروں کا دور ختم ھو گیا اور اس کے خاتمے کے ساتھ غربت اور دھوکےبازی بھی ختم ھو گئی۔ جزائر کے درمیان برادرانہ روابط قائم ھوئے اور جو لوگ پہلے ایک

کشتی جو اب تک نیم تاریکی میں چھپی ہوئی چل رہی تھی، اس سے باھر آکے چاندنی میں آگے بڑھنے لگی۔

چاندنی دور ساحلوں سے نمودار ھوکے سمندر میں داخل ھوئی جس کی وجہ سے پانی کہیں خاکی مائل سبز اور کہیں سفید اور دھوئیں جیسا نظر آنے لگا۔ چاندنی پسچانی پر پھیل گئی تھی۔ چاندنی سے پسچانی کی لنگرگاہ میں بندھی ھوئی کشتیوں کے قریب سوئے ھوئے لوگوں کے چہرے چمک اٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک سفید پل نے زیلیونی، ھزارھا دوسرے جزائر، استیپیوں اور شہروں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ھو، جیسے کرۂ ارض کے سارے کے سارے افراد اخوت کے اٹوٹ رشتوں میں بندھ گئے ھوں...

قائپ کی کشتی بھی اس راستے پر بڑھ رھی تھی۔

وہ ھاتھ سنبھال کے بہ‌آسانی چپو چلا رھا تھا۔ اس خیال سے خوش تھا کہ صبح کو کشتی پسچانی پہنچ جائےگی اور پروشکا اپنے عزیزوں سے جا ملےگا۔

پھر قائپ نے سوچا کہ خود اس کا کیا انجام ھوگا؟ پسچانی پر وہ کیا کرےگا؟ اسے کشتی کیسے ملےگی؟ وہ زیلیونی کیسے روانہ ھوگا؟

ھو سکتا ھے کہ دوسری دنیا میں جا بسنے کا وقت ابھی نہ آیا ھو؟

ایسا لگتا ھے کہ اس کی راہ میں حائل ھونےوالی رکاوٹیں اسے قوت دے رھی ھیں۔

اسی لئے تو پروشکا تھکا ھوا سو رھا ھے اور قائپ سوئے بغیر، کسی تھکن کے احساس کے بغیر چپو چلا رھا ھے- وہ زندگی کے لئے جدوجہد کر رھا ھے۔ اس جدوجہد کے سامنے موت پیچھے ھٹتی جا رھی ھے... اس کے دل میں اپنے پیروں پر کھڑے ھونے کی خواھش کروٹیں لے رھی ھے۔ آخر تو وہ ختم ھوگی ھی نا؟

اس کا مطلب یہ ھے کہ اسے اپنی پوری قوت سے کام لےکے زیلیونی پہنچنا ھے۔ وہ کل روانہ ھوگا۔ کشتی نہ مل سکی تو تیرتے ھوئے اس جزیرے پر پہنچنے کی کوشش کرےگا۔

قائپ نے سوچنے کا سلسلہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب اسے کشتی کو پسچانی تک پہنچانا ھے کیونکہ مچھلیوں کا شکار کسی بھی

تو ھے" اس نے افق کی طرف ھاتھ سے اشارہ کیا جہاں پسچانی نظر آ رھا تھا۔

"سنو، تم کشتی اپنے ابا کے حوالے کر دینا۔ ان سے کہنا کہ مجھے..." قائپ کہنا چاھتا تھا کہ اسے افسوس ھے کہ اس کی وجہ سے یرملائی کو تکلیف اٹھانی پڑی۔ پھر اس نے سوچا کہ یرملائی سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ھی سب کچھ سمجھ لےگا۔

"مطلب یہ ھے کہ آپ جا رھے ھیں؟" پروشکا نے رنجیدہ ھوکے پھر سے پوچھا۔

قائپ کیوں جا رھا تھا یہ پوچھنے کی اس نے ھمت نہ کی کیونکہ وہ نہیں چاھتا تھا کہ قائپ اسے بےادب سمجھے۔

## ۸

قائپ کو اپنے جس رشتےدار کا خیال آیا وہ مچھیروں کی انجمن کا چیرمین آرالوف تھا۔ اس کی کوٹھری بھی دوسرے ماھیگیروں کی کوٹھریوں جیسی ھی تھی، ریت میں دھنسی ھوئی سی۔ دیواریں ھواؤں سے متاثر ھو چکی تھیں اور سمندری پودوں کا چھپر گھاس کا الجھا ھوا ڈھیر معلوم ھوتا تھا۔

مچھیروں نے سمندری پودے اکٹھا کرکے چھٹی کے دن چیرمین کی کوٹھری کا چھپر تیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن آرالوف نے منع کر دیا۔ "شکار ختم ھو جانے کے بعد مرمت مناسب رھےگی" اس نے مچھیروں سے کہا تھا...

سیرنی کے لوگوں کو معلوم تھا کہ آرالوف چیرمین کا عہدہ چھوڑنا چاھتا ھے۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہناکے رھےگا اسی لئے انہوں نے یہ مشورہ دینے کی ھمت نہ کی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دے۔ ھاں، یہ ضرور طے کر لیا تھا کہ آرالوف کو وھاں سے جانے کا موقع نہ دیا جائےگا۔

آرالوف پسچانی کا رھنےوالا تھا لیکن اب وہ وھاں بہت ھی کم جاتا تھا۔ کوئی کام ھوتا تو اپنے نائب کو بھیج دیتا۔ دراصل اسے معلوم تھا کہ پسچانی کے لوگ اسے ناپسند کرتے ھیں۔

دوسرے پر اعتماد نہ کرتے ہوئے الگ تھلگ رہتے تھے انہیں مشترکہ محنت نے مچھیروں کی ایک انجمن کی شکل میں متحد کر دیا۔۔

یرملائی نے مجھے راضی کر لیا کہ ہم لوگ آقچی چل کے کریم‌بائے اور اس کے دوستوں سے انتقام لیں۔ یرملائی نہ ہوتا تو میں یہ قدم اٹھانے کی ہمت نہ کر پاتا کیونکہ خود اپنے افسوس‌ناک تجربے کی بنا پر جانتا تھا کہ انتقام برائی سے بچنے کا اچھا طریقہ نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جلد یا بہ‌دیر ہر انسان کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ دل صاف کرنے کا موقع اس دنیا میں نہیں ملتا تو دوسری دنیا میں تو بہرحال ملتا ہے۔۔۔

میں یرملائی کے ساتھ آقچی پہنچا تو ہمیں معلوم ہوا کہ کریم‌بائے کے باپ کو کارخانے کے مزدوروں نے جن پر وہ سخت مظالم ڈھاتا رہا تھا، ہلاک کر دیا ہے۔ خود کریم‌بائے کو جلاوطن کرکے کسی غیرآباد جزیرے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اب تو اسے اپنے گناہوں کے متعلق سوچنے کا وقت مل ہی گیا ہوگا!۔۔"

چاندنی سمندر کی سطح سے رفتہ رفتہ غائب ہونے لگی۔ جھٹپٹا ہو رہا تھا۔

پسچانی پہنچنے کے لئے اب صرف ایک ہی جزیرے کے قریب سے گزرنا باقی تھا۔

یہ خوابیدہ اور خنک جزیرہ اچانک بائیں جانب دکھائی دیا۔ قائپ نے سوچا کہ اسے جزیرے پر اترکے اپنے ایک رشتےدار سے کشتی مانگ لینی چاھئے۔

"پروشکا!" اس نے پکارا۔

پروشکا جس کی نیند ختم ہو چکی تھی اور اب صرف اونگھ رہا تھا، قائپ کی آواز سن‌کے تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے، سیرنی آ گیا!" پروشکا نے ندامت کے ساتھ کہا جیسے اسے شرم محسوس ہو رہی ہو کہ وہ پورے راستے سوتا رہا اور بوڑھے کو کشتی کھینی پڑی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ کشتی اپنا رخ بدل‌کے سیرنی کی طرف جا رہی ہے تو اس نے حیرت‌زدہ ہوکے پوچھا:

"قائپ چچا، کیا آپ پانی لینا چاھتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں یہیں اتر جاؤں‌گا۔۔۔ یہاں سے پسچانی قریب ہی

جزیرے پر پہنچتے ہی اسے اپنی کوٹھری میں گھس جانے کی جلدی رہتی تھی۔

... آرالوف بڑے اور چھوٹے کہیں زیادہ جزائر کا سربراہ تھا۔ ان سب کا کھڑے کھڑے معائنہ کرنے کے لئے بھی ایک ہفتہ درکار ہوتا۔

کوئی بھی مہینہ ایسا نہیں ہوتا تھا جب ہواباز آرالوف کو کسی نئے جزیرے کے وجود میں آنے کی اطلاع نہ دیتے ہوں۔ یہ جزیرے سمندری پتھروں یا چٹانوں سے پیدا ہوتے تھے۔ آرالوف خبر پاکر نئے جزیرے کو دیکھنے جاتا، اس کی پیمائش کرتا، بھاؤ کا جائزہ لیتا، اس کے ارد گرد سمندر کی گہرائی کا تعین کرتا اور مستقبل میں اس کے استعمال کے انتظامات کرتا۔

نیا جزیرہ وجود میں آتا ہے تو مچھلیوں کے غول اپنا راستہ بدل دیتے ہیں اور آرالوف کو اس راستے کو تلاش کرنا اور حساب لگانا پڑتا ہے کہ اب مچھیرے کتنی مچھلیاں پکڑ سکیں گے۔

... قائپ آرالوف کی کوٹھری کی باہری دھلیز پر بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ پھر اس نے تاریکی میں آرالوف کو لڑکھڑاتے ہوئے کوٹھری کی طرف آتے دیکھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا...

دھلیز پر بیٹھے ہوئے اجنبی بوڑھے کو دیکھکے اس نے دریافت کیا:

"تم کون ہو، بابا؟"

"میں ہوں قائپ، تمہاری ماں کا چچیرا بھائی..."

"تو اندر آ جائیے نا!"

قائپ ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو آرالوف سو جائے اور کل پوری صبح بلکہ تمام دن سوتا ہی رہے۔

"مجھے ایک کشتی کی ضرورت ہے، چیرمین" قائپ نے سیدھے سادے انداز میں کہا تاکہ آرالوف کو اس کی التجا کی صداقت پر شک نہ ہو۔

"کیا کہا آپ نے؟" آرالوف غصے میں آکے بولا۔ پھر وہ ہنس پڑا اور کوٹھری کے دروازے کی طرف مڑکے چلایا: "ارے بیوی، سنا تم نے ہمارے رشتےدار کو کشتی کی ضرورت ہے، کشتی کی!"

"تو دے دو نا" آرالوف کی بیوی نے جو نیند سے جھومتی کچھ بڑبڑاتی ہوئی کوٹھری سے باہر نکلی تھی، کہا۔

وہ کسی جزیرے میں جاتا تو ماہی‌گیر ٹیموں کے لیڈر، پہریدار اور اگواکار مچھیرے سب اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں جاتے، اسے اپنی کامیابیوں سے متعلق معلومات فراہم کرتے اور اپنی کشتیاں اور جال دکھاتے تھے۔ لیکن پسچانی کی صورت حال بالکل برعکس تھی۔ یہاں نہ کوئی اس کا خیرمقدم کرتا، نہ دورے میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ سارے کے سارے مچھیرے ساحل پر بیٹھے گپ‌بازی میں مصروف رہتے جیسے انہوں نے آرالوف کو دیکھا ہی نہ ہو۔ آرالوف تنہا ہی جزیرے میں کشتیوں اور جالوں کا معائنہ کرتا، سکساؤل کی جھاڑیوں سے گزرتا اور بھوکے کتوں سے بچنے کے لئے انہیں ڈھیلے مارتا رہتا۔ اس طرح وہ جزیرے کی تمام املاک کو دیکھ بھال‌کے اپنی موٹر بوٹ پر بیٹھتا اور سیرنی کے لئے روانہ ہو جاتا۔

پسچانی کے مچھیروں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی کہ آرالوف جو معمولی مچھیرا تھا، جس کے باپ دادا بھی مچھیرے تھے، جسے انہوں نے سمندر میں تیرنا اور مچھلیاں پکڑنا سکھایا تھا اور جس کی شادی بھی انہوں نے ہی کرائی تھی، اب ان کا سربراہ بن گیا تھا۔

وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ آرالوف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ خود جال کھینچ لیتے ہیں، مچھلیوں کے غولوں کو تلاش کر لیتے ہیں اور سمندر میں جتنی مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں اتنی پکڑ لیتے ہیں۔ کیا وہ خود نہیں جانتے کہ مچھلیاں ان کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں؟ مچھلیاں نہ ہوں‌گی تو آرالوف کو تھوڑی، خود انہی لوگوں کو بھوکوں مرنا پڑے‌گا۔

ہاں، آرالوف کے بجائے کوئی دوسرا شخص انجمن کا چیرمین ہوتا تو وہ اس کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرتے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال‌کر دیکھتے کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہے کہ نہیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تو خود بھی مسکرانے لگتے۔ چیرمین کوئی ہنسی مذاق کی بات کرتا تو وہ بھی فوراً ہنسنے لگتے۔

جزیرےوالے سابق چیرمین سپاروف کو نہیں بھولے تھے۔ وہ نہیں پسند کرتا تھا کہ کوئی مچھیرا اس کے سامنے کھڑا ہوکے مسکرائے۔

جاگنے کے بعد لوگوں کے کھانے سے گرے پڑے ٹکڑوں کو چگتے پھر رہے تھے۔

پرندے خاموش ہو گئے تو مچھلیوں کے غول کا پتہ لگانےوالے طیارے کی آواز جزیرے کے اوپر سنائی دی۔

ماھیگیروں نے سر اوپر اٹھاکے، دھوپ سے آنکھوں کو بچانے کے لئے ان کے اوپر ھاتھ رکھکے نگراں طیارے کو امید بھری نگاھوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ انہیں توقع تھی کہ آج مچھلیوں کے غول کا پتہ چل جائےگا اور اچھا خاصا شکار ھوگا۔

طیارے نے لوگوں کے سروں کے اوپر دو بار چکر لگایا اور بازو ترچھے کرکے انہیں سلامی دی۔ وہ بہت ھی نیچے آکے سمندر کی سطح کے قریب اڑ رھا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے سمندر کا پانی پینا چاھتا ھو۔

اتنے میں ٹیم لیڈر آکے مچھیروں کو کچھ سمجھانے لگا۔ وہ ھر ایک کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھ رھا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے ان سے باتیں نہیں کر رھا ھے بلکہ ھدایات دے رھا ھے۔

مچھیرے اثبات میں سر ھلاکے ساحل پر چلے گئے۔ وہ اپنے اپنے چپو سنبھالے اور پینے کے پانی کے برتن لئے ھوئے اس جگہ سے گزر رھے تھے جہاں قائپ کھڑا ھوا تھا۔ وہ اپنی کشتیوں کو رسیوں سے کھولنے اور جال اتارنے میں بڑی عجلت سے کام لے رھے تھے۔

ٹیم لیڈر بستی میں گھوم پھرکے دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دے رھا تھا، وہ کسی سے کچھ التماس کرتا، کسی کو کچھ سمجھاتا اور کسی کو دھمکی دیتا۔

قائپ نے سوچا کہ اب مچھلیوں کا شکار شروع ھونے ھی کو ھے اور وہ جلدی جلدی آرالوف کی کوٹھری میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ چیرمین ریڈیو پر باتیں کر رھا ھے۔

وہ اپنے اعلا عہدیداروں سے چیخ چیخ کے کہہ رھا تھا:

"خدا کے لئے مجھے ڈرائیے دھمکائیے نہیں! شکار کا سارا بار تو ھم ھی پر ھوگا نا؟ جی نہیں، میں نے نہیں کہا کہ آپ سستی کر رھے ھیں۔ خدا بچائے!.. آپ خود ھی جانچ کر لیجئے۔ خود ھی۔ سمندر کیسا ھے؟ پرسکون ھے۔ اچھا تو آئیے!"

بات چیت ختم کرکے آرالوف، قائپ کی طرف دیکھے بغیر کرسی

"فیصلہ کر چکی ہو کیا؟ کسی رشتےدار کو مجھ سے نہ کشتی ملےگی، نہ مچھلی" یہ کہہکے آرالوف کوٹھری میں داخل ہوا اور بستر پر لیٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تک ناک سڑکتا اور کروٹیں بدلتا رہا، پھر سو گیا۔

"جی بھرکے سو لیں‌گے تو ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑ جائےگا" آرالوف کی بیوی نے کہا اور دھلیز پر کھڑے ہوئے قائپ کو وھیں چھوڑکے سونے کے لئے کوٹھری میں چلی گئی۔

قائپ جزیرے اور بستی کو دیکھتا ہوا ساحل کی طرف چل دیا۔

سویرا طلوع ہو رہا تھا۔ رات کی بھاپ چھتوں سے اٹھ رہی تھی اور سمندر کے اوپر کہرا باریک نقاب کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہلکی بارش ہوئی ہو اور اس نے سارے جزیرے کو صاف کر دیا ہو تاکہ سڑتی ہوئی مچھلیوں کی بدبو باقی نہ رہے۔

قائپ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اس کی داڑھی بکھری بکھری سی تھی۔

اسے سمندر کے سانس لینے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ موجیں بھاپ سے ہمکنار ہوکے بل کھا رہی تھیں۔ تھوڑی ھی دیر بعد موجوں کی چھپا چھپ ختم ہو گئی۔ نئے دن کا منتظر سمندر خاموش ہو گیا۔ ایک سخت اور دشوار دن شروع ہو رہا تھا۔

پل بھر تک ساحل پر سنّاٹا چھایا رہا۔ پھر دروازوں اور کھڑکیوں کے کھلنے کی آوازیں ابھرنے لگیں، ابلتے ہوئے پانی کی سرسراھٹ سنائی دینے لگی۔ چولھوں کا دھواں آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا - ماھی‌گیر بیدار ہو گئے۔ ان کی بندھی ہوئی کشتیاں بےچینی سے لہروں پر بل کھا رہی تھیں جیسے وہ بھی انسانوں کی طرح شکار شروع ہونے کے خیال سے گھبرا رہی ہوں۔

لوگوں کی بیداری کے تھوڑی ھی دیر بعد پرندوں کی چہچہاھٹ فضاؤں میں گونجنے لگی۔ چیلیں، بھورے تیتر اور بگلے جھاڑیوں میں بھاگتے ہوئے اپنے پر ریت پر پھڑپھڑا رہے تھے۔

مچھلیاں سمندر کی گہرائیوں میں چلی جاتی تھیں تو پرندے ان کو مشکل ھی سے پکڑ پاتے تھے اور وہ جزیرے میں لوگوں کے ساتھ رھتے ہوئے انھی سے غذا حاصل کر رہے تھے۔ وہ صبح کو

اچانک وہ سمٹ سا گیا۔ کوئی اسے جھانک رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کشتی میں اکیلا نہیں ہے۔

کشتی کے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی ایک نوجوان عورت کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں جس سے اسے سخت گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

وہ ان دنوں میں اتنے زیادہ لوگوں سے مل چکا تھا کہ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ اکیلا ہی رہے۔ دراصل اسے اپنے آپ سے، اپنے ضمیر سے کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔

نوجوان ملاح بار بار اپنے کیبن سے جھانک جھانک کے ہونٹوں سے چت چت کی آوازیں نکالتا تھا۔ وہ اس طرح جانے قائپ کی یا اس عورت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کا کوشاں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت پتوار چھوڑکے قائپ کو تکلیف دیتے ہوئے اس کے بکسوں کے قریب سے گزرتا اور ناؤ کے آخری سرے پر پہنچ کے سمندر کو دیکھنے لگتا ہے۔

قائپ نے سوچا کہ ملاح اس دراز قامت سفید بالوں اور غیرروسی چہرے کی عورت سے باتیں شروع کرنے کے لئے دراصل کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہے۔

بوڑھے کو ملاح کی ان اضطرابی سرگرمیوں پر کچھ ترس سا آیا۔

اتنے میں عورت نے جو لیتھونیائی قوم سے تعلق رکھتی تھی اور ڈاکٹر کی اسسٹنٹ تھی، قائپ سے کچھ پوچھنے لگی۔ الفاظ کچھ روسی تھے، کچھ لیتھونیائی۔

وہ اس جگہ اور اپنے آبائی وطن کے سمندر سے مختلف اس سمندر کے متعلق بوڑھے سے کچھ بتانے کی درخواست کر رہی تھی۔ آقچی میں وہ کسی سے باتیں نہیں کر سکی تھی کیونکہ سارے کے سارے لوگ مچھلیوں کے غول کو تلاش کرنے کی جلدی میں تھے۔ انہوں نے اس سے یہ کہہ کر کہ اسپتال میں تمام باتیں معلوم ہو جائیں گی، اسے فوراً ہی کشتی میں بٹھاکے زیلیونی روانہ کر دیا تھا۔ اب وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہاں پہنچ کے وہ مقامی رسوم و رواج سے واقفیت حاصل کر سکے گی نا؟ اس نے کہا کہ اسے بڑی خوشی ہے کہ بوڑھے بابا سے ملاقات ہو گئی۔ بابا اسے ذہین اور معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بابا کی عمر کیا ہے؟ وہ کسی بیماری میں تو نہیں مبتلا ہیں؟

پر بیٹھا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے قائپ سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تو شکار شروع ہی ہو جائےگا..."

"اپنی ماں کی خاطر میری مدد کرو نا..."

"آخر آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"مجھے زیلیونی جانا ہے۔ دوپہر تک واپس آ جاؤںگا۔ مجھے ایک کشتی دے دو، چاہے وہ خراب حالت ہی میں کیوں نہ ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"زیلیونی جانا ہے! مگر سنئے، اس کے لئے کشتی کی کیا ضرورت ہے؟ ایک گھنٹے بعد آقچی سے ایک مال‌بردار کشتی یہاں آنےوالی ہے جو زیلیونی جائےگی۔ آپ اس پر چلے جائیےگا۔ ٹھیک ہے نا؟ جائیے، ساحل پر اس کا انتظار کیجئے۔"

"تم بھی کتنے ذہین آدمی ہو۔ بہت عمدہ فیصلہ ہے یہ" قائپ حیرت میں پڑ گیا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا لنگرگاہ کی طرف چل دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد طبی نشان‌والی ایک کشتی آ گئی جس سے لاؤڈ اسپیکر پر آواز گونجی:

"کسی کو اسپتال جانا ہے؟"

قائپ جو اونگھنے لگا تھا، فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس ڈر سے کہ ملاح اسے لئے بغیر ہی زیلیونی نہ چلا جائے، بید کی جھاڑیوں سے گزرتا ہوا اس کشتی کی طرف دوڑا۔ ملاح شائستہ نوجوان ثابت ہوا۔ اس نے کشتی پر سوار ہونے میں قائپ کی مدد کی اور سیلے ہوئے بکسوں پر قائپ کے لئے جگہ بناکے وہاں ایک ٹاٹ بچھا دیا تاکہ بوڑھے کو نزلہ نہ ہو جائے۔

اور کشتی زیلیونی کے لئے روانہ ہو گئی۔ قائپ نے بکسوں پر بیٹھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا: "خدا کا شکر ہے کہ بوڑھا چل ہی دیا" اس نے فیصلہ کیا کہ کسی چیز کے متعلق سوچے بغیر سو جانے کی کوشش کرےگا۔

اسے کمزوری محسوس ہو رہی تھی، خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ دو راتیں پلک جھپکائے بغیر گزر چکی تھیں پھر بھی اس کی حالت ٹھیک ہی تھی۔

لیتھونیائی عورت اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

ملاح اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا کیونکہ اس جگہ سمندر پرسکون نہیں تھا اور کشتی ادھر ادھر ڈگمگانے لگی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سمندر میں سورج گرہن سے قبل کی جیسی بےچینی پیدا ہو گئی ہو۔

پھر ملاح کو شور و غل سنائی دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں دور لوگ گھبرائے ہوئے زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اتنا زیادہ شور تو ہزاروں لوگ ہی ایک ساتھ مل‌کے پیدا کر سکتے ہیں۔

اس نے دوربین افق پر جماتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا:

"مچھلیوں کا غول مل گیا؟"

اس اثنا میں اسے اپنے قریب ہی بہت سی کشتیاں، موٹر بوٹ، مچھلی بردار جہاز اور دوسرے جہاز نظر آئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کشتیاں اور جہاز کسی کا راستہ روکنے کے لئے صف‌آرا ہو رہے ہیں۔ ایک صف میں کھڑے ہونے کے بعد وہ سب اچانک ایک دوسرے سے کچھ الگ ہوکے دوڑنے سے لگے جیسے کسی غیرمرئی شے نے انہیں خوف‌زدہ کر دیا تھا۔

ملاح مڑکے چلایا:

"مچھلیوں کا شکار شروع ہو گیا! غول آ رہا ہے! ارے۔ رے۔ رے!"

مگر اسی لمحے اسے اپنی حالت پر افسوس ہوا کیونکہ جھاگ سے ڈھکی ہوئی ایک موٹر بوٹ پہلو سے نکل‌کے اس کی کشتی کے قریب آئی اور اس پر سے اسے اپنی کشتی روک دینے کا حکم دیا گیا۔

اس کی کشتی ایک اچانک جھٹکا کھاکے ٹھہر گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" موٹر بوٹ پر سے دریافت کیا گیا۔

مچھلیوں کے نگراں افسر علی‌بابا کو دیکھتے ہی ملاح کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ویسے تو اس کا کام علی‌بابا کے کام سے مختلف تھا اور وہ علی بابا کا ماتحت نہیں تھا پھر بھی وہ اس کے آ جانے سے خوف‌زدہ ہو گیا۔

اِس سمندر میں کون سی مچھلیاں پائی جاتی ہیں؟ اس نے سنا ہے کہ یہاں زہریلی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ بابا کو معلوم ہی ہوگا، کیا مقامی لوگ کئی لڑکیوں سے شادی کر سکتے ہیں؟ اس لعنت کا خاتمہ ہو چکا ہے کہ نہیں؟ کیا بابا اس علاقے میں عرصے سے آباد ہیں؟ اسے کیا کرنا چاہئے تاکہ اس کی کسی بات سے جزیرے کے لوگوں کے قومی وقار کی توہین نہ ہو؟ کیا بابا بالدونیس نام کے شخص سے واقف ہیں؟ بالدونیس ماہر ارضیات ہیں اور برسوں سے اس جگہ کام کر رہے ہیں۔ بابا اس کی مدد کریں گے نا؟ وہ اس جگہ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی اور بری طرح گھبرا رہی ہے...

عورت قائپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے باتیں کر رہی تھی۔ قائپ کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا لیکن اس کا طرز گفتگو اسے بہت اچھا لگا۔ وہ عورت کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوکے اس کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے دور دراز سمندر کا کوئی گیت گا رہی ہو۔

قائپ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ عورت مشکلات کا شکار ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔

ملاح بھی اس لیتھونیائی عورت کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح گھبرایا ہوا ادھر ادھر چل پھر رہا تھا جیسے اس اقدام سے عورت کو کچھ مدد مل سکتی ہو۔ آخر اس نے یہ سوچ کے کہ وہ پیاسی ہوگی، اس کو پانی لاکے دیا۔

عورت نے ملاح کا شکریہ ادا کرکے پانی کا ایک گھونٹ پی لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ بوڑھا اور ملاح اس کی بولی خاک بھی نہیں سمجھ پا رہے ہیں اور اداس ہوکے خاموش ہو گئی۔

ملاح نے سوچا کہ یہ عورت بھی کتنی پراسرار ہے اور اپنے کیبن میں چلا گیا۔

وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے۔ کشتی سیٹی بجاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، سمندر کی لہروں کو ابھار رہی تھی۔

قائپ کو بڑا دکھ ہوا کہ وہ عورت کی مدد نہ کر سکا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی شخص کی مدد نہیں کر سکا تھا۔

جواب دیا۔ علی‌بابا حیرت سے اس کی باتیں سننے لگا۔ وہ چاھتی تھی کہ خود علی‌بابا اسے اسپتال تک پہنچا دے... اسے امید تھی کہ علی‌بابا سے اسے بہت سی معلومات حاصل ہو سکیں‌گی... کیا وہ نہیں جانتا کہ لیتھونیا سے آیا ھوا بالدونیس نامی شخص اب کہاں رھتا ھے؟

علی‌بابا کو اپنی موٹربوٹ آگے بڑھانے کی جلدی تھی۔ اس نے ھاتھ اٹھاکے عورت کو سلام کیا اور اشارے سے سمجھایا کہ سب کچھ ٹھیک ھی ھوگا۔ پھر اس نے ملاح سے مخاطب ھوکے کہا:

"واپس روانہ ھو جاؤ!"

"جی اچھا، جا رھا ھوں!" ملاح نے خوش ھوکے جواب دیا۔

اس اثنا میں علی‌بابا کی آواز سنائی دی:

"بوڑھا میرے ساتھ رھےگا۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ھے نا؟"

"جی نہیں، میں ان سے واقف نہیں ھوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ زیلیونی پہنچا دو..."

"اچھی بات ھے۔ شکار میں اس کی شرکت ضروری ھوگی۔"

قائپ علی‌بابا کی موٹر بوٹ پر سوار ھو گیا لیکن علی‌بابا نے اس سے کچھ پوچھا نہیں جیسے وہ بوڑھے کو پہلی بار دیکھ رھا ھو۔ پوچھ گچھ کے لئے دراصل اس کے پاس وقت ھی نہیں تھا۔ اسے وھاں سے روانگی کی جلدی تھی۔

موٹر بوٹ میں قائپ کے علاوہ چار دوسرے بوڑھے بھی موجود تھے۔ وہ چاروں یوں پہلو بہ پہلو لیٹے ھوئے اونگھ رھے تھے جیسے بھائی بھائی ھوں۔ انہوں نے قائپ کو ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہ گوارہ کی۔

موٹربوٹ آخری چکر پورا کرکے چلنے کو ھوئی تو لیتھونیائی عورت کی آنکھوں میں حیرت کی چمک نمودار ھو گئی۔ علی‌بابا نے بوٹ کو موڑکے اس طرف کا رخ کیا جس طرف ماھی‌گیروں نے مچھلیوں کے غول کا شکار شروع کر دیا تھا۔

... تھوڑی ھی دیر بعد قائپ کو جال سنبھالے ھوئے لوگ اور کشتیاں نظر آئیں۔ ان سینکڑوں لوگوں میں قائپ کے بھائی - پسچانی جزیرے کے مچھیرے بھی شامل تھے۔

"اسپتال جا رہا ہوں، کامریڈ نگراں افسر۔ دوائیں، ایک ڈاکٹرنی اور ایک بوڑھے کو لےکر۔"

قائپ کے دل میں ٹیس سی اٹھی اور اس نے دعا مانگی کہ خدا اسے علی‌بابا سے محفوظ رکھے۔

موٹر بوٹ، کشتی کے پہلو سے ٹکراکے رک گئی۔ علی بابا اٹھ‌کے ملاح کو جس نے اس کے حکم کی خلاف‌ورزی کی تھی، گالی دینے ہی والا تھا لیکن کشتی میں لیتھونیائی عورت کو بیٹھے دیکھ‌کر اس نے اپنے غصے پر قابو پا لیا۔

"ارے، تمہیں حکم کا علم نہیں ہے کیا؟" اس نے ڈرے سہمے ہوئے ملاح سے پوچھا۔

"ہم تو صبح ہی صبح روانہ ہو گئے تھے، کامریڈ علی بابا... ڈاکٹرنی کو وہاں پہنچنے کی جلدی تھی" یہ کہتے ہوئے اس نے لیتھونیائی عورت کی طرف دیکھا جیسے اس سے اپنی بےقصوری کی تصدیق کرنے کی توقع رکھتا ہو۔

بدقسمتی سے عورت کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اس کا خیال تھا کہ دو دوستوں کی ملاقات ہوئی ہے اور وہ ایک دوسرے کو سلام کرنے کے لئے ٹھہر گئے ہیں۔

"یہ عورت کون ہے؟" علی بابا نے پوچھا۔

"میں انہیں اسپتال لیے جا رہا ہوں جہاں یہ کام کریں گی۔ بالکل اجنبی ہیں۔ انہیں ہماری زبان بالکل ہی نہیں آتی۔ ان کی بولی نہ میری سمجھ میں آئی، نہ ہی بوڑھے کی۔"

علی‌بابا ٹوٹی پھوٹی روسی میں عورت سے مخاطب ہوا:

"معاف کیجئےگا" عورت کو اس کی خوش‌اخلاقی اچھی لگی۔ علی بابا نے اسے سمجھایا کہ وہ قانون‌شکنی کی روک تھام پر مامور ہے۔ مہمان خاتون کو مچھلیوں کا شکار ختم ہونے تک آقچی ہی میں قیام کرنا پڑےگا۔ اس کے بعد وہ خود اسے اپنی موٹر بوٹ میں زیلیونی پہنچا دےگا۔ اس وقت ان سب کو واپس جانا ہوگا کیونکہ سمندر میں کشتیوں اور جالوں سے کوئی بھی جگہ خالی نہیں۔ ایسی کشتیوں اور جہازوں کا اس وقت سمندر میں داخلہ ممنوع ہے جو شکار میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔

لیتھونیائی عورت کچھ سمجھ‌کے گھبرا گئی اور اس نے فوراً ہی

اینٹ کے ٹکڑے ملے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ دراصل کسی قلعے یا شہر کے کھنڈر ھیں۔

اس نے یرملائی سے کہا کہ مرے ہوئے شہروں کا نمک تلخ اور زھریلا ھوتا ھے اس لئے بھیڑیں ٹیلے پر اگنےوالی گھاس میں منھ تک نہیں لگاتیں۔ وہ تو ٹیلے پر کبھی چڑھتی ھی نہیں۔

کچھ دن ھوئے شہر کے ایک آدمی نے آ کے اس ٹیلے کو کھودنا شروع کیا۔ اس نے جزیرے کے لوگوں کو کچھ رقم دی اور انہوں نے اس کی مدد کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شہر کا یہ آدمی خزانہ تلاش کر رھا ھے۔ خزانے کے بجائے انہیں کسی قلعے کی دیواریں ملیں اور ایک بدصورت دیوتا۔ پتھر کا یہ آدمی سینے پر ھاتھ رکھے ھوئے کسی سوچ میں ڈوبا ھوا تھا۔ لوگ اسے دیکھکر ھنسنے لگے لیکن شہری آدمی نے انہیں سمجھایا کہ سالہا سال قبل ٹیلے کی جگہ ایک مندر واقع تھا۔ مقامی لوگ پتھر کے اس دیوتا کی پوجا کرتے اور اسے خدا سمجھتے تھے۔ یہ سن‌کر لوگ اور بھی زیادہ ھنسے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خدا کو لوگ دیکھ نہیں سکتے۔

... یرملائی اپنے دوست کے بارے میں لوگوں کو بہت سی کہانیاں سناتا رھتا تھا...

پھر ایک روز ایک مچھیرا جو اسپتال میں علاج کرانے گیا تھا، زیلیونی سے واپس آیا۔ اس نے خدا کی قسمیں کھا کھاکے لوگوں کو یقین دلایا کہ وھاں اس نے قائپ کو بالکل صحیح سلامت دیکھا ھے۔ وہ ایک میدان میں بیٹھا بانسری بجا رھا تھا اور اس کا پالتو سانپ پھن اٹھائے جھوم رھا تھا۔ ارد گرد بہت سے لوگ اکٹھا ھو گئے جو بوڑھے اور سانپ کو حیرت کے ساتھ دیکھ رھے تھے۔ مچھیرے نے قسم کھائی کہ بوڑھے کے ساتھ ایک بڑھیا بھی تھی جو سانپ کا ٹوکرا ھاتھوں میں لئے بوڑھے کے قریب ھی بیٹھی تھی۔

جزیرے کے لوگ یہ باتیں سن‌کے گھبرا گئے:

"کون بڑھیا؟ کیسی بڑھیا ھے وہ؟ بکواس کر رھے ھو تم۔"

پھر فیصلہ کیا گیا کہ زیلیونی پر ایک کشتی بھیج‌کے قائپ کی اصلی حالت معلوم کی جائے۔

آج صبح ھی صبح یرملائی اور قائپ کا بیٹا اللہ‌بیرگن، زیلیونی روانہ ھو گئے۔

اچانک سمندر سمٹ سا گیا اور اس کی لہریں جالوں کے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ لہریں بہت دنوں کی نیند سے بیدار ہوئی ہوں۔ پھیلے ہوئے جال بادبان جیسے نظر آ رہے تھے۔

قائپ نے کان لگاکے جالوں میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کی سرسراھٹ سنی۔ مچھلی سے بھرے ہوئے جال سمندر کے اندر جانے لگے اور قائپ نے اندازہ لگایا کہ بہت زیادہ مچھلیاں ھاتھ لگی ھیں۔ اب کیا کچھ نہ ہوگا مچھیروں کے گھروں میں!

لیکن مچھلیاں پکڑ لینے کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ ماہی‌گیروں کا کام ختم ہو گیا۔ انہیں مچھلیوں سے بھرے ہوئے جالوں کو سمندر کی گہرائیوں سے اوپر اٹھانا، انہیں پسچانی تک گھسیٹ کے لے جانا اور مچھلیوں کو صدر مقام آقچی تک پہنچانا ہوگا...

## ۹

آخرکار قائپ اپنے وطن زیلیونی پہنچ ھی گیا۔ اس نے جزیرے پر قدم رکھا، اس کی مٹی کا بوسہ لیا، اسے سلام کیا اور دعائیں دیتا ہوا اس مقام کی طرف چل کھڑا ہوا جہاں چشمہ واقع تھا...

اس کی تلاش کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رھا۔ پسچانی میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو سمندر میں کسی کشتی کو دیکھ‌کے چلانے نہ لگتا ہو: "قائپ بابا آ گئے! بابا آ گئے!"

پھر لوگوں نے قائپ کی جستجو ترک کر دی اور اس کی زندگی کی تفصیلات کو یاد کرنے لگے۔

قائپ کے متعلق یرملائی دوسروں کی بہ‌نسبت کہیں زیادہ جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قائپ کو جزیرے کے ایک ٹیلے سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس ٹیلے سے طوفان کے بعد نمک نکالا جاتا تھا۔ قائپ اکثر سوال کرتا رھتا تھا: نمک آخر کہاں سے آتا ھے؟

اس نے سوچا کہ ٹیلے کی کھدائی کرکے دیکھنا چاھئے کہ اس کے اندر ھے کیا۔ اس نے کھدائی شروع کی لیکن اسے نمک کے بجائے

# نگراں چوکیاں

یرملائی، پروشکا کو ساتھ نہیں لے گیا۔ پروشکا نے سمندر میں اترکے کشتی کے پیچھے پیچھے تیرنے کی کوشش کی لیکن اس کے والد نے اسے کشتی کو پکڑنے نہ دیا اور وہ واپس لوٹا۔

پروشکا اداس ھوکے جزیرے پر لوٹ آیا اور اپنے والد کی واپسی کے انتظار میں ساحل پر بیٹھا رہا...

## ۱

یہ قلعہ ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ نیچے ایک دریا ہے اور ایک گاؤں۔ دریا گاؤں تک پہنچ کے مڑتا اور قلعے کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلعے تک نہ پیدل پہنچنا ممکن ہے، نہ گھوڑے پر۔ یہاں پہنچنے کے لئے دریا کو پار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں...

ہر صبح ولی بابا اور دوسرے قلی دس کشتیوں پر سوار ہوکے قلعے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

کنارے پر عورتوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ وہ بوریوں کو بند کرتی اور قلیوں کی واپسی کی منتظر رہتی ہیں۔

قلی مخالف کنارے پر پہنچ کے بوریاں اٹھائے ہوئے گرانیٹ کے زینوں پر چڑھتے ہیں۔ قلعے کے پھاٹک پر پہنچ کے وہ اسے تین کنجیوں سے کھول دیتے ہیں، ٹارچ جلاتے ہیں اور متعدد سرد آہنی دروازوں والے اندرونی برآمدوں سے گزرتے ہیں۔ وہ تھکن محسوس کرکے بیچ راستے ہی میں اپنے بوجھ اتار دیتے ہیں اور بوریوں پر بیٹھ کے روٹی کھانے اور سگریٹ پینے لگتے ہیں۔

"میں خود کو اس کام کا عادی نہیں بنا پا رہا ہوں" ولی بابا راستے کے اس جانب جہاں روشنی کی پٹی تھرتھراتی نظر آئی ہے، دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہتا ہے۔

قلی کوئی جواب نہیں دیتے ہیں۔ بس ٹھنڈی سانسیں بھر کے رہ

کھڑکی کے اوپر قلعے کی برجیاں واقع ھیں لیکن ولی‌بابا کے سوا اور کوئی قلی وھاں جانے کی ھمت نہیں کرتا۔ ساٹھ سالہ ولی‌بابا آسانی کے ساتھ کھڑکی میں سر اور پھر پیر داخل کرکے قلیوں کو حکم دیتا رھتا ھے کہ وہ جلدی جلدی بوریاں اس تک پہنچا دیں۔

قلیوں کو خوبصورت قلعے کی سیر کرنے کا کبھی وقت نہیں ملتا کیونکہ انہیں کشتیوں میں بیٹھکے جلدی جلدی دوسرے کنارے کو واپس جانا اور باقی بوریوں کو قلعے میں پہنچانا ھوتا۔ اور دریا کی سطح پر جا بجا تیل پھیل جانے کی وجہ سے کشتی چلانے کا کام روز بہ روز دشوارتر ھوتا جا رھا ھے۔

چھ ماہ قبل گاؤں کے قریب تیل دریافت کیا گیا تھا۔ اس کے بعد آس پاس کے علاقوں کی چھان بین کی گئی اور دریا پر پل تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں ھیلی‌کاپٹروں کے ذریعے سیمنٹ اور دوسرا تعمیراتی سامان لایا گیا اور قیدیوں کو ریگستان میں منتقل کر دیا گیا جو گاؤں سے تقریباً سو کلومیٹر دور ھے۔

قلعے کو عارضی گودام کی شکل دے دی گئی اور سابق پہریدار، ولی‌بابا اور اس کے ساتھی قلی بن گئے۔

یہ لوگ نئے قیدخانے میں پہریداری کا کام کرنے نہ گئے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اپنے آبائی گاؤں غوزار ھی میں رھیں اور قلیوں کی حیثیت سے کام کریں۔ تیل نکالنے کا کام شروع ھوگا تو قلی اپنی اپنی پسند کا پیشہ اختیار کر سکیں گے۔

غوزار کے باقی پچاس سے زائد افراد قیدخانے میں یا تو ٹیچر، نرس اور دھوبنوں کا کام کرتے تھے یا نان، لسی اور کباب تیار کرکے قیدیوں اور ان کے دور سے آنےوالے رشتےداروں کے ھاتھوں فروخت کرتے تھے۔ ان سب کو بھی تیل نکالنے کے مرکز ھی پر جس کے قریب ایک شہر وجود میں آنےوالا تھا، ملازمت فراھم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

پرانے زمانے میں یہاں کوئی قلعہ نہ تھا۔ غوزاروالوں کے باپ دادا کسان تھے۔ وہ دریا کے کنارے آباد اس خوشحال گاؤں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ امیر بخارا کی بہن اپنے بھائی کے خلاف سازش کر رھی ھے اور اپنے ماموں کو امیر بخارا بنانے کی کوشاں ھے۔ امیر بخارا کو شہزادی کی سازش کا علم ھو گیا تو اس

جاتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ بولیں گے تو اس سنسان برآمدے کے دروازوں کے پیچھے اجنبی آوازیں سنائی دیں گی...

"خیر ہوگا، آؤ چلیں" ولی‌بابا کہتا ہے۔

روشنی کی پٹی تک پہنچنے سے قبل قلی ایک بار پھر آرام کرنے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں اور ولی‌بابا ان سے کہتا ہے:

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اب کہاں ہیں؟ اب ان پر سخت پہرہ دیا جا رہا ہے کہ نہیں؟ ہماری نگرانی سے تو ان میں سے ایک بھی فرار نہ ہو سکا۔ ٹھیک ہے نا، جوانو؟"

قلی نیم تاریکی میں دیکھتے ہیں کہ ولی‌بابا کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔

روشنی کی پٹی کا رخ بدل جاتا ہے۔ اب روشنی بائیں طرف سے نہیں، کہیں اوپر سے آ رہی ہے۔

قلی اب بھی خاموش ہیں، ڈر رہے ہیں کہ بولیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بھوتوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو جائے۔ ولی بابا البتہ ان جیسا توہم‌پرست نہیں۔ وہ نہ تاریکی سے ڈرتا ہے، نہ ان اندرونی برآمدوں سے۔

پہلے جب یہ قلعہ قیدخانہ تھا تو ولی‌بابا پہریداروں کا سربراہ تھا۔ اس کے ساتھی شفٹ ختم ہونے تک دن کو چلچلاتی دھوپ اور رات کو تیز برقی روشنیوں میں پہرا دیتے رہتے تھے۔

ولی‌بابا کی حالت ان سے مختلف تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً اوپر سے نیچے اترتا اور قیدخانے کی صورت حال سے متعلقہ ذمےداروں کو مطلع کرتا۔ وہ برآمدوں سے گزرتے وقت سب کو اور سب کچھ نظرانداز کرتے ہوئے سگریٹ پیتا اور سیٹی بجا بجاکے کسی دھن کے سر نکالتا رہتا۔ ذمےداروں کو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کے بعد وہ فوراً ہی واپس آ جاتا تھا۔

قلی پیٹھ پر بوریاں لادے ہوئے روشنی کی پٹی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چھت میں کھڑکی کے قریب ان کے سروں پر حسب معمول چمگادڑ منڈلا رہے ہیں جو اب قلعے کے واحد پہریدار ہیں۔ قلیوں کو ہوا کے جھونکے محسوس کرکے پتہ چل جاتا ہے کہ چمگادڑ قریب آ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ان کے پسینے سے تر چہروں کے سامنے چھوٹا سا پنکھا لگا دیا ہو۔

بیٹھے بیٹھے قلعے کی دیواروں پر رینگتی ہوئی ہری چھپکلیوں کو دیکھ دیکھکے وقت گزارتے تھے۔ کبھی کبھی یہ بحث بھی کرنے لگتے تھے کہ چھپکلی مکڑی کو پکڑ لےگی یا مکڑی دیوار کے شگاف میں داخل ہوکے اپنی جان بچا لےگی۔ رات کو یہ لوگ ستاروں کو دیکھ دیکھکے موسم کے متعلق پیشین‌گوئیاں کرنے کی کوشش کرتے...

کتنی عمدہ ملازمت تھی! سنتری اپنے گھروں کو واپس ہوتے تو انہیں ذرا بھی تھکن نہ محسوس ہوتی اور ان کے جسموں میں کشتی کی مرمت کرنے یا مچھلیاں پکڑنے کے لئے قوت باقی رہتی۔

انہیں کیا خبر تھی کہ قلعے کے نیچے تیل موجود ہے! تیل تو شہر کے ماہرین ارضیات نے دریافت کیا۔ اور اس واقعے نے ولی بابا اور اس کے ساتھیوں کی زندگیوں کا رخ ہی بدل دیا۔ سابق سنتری بخوبی سمجھتے ہیں کہ تیل کے کنوؤں کے مقابلے میں قیدخانے کی خاک بھی اہمیت نہیں لیکن انہیں اچھا نہیں لگتا کہ قلعہ خالی پڑا ہے اور اب وہ نگراں چوکیوں پر پہرا نہیں دیتے۔ انہیں اس خالی قلعے، پہرا دینے کی جگہوں، روشندانوں اور ان لمبے لمبے اندرونی برآمدوں پر جہاں کبھی قیدیوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آتی تھی، ترس آتا ہے۔

اسی لئے وہ نیم‌تاریکی میں چلتے وقت باتیں کرتے ڈرتے ہیں اور کھڑکی کے پاس آنے کے بعد چھت پر قلعے کے گنبدوں کے نیچے ان جگہوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے جہاں وہ کھانے کا وقفہ گزارنے کے لئے جاتے تھے، جہاں طعام‌خانے میں کھانا کھاتے تھے، جہاں ڈیوٹی ختم ہونے پر جاکے اسلحہ‌خانے میں بندوقیں رکھتے تھے اور جہاں سے مضبوط آہنی سیڑھیوں پر اوپر برجیوں تک جاتے تھے۔ اب یہاں نہ کسی طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، نہ قدموں کی آہٹیں۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا چھایا رہتا ہے...

قلی جلدی جلدی بوریاں اوپر پہنچا دیتے ہیں اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے برآمدوں سے گزرکے واپس چلے جاتے ہیں۔

وہ لوگ دس پندرہ بار کشتی پر سفر کرکے ایک شفٹ کے کام کی مقررہ مقدار پوری کر لیتے ہیں۔

نے اسے شہر بدر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک روز امیر کے مشیر گھوڑے دوڑاتے ہوئے غوزار پہنچے اور کسانوں کو قلعے کی تعمیر سے متعلق امیر کے فرمان سے مطلع کیا۔ فرمان کے تحت کسانوں نے اپنے کھیتوں اور انگور کے باغوں میں کام چھوڑکے قلعے کی تعمیر شروع کی۔ قلعے کے لئے بہت زیادہ مٹی درکار تھی اور امیر بخارا کے ملازمین نے کسانوں کو کھیتوں اور باغوں کی مٹی استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی زمانے سے گاؤں کے قرب و جوار کی زمین اوسر ہو گئی جس پر بوریان گھاس کے سوا کچھ بھی نہیں اگتا۔

قلعے کی تعمیر کے بعد شہزادی یہاں آکے رہنے لگی تو گاؤں کی عورتیں نوکرانیاں، دھوبنیں اور باورچنیں بن گئیں اور مرد سائیس اور پہریدار۔

شہزادی کے انتقال کے بعد قلعے میں چار وزیر، ایک خان اور دو نواب رہنے لگے اور گاؤں‌والے ان کی نوکری کرتے رہے...

تیس سال قبل سوویت اقتدار کے زمانے میں اس قلعے کو قیدخانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ ولی‌بابا اور نو دوسرے نوجوانوں کو بندوق چلانے، فرار ہونے‌والوں کا تعاقب کرنے اور پہرا دینے‌والے کتوں کی مدد لینے کی تربیت دی گئی۔ انہوں نے سنتریوں کی وردیاں پہنیں اور پہرا دینے لگے۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھیوں کو یہ کام بہت پسند تھا۔ وہ مستعدی سے اپنے فرائض انجام دیتے اور سوچتے رہتے تھے کہ زندگی کے آخری ایام تک قیدخانے ھی میں کام کرتے رہیں گے۔

ان پہریداروں کو پنشن پانے کے مستحق ھو جانے میں سال ھی دو سال باقی رہ گئے تھے۔ ولی‌بابا پنشن لےکے گھر بیٹھ رہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ بڑھاپے میں بھی قیدخانے سے نہ جائےگا۔ قیدخانے کے سربراہ بھی ولی‌بابا کی عزت کرتے تھے۔ اس کی ٹیم کے لوگ کبھی بھی غفلت نہیں برتتے تھے۔ ان کی ڈیوٹی کے دوران کبھی بھی کوئی ھنگامہ نہیں ھوتا تھا۔ وہ جن قیدیوں کی نگرانی پر مامور تھے انہیں نہ تو ناجائز سرگرمیوں سے دلچسپی تھی اور نہ ھی قلعے کے اندر خندق کھودنے یا قلعے سے فرار ھونے سے۔

یہی وجہ تھی کہ سنتریوں کو قیدیوں کی نگرانی میں کوئی دقت نہیں محسوس ھوتی تھی۔ دن کو یہ لوگ نگراں چوکیوں میں

کو جو پانی کی قربت کے باعث رنگ آلود ہو چکے تھے، اکٹھا کرکے کام روک دیا اور کشتیوں میں بیٹھکے قلعے کی طرف چل دئے۔ انہوں نے سوچا کہ قلعے کے کمرے عرصے سے صاف نہیں کئے گئے اور اب تو شاید اس کی سیڑھیاں اور میدان ریت سے ڈھک گئے ہوں۔

انہیں قلعے کی فکر اس خیال کی بنا پر رہتی تھی کہ غوزار گاؤں جب شہر بن جائےگا تو یہ قلعه ھی یہاں کی سب سے زیادہ قابل دید عمارت ہوگا۔

قلعے میں پہنچکے انہوں نے جھاڑو اور بالٹیاں لیں اور برجیوں کی صفائی کے لئے اوپر چڑھنے لگے۔ قلعے کے تینوں احاطے جن پر پتھر جڑے ہوئے تھے، اندرونی عمارتوں کے فرش اور روش سب کے سب سرخ ریت سے ڈھکے ہوئے تھے۔ چھت پر جانے کے دروازے اور باھری پھاٹک سے داخل ہونےوالی اس ریت نے لمبے لمبے برآمدوں کے اندر گھس کر قیدیوں کے ھاتھوں پیروں کے نشانات مٹا دئے تھے۔ ان کی جگه قلیوں کو برآمدوں میں اپنے قدموں اور احاطے میں لومڑیوں، کچھووں اور خارپشتوں کے قدموں کے نشانات نظر آئے۔

اوپری سیڑھیوں پر انہوں نے چیلوں، کووں کے پنجوں کے نشانات اور برجیوں کے قریب پہنچکے عقابوں کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔

نشانات کو دیکھنے اور سمجھنے کا فن لوگوں نے قیدخانے میں کام کرتے کرتے سیکھ لیا تھا۔ اس معاملے میں ان کی نگاھیں بےحد تیز ہو گئی تھیں۔ وہ نشانات دیکھتے ھی بتا سکتے تھے که کن جانوروں اور پرندوں کے ھیں۔ صرف یہی نہیں بلکه انسانی قدموں کے نشانات سے ان کی عمر، قد اور جنس تک متعین کر سکتے تھے۔ بعد میں ان کے لئے یہ صلاحیت اکثر مفید ثابت ہوئی۔

قلیوں نے برجیوں کے قریب پہنچکے اپنی اپنی برجی کو صاف کرنے کا فیصله کیا۔ پہلی برجی ولی‌بابا کی تھی اور وہ اس کے پاس ٹھہر گیا۔ باقی قلی فصیل کی اوپری چوڑان پر اپنی برجیوں کی طرف لپکے۔

ھر برجی ایک دوسرے سے پچاس میٹر کے فاصلے پر واقع تھی اور ان کی مجموعی تعداد دس تھی۔

پہلے یہ برجیاں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور ان کی

مہینے بھر بعد ان لوگوں کو اس کام سے فرصت مل جائے گی۔ مزید سامان کے ساتھ ہی ساتھ معمار بھی آ جائیں گے اور یہ لوگ پل کی تعمیر میں جٹ جائیں گے...

## ۲

معماروں کی آمد سے دس روز قبل پل کا آہنی ڈھانچہ اور بنیاد میں استعمال کئے جانے کے لئے آہنی جالیوں میں بندھے ہوئے بڑے بڑے پتھر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پہنچا دئے گئے۔

قلعے تک بوریوں کی ڈھلائی مکمل ہو چکی تھی۔ اب قلی پتھر اکٹھا کر رہے اور گھوڑا گاڑیوں اور ٹھیلوں کی مدد سے پل کے ڈھانچے کے مختلف حصوں کو دریا کے کنارے پہنچا رہے تھے۔ کام کے معاملے میں ان کی مستعدی کا اب بھی وہی عالم تھا جو قیدخانے میں پہرا دینے کے وقت تھا۔

"کوئی بھی کام ہو، وہ بہرحال کام ہی ہوتا ہے" ولی بابا نے قلیوں سے کہا۔ "اسے خوش اسلوبی سے انجام دینا ضروری ہے۔"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔ اسے تو ہمارے سنسان علاقے کی خوش قسمتی تصور کرنا چاہئے" قلیوں نے ولی بابا سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔

رات کو بارش شروع ہو گئی۔ قلیوں کو پہلے دھیمی دھیمی سرسراہٹیں سنائی دیں جیسے قلعے کی دیواروں سے ننھے ننھے پتھر ٹکرا رہے ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد اچھا خاصا شور بلند ہونے لگا جیسے دریا میں پتھر گر رہے ہوں۔ دریا میں گر کے یہ پتھر فوری طور پر نہیں ڈوبتے۔ یہ ہلکے اور کوکھلے پتھر تو مچھلیوں کی طرح سفید کفدار نشانات چھوڑتے ہوئے دیر تک تیرتے رہتے ہیں۔

صبح ہوئی تو قلعہ پرسکون اور صاف ستھرا دکھائی دیا جیسے وہ مہمانوں کا منتظر ہو۔ قلیوں نے دیکھا کہ بھاپ اور کہرے کے بادل دائیں بائیں جھومتے اور تیرتے ہوئے قلعے کی برجیوں کے اوپر نورانی حلقوں کی طرح منڈلا رہے ہیں۔

دوپہر کو قلیوں نے پتھروں اور پل کے ڈھانچے کے مختلف حصوں

اتنے میں عورتیں باہر نکلیں اور مہمانوں کو سلام کرکے پانی اور لسی پلانے لگیں۔

اچانک ولی بابا کو قلعے میں رکھی ہوئی بوریوں کی یاد آئی، وہ گھبرا سا گیا اور قریبی برجی کی طرف مڑکے چلایا:

"ارے قالی‌خان، ذرا دیکھنا تو بوریوں کا کیا حال ہے؟ کہیں ان میں سیلن تو نہیں لگ گئی؟ ان بوریوں کے لئے جان دینی ہوگی۔ کسی کے چوری کرنے کا نشان نظر آئے تو فوراً بتاؤ!"

قالی‌خان نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی برجی سے باہر نکل‌کے ولی‌بابا کے پاس سے گزرنے لگا تو شک کے لہجے میں کہا:

"چوری کون کرےگا؟ لومڑیوں، کووں اور ہم لوگوں کے علاوہ قلعے میں کوئی آ بھی سکتا ہے؟"

"مگر لومڑیاں کیسے آتی ہیں؟" ولی‌بابا نے پوچھا۔ وہ بہت دنوں سے اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا۔

"شاید سرنگ کھودکے آ گئی ہوں‌گی۔"

"لعنت ہو ان پر" ولی‌بابا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "جاکے دیکھو نا۔ یاد رکھنا کہ چور بھی لومڑی ہی کی طرح چالاک ہوتے ہیں۔ جیسے لومڑی آتی ہے ویسے ہی چور بھی آ سکتا ہے۔"

"ہماری پہریداری کے زمانے میں تو کوئی نہیں آیا تھا" قالی‌خان نے پھر شک بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، کوئی نہیں آیا تھا۔ مگر کوئی آتا بھی تو کیسے؟ ہماری ٹیم تو بڑی مستعد تھی!"

"تھی تو سہی..." قالی‌خان نے اداسی سے کہا اور نیچے اترنے لگا۔

غوزار کی عورتیں مہمانوں کو پانی پلاکے قلعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں کچھ سمجھا رہی تھیں۔

"ہمیں تلاش کیا جا رہا ہوگا" کسی نے چلاکے ولی‌بابا سے کہا۔

"ہمیں تلاش کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ ہم کوئی کام‌چوری تھوڑی کر رہے ہیں... یہ سوچنا غلط ہوگا کہ وہ لوگ پل تعمیر کرنے میں جلدی کریں‌گے۔ پہلے آرام کر لیں‌گے، دریا میں نہا لیں‌گے، پھر ان سے ہم ملاقات کریں‌گے۔"

چھتیں آھنی چادروں کی تھیں۔ قلعے کو قیدخانے میں تبدیل کیا گیا تو ان برجیوں کو دوسری شکل دے دی گئی۔ اینٹ کی اندرونی دیواروں اور چھتوں پر جانے کی اندرونی سیڑھیوں کو ھٹا دیا گیا اور برجیوں کی پرانی بنیادوں پر دیواروں کی جگه آھنی سلاخیں کھڑی کر دی گئیں تاکه ان کی چھتیں نه گرنے پائیں۔

برجیاں اس تبدیلی کے بعد سنتریوں کی نگراں چوکیوں کا کام دینے لگیں۔ ان کے اندر کھڑے ھوئے پھریدار بهآسانی قلعے کے تمام قریبی علاقوں کا مشاھدہ کر سکتے تھے اور کوئی بھی شخص ان کی نگاھوں سے نہیں بچ سکتا تھا خواہ پیادہ یا خواہ گھڑسوار۔

ولیبابا کی برجی اب یتیم سی نظر آ رھی تھی۔

قیدخانے میں خدمات انجام دینے کے دوران ولیبابا نے مٹی لاکے گملوں میں ڈالی تھی اور طرح طرح کے پودے اگائے تھے۔ ان پودوں کی بیلیں سلاخوں سے لپٹتی ھوئی چھت تک پہنچ گئی تھیں جس کی وجه سے اس کی نگراں چوکی میں ٹھنڈک رھتی تھی۔ ھدایات کے بموجب برجیوں میں ایسی فضول چیزیں رکھنا ممنوع تھا جو پھریداروں کی توجه اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ لیکن ولیبابا کو معلوم تھا که قیدخانے کے افسر کو نیچے سے یه پودے دکھائی نه دیں گے اور وہ خود ولیبابا پر اپنے اعتماد کی بنا پر معائنے کے لئے اوپر چڑھکے آنے سے رھا۔ گملوں میں اگے ھوئے ان پودوں کو دیکھکر پھریدار ماضی کی یادوں میں کھو جاتے تھے جب وہ کسان تھے۔ پودے تنہائی کو برداشت کرنے میں مدد دیتے تھے۔

اب برجی کے قریب سرچ لائیٹ بھی نہیں تھی جس کی بدولت قلعے کا احاطه، ارد گرد کے علاقے اور رات کا آسمان چمک اٹھتا تھا۔

"ولیبابا، دیکھ رھے ھیں نا آپ؟" قریبی برجی سے آواز سنائی دی۔

"شاید معمار آ گئے" ولیبابا نے تین ھیلیکاپٹروں سے اترتے ھوئے اجنبیوں کو دیکھکر کہا۔

"ان سے ملنے کے لئے ھم لوگ نیچے اتریں نا؟"

"ابھی نہیں۔ ان کی خدمت کرنا ھمارا کام تھوڑی ھے" ولیبابا نے اپنی خودداری برقرار رکھتے ھوئے کہا۔ "اچھا ھے که عورتیں ان کا خیرمقدم کریں۔"

"بابا، اندر جانے کے لئے ٹکٹ لینے ہوں گے نا؟"

قالی‌خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ایسا تاثر پیدا کیا جس سے مہمانوں کو یہ خیال نہ آئے کہ اسے ان لوگوں کی آمد ناگوار گزری ہے۔

معمار اس کے پاس سے گزرکے اندرونی برآمدے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتے تھے اور یہ لوگ ایک دوسرے کے پیروں پر پیر رکھنے لگے۔

"ارے بابا، آپ کہاں گئے؟ ہمیں جانا کہاں ہے؟" وہ قالی‌خان کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے چلائے۔

"میرے پیچھے پیچھے آئیے" قالی‌خان نے تحکمانہ انداز میں کہا اور معماروں کی صف کے آگے کھڑا ہو گیا۔ "ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑکے، آگے پیچھے چلے آئیے۔"

"یہاں روشنی کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا کیا؟" کسی نے قالی‌خان سے دریافت کیا۔

برآمدے کے گیلے پتھر لوگوں کی آوازیں اپنے اندر جلب کئے لے رہے تھے جس سے ایسا لگتا تھا جیسے لوگ بڑبڑا رہے ہوں، آہیں بھر رہے ہوں۔

قالی‌خان نے منہ بناتے ہوئے ٹھنڈی سانس لےکے کہا:

"ساتھیو! التماس ہے کہ یہاں بولئے نہیں۔"

معمار خاموش ہو گئے۔ چھت پر پہنچنے کے دروازے تک برآمدے میں ان کے دبے قدموں کی آہٹیں گونجتی رہیں۔

جب سب لوگ اوپر کھلی چھت پر پہنچ گئے تو قالی‌خان نے دیکھا کہ معماروں کے چہرے بھاپ سے بھورے ہو گئے ہیں اور ان کی آنکھوں کی چمک غائب ہے۔

"روشنی تھی۔ کچھ دن قبل ہی یہاں بجلی کے بلب جلتے رہتے تھے" اس نے اعتراف کیا۔

لیکن معمار قالی‌خان کی باتیں نہیں سن رہے تھے۔ وہ خوبصورت احاطے کو دیکھ‌کے جس کا راستہ لمبا تھا، بہت متاثر ہو گئے تھے۔

"سب کچھ بند ہے" قالی‌خان نے صحن سے کمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں آپ صرف صحن ہی میں گھوم پھر سکتے ہیں۔"

"ارے، وہ دوڑے ہوئے یہیں آ رہے ہیں!" کئی برجیوں سے ایک ساتھ آوازیں سنائی دیں۔

"دیکھو، اپنی اپنی جگہوں ہی پر رہنا۔ نیچے قالی‌خان ان کا استقبال کر لیں گے۔"

معماروں نے دریا کے کنارے پہنچ کے کپڑے اتارے اور قلعے کی طرف تیرنے لگے۔ وہ زیادہ تیرنے سے تھک گئے اس لئے دریا سے نکلے تو ان میں دوڑنے کی سکت نہ باقی رہی اور دھیرے دھیرے ایک صف کی شکل میں قلعے کی طرف بڑھنے لگے۔

بلندی پر پہنچ کے وہ لوگ پھاٹک کو کھٹکھٹانے اور زور زور سے آوازیں دینے لگے۔ قلی قلعے میں داخل ہونے کے بعد پھاٹک کو ہمیشہ ہی مقفل کر دیا کرتے تھے۔

قالی‌خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے پھاٹک کھولنا چاہئے یا نہیں۔ وہ سر اوپر ولی‌بابا کی طرف اٹھاکے ہاتھوں سے اشارہ کرنے لگا جیسے اس کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہو۔

ولی‌بابا نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور چلاکے جواب دیا: "اندر آ جانے دو!"

قالی‌خان نے قفل کھول کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ پھاٹک کو دھکا دیں کیونکہ اس بھاری بھرکم آہنی پھاٹک کو ایک آدمی نہیں کھول پاتا تھا۔

قالی‌خان پھاٹک کے سامنے سے الگ ہٹ گیا اور معماروں نے دھکا دے‌کر اسے کھول دیا۔ پھاٹک کھلتے ہی کئی بڑے بڑے چمگاڈر باہر نکلے اور ایک معمار نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی۔ دوسرے معمار اس کے ساتھ چلا چلاکر اس کی حوصلہ‌افزائی کرنے لگے۔ آخر یہ چمگاڈر اڑ گئے تو معمار قالی‌خان کے قریب آئے۔

قلعے کے باہر کی تیز روشنی سے قالی‌خان کی آنکھیں چکاچوند سی ہو گئیں۔ اس نے مہمانوں کو رکھائی کے ساتھ دیکھا۔ معماروں کو قلعہ خالی خالی، خاموش خاموش نظر آیا جس میں سیلن کی بو بسی ہوئی تھی۔ قالی‌خان کو ان لوگوں نے کوئی معمولی دربان تصور کیا۔

اتنے میں ایک معمار نے جسے معلوم تھا کہ قلعے کے جیسے آثار قدیمہ کو دیکھنے کے لئے کچھ پیسے بھی دینے پڑتے ہیں، قالی‌خان سے پوچھا:

آخرکار ان میں سے چند ایک تیز دھوپ میں بالکل پست ہوکے فصیل ھی پر بیٹھ گئے اور ان میں سے کسی نے قالی‌خان سے دوبارہ دریافت کیا:

"ھاں تو آخر اس قلعے کی تاریخ کیا ھے؟"

"آپ لوگوں کا سربراہ کون ھے؟" ولی‌بابا نے پوچھا۔ اسے یقین تھا کہ لوگوں کے گروپ کا کوئی نہ کوئی سربراہ ضرور ھوتا ھے۔

"اس سے آپ کا کیا مطلب ھے؟" معماروں نے حیرانی سے کہا۔

"بات یہ ھے کہ ھم لوگ قلی ھیں۔ قلعے تک بوریاں ڈھوکے لائے ھیں اور پل کے ڈھانچے اور پتھر وغیرہ کنارے پر رکھ چکے ھیں..."

"اچھا تو آپ قلی ھیں؟" معماروں کے نوجوان ٹیم لیڈر نے جو سفید خود پہنے ھوئے تھا، ولی‌بابا کے پاس آکے کہا۔ ایسے خود عموماً خطرناک کام کرنے‌والے لوگ پہنتے ھیں۔ اس نے ولی‌بابا سے ھاتھ ملایا اور کہا:

"آپ لوگوں نے سب کام بہت اچھی طرح کیا ھے۔ مبارک ھو۔ ھم لوگ قلعہ دیکھنے آئے ھیں" اس نے خود اتارکر ولی‌بابا سے معذرتی انداز میں کہا۔

"ھاں، ھاں، ضرور دیکھئے" ولی‌بابا نے خوش‌اخلاقی سے جواب دیا اور ٹیم لیڈر کا خود لےکر اس کے وزن کا اندازہ لگانے لگا۔

ٹیم لیڈر نے قلیوں پر نگاہ دوڑائی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مضبوط، کشادہ شانوں، فوجی وضع قطع اور گہری نظر کے لوگ ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ھیں۔ وہ معماروں کے سامنے خاموش اور چوکس کھڑے ھوئے تھے۔

"بالکل بھائی بھائی معلوم ھوتے ھیں" ٹیم لیڈر نے سوچا۔

## ۳

قلعے تک مشینیں پہنچانے کے لئے دریا پر پہلے ایک عارضی پل تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھی کشتیوں میں بیٹھے اور اپنے ھاتھوں میں رسے سنبھالے ھوئے منتظر رھتے تھے کہ دریا کی تہ کی

معماروں کو یہ سن‌کے مایوسی نہیں ھوئی اور ان میں سے ایک نے قالی خان سے کہا:

"ارے بابا، یہ تو بتائیے کہ کتنی صدیوں قبل..."

"میں کچھ نہیں جانتا ھوں، کچھ بھی نہیں۔ آئیے، برجیوں کو دیکھنے کے لئے اوپر چلیں" قالی‌خان نے مہمانوں کی بات کاٹتے ھوئے کہا۔ اسے یہ دیکھ‌کے غصہ آ گیا کہ معمار اجازت لئے بغیر دوسرے صحن کی طرف چل دئے جہاں پہلے غسل‌خانہ تھا۔

وہ معماروں سے حجت کرنا چاھتا تھا اس لئے اس نے انہیں ولی‌بابا کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔

"اچھا تو آئیے، اوپر چلیں" معماروں نے اس لہجے میں کہا جس سے معلوم ھوتا تھا کہ انہیں قلعے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ھے۔ قالی‌خان نے سوچا کہ یہ لوگ بس تفریح کرنے کے لئے آئے ھیں۔ وہ معماروں کے پیچھے کھڑا ھو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ یکے بعد دیگرے سیڑھی پر چڑھ‌کے پہلی برجی تک پہنچ جائیں۔ دراصل قیدخانے میں کام کرنے کے تجربے کی بنا پر اسے معلوم تھا کہ سیڑھی پر اجنبیوں کو راستہ دے‌کر خود ان کے پیچھے پیچھے چلنا چاھئے۔

"اٹھائیس" قالی‌خان نے بےخیالی میں معماروں کی گنتی کی۔ وہ خود آخری معمار کے بعد سیڑھی کے ذریعے اوپر پہنچا جہاں برجی کے قریب خشک‌مزاج ولی‌بابا کھڑا تھا۔

ولی‌بابا کو ان لوگوں کے سامنے بدحواس ھو جانا کچھ اچھا نہ لگا چنانچہ اس نے خود کو ذرا نک چڑھا ظاھر کرنے کا فیصلہ کیا۔ قلعے کے قیدیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے اس کی ملاقات ھی نہیں ھوتی تھی اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ معماروں سے کس طرح پیش آئے۔ جانے یہ لوگ کیا پوچھیں اور وہ ان کو کیا جواب دے۔

معماروں کو قلعے میں ان لوگوں سے ملاقات کرکے حیرت نہ ھوئی۔ ان کا خیال تھا کہ ولی‌بابا اور اس کے ساتھی انہی لوگوں کی طرح قلعہ دیکھنے آئے ھوں‌گے۔ اسی لئے معماروں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہ کی اور انہیں نظرانداز کرتے ھوئے برجیوں کو دیکھنے لگے۔ وہ ایک برجی سے دوسری تک جاتے اور نیچے گاؤں اور دریا کے مناظر دیکھ دیکھ‌کے لطف‌اندوز ھوتے رھے۔

ھوئی تھیں جیسے میزبانوں کو عجلت میں انھیں بند کرنے کا بھی خیال نہ آیا ھو۔ گاؤں میں کسی کو خبر نہ تھی کہ ولی بابا اور اس کے ساتھی کہاں گئے ھیں۔ انھیں قلیوں کے غائب ھونے پر حیرت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جب دس مرد بیک وقت گاؤں چھوڑکے جاتے ھیں تو اس کا مطلب صرف یہی ھوتا ھے کہ جانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

گاؤں والوں نے یہ ضرور بتایا کہ رات میں کہیں دور جانے کیوں کتے بھونکے جا رھے تھے۔ معماروں کا خیال تھا کہ کتوں کے بھونکنے کا قلیوں کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ھو سکتا۔ آخر انھوں نے واپس لوٹ‌کے ٹیم لیڈر کو صورت‌حال سے مطلع کیا۔

ٹیم لیڈر نے اس خیال سے کہ قلیوں پر کوئی مصیبت نہ آن پڑی ھو، ان کی کشتیوں کی جانچ کرنے کی ھدایت کی۔ کشتیاں جنھیں اندر سے دھوکے صاف کر دیا گیا تھا اور جن میں چپوؤں کی جگہ تیل بھی لگا ھوا تھا، اپنے ٹھکانے پر کھڑی ھوئی تھیں۔ ایک بھی کشتی خراب حالت میں نہ تھی۔ یہ دیکھ‌کے ٹیم لیڈر نے سوچا کہ غوزاروالے نظم و ضبط کے کتنے زیادہ پابند ھیں۔

قلیوں کی تلاش کی مہم کے سلسلے میں غوطہ‌خور دریا میں شام تک غوطے بھی لگاتے رھے۔ دریا کے بہاؤ کے رخ پر ایک موٹربوٹ بھی روانہ کی گئی لیکن وھاں بھی قلی زندہ یا مردہ دکھائی نہ دئے۔ جانے وہ کہاں غائب ھو گئے تھے!

اگلی صبح کو ٹیم لیڈر نے دس قلیوں کے لاپتہ ھونے کی اطلاع میلیشیا کو دے دی لیکن وہ ان کے متعلق میلیشیا کو بہت کم معلومات فراھم کر سکا کیونکہ اسے خود قلیوں سے اچھی طرح واقف ھونے کا ابھی تک موقع نہیں ملا تھا...

## ۴

ولی بابا اور دوسرے قلی جنھیں غوزار میں تلاش کیا جا رھا تھا، گاؤں چھوڑنے کے بعد بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے پہلے کنوئیں کے پاس پہنچ چکے تھے۔

پیمائش کرنےوالے غوطہ‌خور جیسے ھی سگنل دیں وہ انھیں باھر نکال لیں۔

غوطہ‌خور باھر نکل‌کے کچھ دیر تک آرام کرتے اور پھر پانی میں اتر جاتے تھے۔ صبح سے شام تک یہ سلسلہ جاری رھتا اور غوزاروالے ان جگھوں پر بہت آھستگی سے کشتیاں چلاتے رھتے جہاں انھیں غوطہ‌خور رسوں کو کھینچ کھینچ‌کے سگنل دیتے تھے۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھی بڑے صبر و تحمل اور مثالی طرزعمل سے اپنے فرائض انجام دے رھے تھے اور انھوں نے شکایت کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔

ٹیم لیڈر نے دوسرے معماروں کے سامنے ان لوگوں کی تعریف کی اور انھیں سفید خود فراھم کئے جانے کا حکم دیا۔ تیز گرمی کے باعث قلیوں کو ان کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی انھوں نے خود پھن لئے اور انھیں دیکھ‌کر کسی کو خیال تک نہیں آ سکتا تھا کہ وہ معمار نہیں ھیں۔

ان لوگوں نے اسی مستعدی کے ساتھ تین ھفتے تک کام کیا لیکن ایک روز صبح کو کام پر نہ آئے۔

ولی‌بابا کے بغیر غوطہ‌خوروں کو پانی میں اتارنے کی ٹیم لیڈر کو ھمت نہ ھوئی اور اس نے کچھ معماروں کو ان لوگوں کو تلاش کرنے کے لئے گاؤں بھیجا۔

مٹی کی دیواروں اور چھپروں‌والی کوٹھریوں پر مشتمل گاؤں میں انھیں بیرکوں جیسی لکڑی کی بنی ھوئی کوٹھریاں دکھائی دیں۔ ولی‌بابا کی ٹیم انھی میں رھتی تھی۔ بیرکوں پر ایک نظر ڈالتے معماروں کو اندازہ ھو گیا کہ ان کے میزبان تھوڑی ھی دیر کے لئے کہیں گئے ھیں۔ میزوں پر ڈومینو بکھرے تھے، پیالے اور تمباکو کے ڈبے رکھے ھوئے تھے۔

معمار تمباکو کی سگریٹیں بناکے پیتے اور اس انتظار میں بیٹھے رھے کہ قلی ابھی واپس آتے ھوں‌گے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے لیکن کسی کی صورت نہ دکھائی دی۔ آخر دوپھر ھو گئی۔

معماروں نے آخری بار دروازے پر دستک دی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد ھونےوالا نہیں کیونکہ بیرکوں کے دروازے مقفل نہیں تھے۔ بعض بیرکوں کی تو کھڑکیاں تک کھلی

اور اس کے ساتھیوں جیسے قابل اعتبار پہریدار نہ ہوں‌گے۔ وہ اس فیصلے کو خلاف مصلحت تصور کرتے تھے جس کے تحت انہیں غوزار میں چھوڑ دیا گیا تھا، سلمان ڈھونے اور غوطہ‌خوروں کی خدمت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اس سے قطع‌نظر اب تو انہیں مفرور قیدیوں کو پکڑکے قیدخانے میں واپس پہنچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی تھی۔

خالی جھونپڑی کی ساری چیزیں بکھری پڑی تھیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سنتریوں نے اس کی تلاشی لینے میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔

لیکن آخر وہ چرواہا کہاں چلا گیا؟

"کیا قیدیوں سے چرواہے کا بھی کوئی تعلق تھا؟" اچانک ولی‌بابا کو خیال آیا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو مشورے کے لئے بلاکر کہا:

"سنتریوں کے قدموں کے نشانات پر چلنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیں خود اپنا راستہ منتخب کرکے مفروروں کو پکڑنے کی کوشش کرنی چاھئے۔"

غوزاروالوں نے خوش ہوکے جواب دیا:

"ہاں، بھائی ٹھیک ہے۔ ہم خود انہیں تلاش کریں‌گے۔"

"تو ہمیں یہ سوچنا چاھئے کہ کس طرف جانا درست ہوگا۔"

ولی‌بابا نے سوچا کہ کتوں کے ساتھ جو سنتری ان قیدیوں کی تلاش میں مصروف ہیں ان سے ملاقات ہو جاتی تو قیدیوں کی شکل و صورت ہی کا پتہ چل جاتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان لوگوں سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟ اس وقت وہ کہاں ہوں‌گے؟ ولی‌بابا اور اس کی ٹیم کی اس کارروائی کے متعلق وہ کیا سوچیں‌گے؟

نہیں، انہیں خود اپنے بل بوتے پر تلاش جاری رکھنی چاھئے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ قدموں کے نشانات کے جائزے اور مختلف افراد کی باتوں سے ان لوگوں نے بھاگنے‌والوں کی صحیح تعداد کا تعین تو کر ہی لیا ہے۔ معلومات کی متضاد نوعیت کے باوجود ان سے ان کے قدموں کا بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ قیدیوں کے جوتے کیسے ہیں۔ اب مزید کچھ معلومات حاصل

وہ کچھ لوگوں اور ان کتوں کے نشانات دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جن کے بھونکنے کی آوازیں رات میں سنائی دی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں شکاری بندوقیں تھیں، اور وہ کسی بھی وقت گولی چلانے کے لئے بالکل تیار تھے۔ ان کے ساتھ نہ کھانا تھا، نہ پانی حالانکہ وہ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے وہاں سینکڑوں کلومیٹر تک ریت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

لیکن انہیں صرف ایک ہی بات کی فکر تھی اور وہ یہ کہ اپنے تعاقب کو بہرحال کامیاب بنائیں۔ انہیں خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ چلچلاتی دھوپ یا پیاس کی شدت سے ان کی حالت غیر ہو سکتی ہے۔

وہ ایک ایک خندق، ایک ایک ٹیلے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے تیزی سے گامزن تھے۔ راستے میں کہیں بھی ٹھہر نہیں رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان سے قبل ادھر سے گزرنے والے لوگ کنوئیں کے پاس کافی چھان بین کر چکے ہیں۔

کنوئیں کے قریب ایک جھونپڑی کھڑی تھی جہاں سے موسم گرما میں کوئی چرواہا مویشیوں کی نگرانی کرتا تھا۔

ولی بابا نے جھونپڑی کا احتیاط کے ساتھ جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چھ قلیوں کو ہدایت کی کہ وہ ٹیلے پر چھپ کے لیٹ جائیں اور اپنی بندوقوں سے جھونپڑی کا نشانہ لئے رہیں۔ وہ خود تین قلیوں کے ساتھ چھپتا چھپاتا جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن دراصل اس احتیاط کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ کتوں کے ساتھ آنے والے لوگ جھونپڑی کے ہر تاریک گوشے کی چھان بین کر چکے تھے۔ ارد گرد کی ہر چیز دیکھی بھالی تھی اور کنوئیں کی تلاشی لینے کے لئے ان میں سے ایک شخص اس کے اندر بھی اترا تھا۔

لیکن عجیب تھے یہ لوگ بھی! آخر اپنے فرائض کس طرح انجام دیتے تھے؟ ولی بابا بیکار تھوڑی گھبرایا ہوا تھا کہ نئے قیدخانے کے انتظامات اچھے نہ ہوں گے۔ بدانتظامی کا نتیجہ سامنے تھا: تین قیدی قیدخانے کی دیوار میں سوراخ کرکے آدھی رات کو بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

غوزاروالوں کا یہ خیال غلط نہ تھا کہ نئے قیدخانے میں ولی بابا

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مفرور قیدی دن کے وقت کسی گاؤں کی طرف مڑکے گرمی سے بچنے کی کوشش کریں گے اور رات کو ریگستان میں لوٹ آئیں گے۔ بےشک وہ بڑے مواضعات کا جہاں میلیشیا موجود ہے، رخ نہ کریں گے۔ ان کے لئے ایک ہی مناسب راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ ہے بھیڑوں کے گزرنے کا راستہ۔ اس پر پہنچ کے وہ چرواہوں کو فریب دےکر اپنے لئے کھانے پینے کی صورت نکالیں گے۔ اس کے بعد دوبارہ سکساؤل کی گھنی جھاڑیوں میں داخل ہو جائیں گے۔

"ہمیں قبرستانوں اور مزاروں کی بھی چھان بین کرنی ہوگی کیونکہ یہ جگہیں چھپ جانے کے لئے بہت موزوں ہیں" ولی بابا نے کہا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں جو خیال آیا ہے اس کا درست ہونا یقینی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قیدی چھوٹے نہیں بلکہ بڑے مواضعات میں داخل ہوں اور وہاں کپڑے اور بھیس بدل کر کسی ٹرین پر سوار ہو جانے کی کوشش کریں تاکہ سنتریوں کو ان کے قدموں کے نشانات نہ مل سکیں۔

اس کا خیال تھا کہ فرار ہونےوالوں کے گرفتار کر لئے جانے کا انحصار کچھ تو سنتریوں کی ذہانت اور سوجھ بوجھ پر ہے اور کچھ اس بات پر کہ قیدیوں نے طویل راتوں میں سوراخ کھودکے بھاگ کھڑے ہونے کی تیاریوں کے دوران فرار کا کوئی راستہ بھی سوچ لیا تھا کہ نہیں۔

ولی بابا کو صرف ایک ہی بات کا پورا یقین تھا اور وہ یہ کہ مفرور اس علاقے سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ جان ہی نہیں سکتے کہ کنوئیں کہاں ہیں اور کہاں بستیاں۔ ان کا راستہ تو مقامی چرواہے تک اکثر بھولتے رہتے ہیں۔ قیدخانے کے سبھی نظربند شمالی اور مغربی علاقوں کے رہنےوالے تھے لیکن غوزاروالوں کے لئے بھی یہ دشواری تھی کہ وہ تعاقب میں پہلی بار حصہ لے رہے تھے۔

برسوں سے وہ لوگ اپنی برجیوں میں کھڑے ہوکے قیدیوں کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اس دوران انہیں ایک بار بھی گاؤں سے باہر جانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب وہ ان تمام راستوں کو بھول چکے

کرنے کی ضرورت ھے۔ اس کے بعد وہ لوگ بیٹھکے غور و خوض کر سکتے ھیں کہ کون سی معلومات صحیح اور کون سی غلط ھیں۔ اور اس طرح ان کے ذھنوں میں مفروروں کی تصویریں واضح ھو جائیں گی... لیکن یہ سب تو بعد میں ھوگا۔ اس وقت کیا کیا جائے؟

"کھوج کا سارا کام ٹھیک ھی چل رھا ھے" ولی‌بابا نے کہا۔

دراصل کل تو انھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ پرچھائیوں کا تعاقب کر رھے ھیں۔

تعاقب کا آغاز السیشین کتوں کے بھونکنے کی زوردار آوازوں سے ھوا تھا۔

غوزاروالے رات گئے تک ڈومینو کھیلتے رھے تھے۔ اسے ختم کرکے گھر جانے ھی والے تھے کہ انھیں راستے کے پیچھے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سانس روک‌کے سننے لگے۔

"سن رھے ھیں آپ لوگ؟ یہ ھمارے کتوں کی آوازیں ھیں" قیدخانے کے کتوں کی آوازیں پہچان‌کے وہ لوگ گھبرا اٹھے۔ ان آوازوں نے ان کے دلوں میں اپنے پرانے کام کی یادیں تازہ کر دیں جس پر ان کو بہت ترس آ رھا تھا...

"تعاقب!" وہ چیخ اٹھے اور کوئی فیصلہ کئے بغیر اپنی بندوقیں اٹھانے کے لئے دوڑ پڑے۔ ایسا لگ رھا تھا جیسے اس لمحے کا انھیں مدت سے انتظار رھا ھو۔

انھیں محسوس ھوا کہ خطرے کا بگل بجا دیا گیا ھے اور وہ اس طرف دوڑنے لگے جدھر پندرہ بیس ٹارچوں کی روشنیاں چمک رھی تھیں۔ جلدی میں انھیں دریا میں اپنے کام کا خیال تک نہ رھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کام دریاوالے کام سے کہیں زیادہ اھم ھے۔ انھیں ایسا لگ رھا تھا کہ قیدخانے کے کتے بھونک بھونک‌کے ان کے جیسے اصلی سنتریوں کو بلا رھے ھیں۔ وہ سوچ رھے تھے کہ کتوں کو دوڑانےوالے سنتری اپنے مقصد میں کامیاب نہ ھو رھے ھوں‌گے۔ وہ کتوں کو تھکا ماریں‌گے اور خود شدید گرمی اور پیاس کے باعث راستہ بھول‌کر قیدخانے کو خالی ھاتھ واپس لوٹ جائیں‌گے۔

"بات یہ ھے کہ وہ زیادہ دیر تک ریگستان میں نہ بھٹک سکیں‌گے" ولی‌بابا نے چرواھے کی جھونپڑی میں صلاح مشورہ جاری رکھتے ھوئے کہا...

سب سے اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ میلیشیا کے دو گروہ شمال اور جنوب سے ایک ایک میٹر ریگستان کو چھانتے ہوئے ایک دوسرے سے ملنے کو آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے قبل قیدی اگر مشرقی پہاڑوں پر نہ پہنچ سکے تو پھندے میں پھنس جائیں گے۔ وہ پیچھے پلٹ کے مغرب کی سمت جانے سے رہے کیونکہ وہاں تو قیدخانہ واقع ہے۔

ولی بابا نے سوچا کہ میلیشیا کے دونوں گروہوں کے درمیان ایک تنگ راستہ ہے جس کا فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

فرار کرنےوالے اسی راستے پر چل رہے ہوں گے۔ ولی بابا اور اس کے ساتھیوں کو اسی راستے پر پہنچ کے ان کے پہاڑوں میں روپوش ہو جانے کا امکان ختم کر دینا چاہئے۔

ان کا آمنا سامنا سنتریوں کی آمد سے پہلے ہی ہو جانا چاہئے تاکہ وہ مجرمین کو خود ہی پکڑ لیں! انہیں سنتریوں نے پہلے ہی گرفتار کر لیا تو ان لوگوں کو مایوسی ہوگی کہ وہ بیکار پریشان ہو رہے، بیکار طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔

نہیں، یہ بات طے ہے کہ ولی بابا اور اس کے ساتھی ہی انہیں پکڑ لیں گے!

اور آگے بڑھنا ہے!

دن میں انہیں کچھ ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آگے ریت کے ٹیلوں کے عقب میں انہیں چھوٹا سا نخلستان اور اس کے درمیان چرواہوں کا گاؤں ملے گا۔ اس کے برعکس رات میں گرمی زمین میں جذب ہو جاتی اور انہیں سردی لگنے لگتی۔

گرم کوٹ اور وردیاں ان کے ساتھ نہیں تھیں اس لئے وہ خشک گھاس اور سکساؤل کی ٹہنیوں سے اپنے جسموں کو ڈھکے ہوئے تھے اور سر کے نیچے ریگستانی مگرمچھوں کی کھالیں رکھی ہوئی تھیں۔

محض مواضعات ہی میں رات کو بھی گرمی برقرار رہتی تھی اور وہ گرم ہوا میں سانس لیتے رہتے تھے۔

جب بھی کوئی گاؤں ملتا، ولی بابا اس میں داخل ہونے سے قبل اپنے ساتھیوں سے پوچھتا:

"ہم لوگ اس سے کتراکے نکل جائیں یا پانی لینے کے لئے اندر داخل ہوں؟"

تھے جن پر اپنے ایام جوانی میں بھیڑوں کو ھنکاتے ھوئے چرانے کے لئے لے جاتے تھے۔

تو اس وقت فرار قیدیوں اور سابق سنتریوں کی حالت ایک جیسی تھی: قیدی اجنبی ریگستان میں بھاگنے کی اور سابق سنتری بھولے ھوئے ریگستان میں انھیں پکڑنے کی ھر ممکن کوشش کر رھے ھیں۔ ریگستان ھی ولی‌بابا کو قیدیوں کو گرفتار کرنے کا راستہ بتا سکتا ھے۔ وہ ریت پر نشانات، ھوا کے رخ، ٹیلوں کی خصوصیات اور گھاس کی بو کا سہارا لے سکےگا۔ پرندے بھی اس کے معاون ثابت ھوں‌گے کیونکہ ان کا جھنڈ اس جگہ کے اوپر اڑنے لگتا ھے جھاں انسان یا جانور موجود ھوں۔

فرار قیدی بھی انہی چیزوں کا سہارا لے سکتے ھیں۔ نہ جانے زیادہ چیزوں کا سہارا کون لےگا: قیدی یا سابق سنتری۔

"تعاقب کی صورت‌حال ھمارے موافق ھے۔ ھمیں ریگستان میں نشانات دیکھنا سکھایا گیا ھے اور قیدیوں کو، کون جانے سکھایا گیا ھے کہ نہیں..." آخر میں ولی‌بابا نے کہا۔

یہ کہنے کے بعد اسے خیال آیا کہ شاید قیدی جیل سے پہلی بار نہ بھاگے ھوں۔ اگر وہ دو یا تین بار ایک جیل سے نہیں بلکہ مختلف جیلوں سے بھاگنے کا تجربہ رکھتے ھوں‌گے تو ان کے سزا سے بچ نکلنے اور پکڑکے سنتریوں کی نگرانی میں واپس لے جانے کے امکانات برابر ھوں‌گے۔

تو اس طرح ولی‌بابا کی ٹیم نے تعاقب کا اپنا الگ راستہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔

## ۵

دراصل تعاقب کا سلسلہ اتنا پیچیدہ نہ ثابت ھوا جتنا ولی‌بابا کی ٹیم نے تصور کیا تھا۔ راستے میں ملنےوالے چرواھوں سے کہیں زیادہ اھم معلومات حاصل ھو گئیں۔

ولی‌بابا کو پتہ چلا کہ کتوں کے ساتھ سنتریوں کے علاوہ قریبی گاؤں کی میلیشیا کے کارکن بھی حصہ لے رھے ھیں اور تمام راستے اور چوراھے ان کی نگرانی میں ھیں۔

خوش‌قسمتی سے ہوا سنتریوں کی طرف سے آ رہی تھی اور کتے اجنبیوں کی بو نہ سونگھ سکے۔

"اگر ہوا مخالف سمت سے نہ چل رہی ہوتی تو یہ تعاقب ہماری ذلت کا باعث بن جاتا" ولی‌بابا نے کہا اور اس مہم کے دوران پہلی بار اپنے ساتھیوں کو ٹوکا:

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ لوگ پہلے جیسے چوکس نہیں رہے۔ کوئی گاؤں ملتا ہے تو آپ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اچھی بری جو بھی ٹہنی ہاتھ لگتی ہے اسے چبانے لگتے ہیں..."

یہ سن‌کر اس کے ساتھی اداس ہو گئے۔ وہ سب کے سب اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار تھے کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ٹیم میں پہلے ہی جیسا میل محبت برقرار رہے۔

"ٹھیک ہے" قالی‌خان نے ولی‌بابا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے نظم و ضبط میں کچھ سستی پیدا ہو گئی ہے..."

ولی‌بابا نے سب کو ایک بار پھر دوست بنانے کے لئے کہا:

"بھائیو، آپ سے گزارش ہے کہ خود کو ذرا سنبھالئے۔ لوگوں کو دکھا دیجئے کہ آپ کیسے ہیں!"

اس کے بعد طے ہوا کہ ذرا دیر آرام سے بیٹھ‌کر بندوقیں صاف کر لی جائیں اور لوگ پرسکون ہو جائیں۔

سنتریوں سے ان کی دوسری ملاقات زیادہ ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ اس بار وہ بائیں طرف سے ٹیم کے بالکل پاس ہی دکھائی دئے۔ ولی‌بابا کے تیز کانوں نے کتوں کی خرخراہٹ سنی اور اسے لگا کہ ایک ہی منٹ میں انہیں کتوں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں‌گی، زوردار آواز میں "ٹھہر جاؤ" کا حکم سنائی دے‌گا، قدموں کی آہٹیں اور ریت کی سرسراہٹیں فضا میں ابھریں‌گی اور وہ لوگ پکڑ لئے جائیں‌گے۔ پھر سنتری سوال کریں‌گے: "آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آ رہے ہیں؟" اور تعاقب کی ساری مہم رائیگاں ہو جائے‌گی!

لیکن اس کے یہ خیالات محض اس کی بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھے۔ خطرے کا لمحہ گزر چکا تھا۔ کتے خرخرائے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھونکنا نہیں شروع کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اجنبیوں کی بو نہیں سونگھ سکے تھے۔

"داخل ہونا ہی بہتر رہےگا" اس کے تھکےماندے ساتھی جواب دیتے۔

"میلیشیاوالوں کا سامنا ہو گیا تو؟"

"اس صورت میں آپ خود ہی فیصلہ کیجئے۔"

رات کو وہ بندوقیں سنبھالے ہوئے جوار کے کھیتوں سے چپ چاپ گزرتے گاؤں میں داخل ہوتے تھے۔

ولی‌بابا کے پیچھے پیچھے چلنےوالے جوار کا پودا توڑکے اس کا زرد کھٹا رس کچھ اسی طرح چوسنے لگتے جس طرح وہ بچپن میں ہمسایہ گاؤں کے کھیتوں پر گائیں چراتے وقت چوسا کرتے تھے۔

ایک بار ولی‌بابا نے بھی جوار کے ڈنٹھل کو چوسنے کی کوشش کی لیکن اسے ابکائی آ گئی اور اس نے اسے زمین پر تھوک دیا۔

اس کی ٹیم کے لوگ مزے کے ساتھ جوار کے ڈنٹھل چبائے جا رہے تھے اور ولی‌بابا چبائے ہوئے ڈنٹھلوں کی سرسراھٹ سن رہا تھا۔

اس طرح وہ لوگ مواضعات اور کنوؤں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے فرار قیدیوں کا سراغ لگانے کی عجلت میں تنگ راستے پر پہاڑوں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے...

۶

آخرکار وہ لوگ پہاڑ کے قریب پہنچے لیکن اس سے قبل دو بار پریشانی اٹھانی پڑی۔ اور یہ پریشانی بھی انہی سنتریوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔

ایک بار بندوق سنبھالے ہوئے یہ سنتری جن کے ساتھ کتے تھے اور جو گرم وردیاں اور لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھے، دائیں طرف کوئی پانچ سو میٹر کے فاصلے پر نظر آئے۔ یوں اچانک سنتریوں کو دیکھ‌کر ولی‌بابا کی ٹیم کے ارکان ریت پر لیٹ گئے اور ٹیلے کے عقب میں چھپ جانے کے لئے رینگنے لگے۔ ولی‌بابا دیر تک اپنی گھبراھٹ پر قابو نہ پا سکا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہوا کدھر سے چل رہی ہے۔

پڑتے تھے لیکن فوراً ھی اٹھ کے پھر بھاگنے لگتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص گر کے زخمی ھو گیا تو دوسرے اسے اٹھا کے آگے بڑھنے لگے۔

انہیں دیکھتے ھی ولی بابا چیخ پڑا:

"ایک ساتھ مل کر بھاگ رھے ھیں، کمینے! بالکل بھائی بھائی جیسے لگتے ھیں!"

دو قیدی طویل قامت تھے لیکن تیسرا اتنا ناٹا تھا کہ دوسرے دونوں کے قد اس کے قد سے تقریباً ڈیڑھ گنا اونچے معلوم ھو رھے تھے۔ بے شک یہ وھی لوگ تھے جن کے بارے میں ولی بابا کی ٹیم کو بتایا گیا تھا۔

"ایک ساتھ بھاگ رھے ھیں" ولی بابا پھر چلایا۔ "ارے غوزاروالو، انہیں دوڑ کے پکڑ لیں نا؟"

قیدی پہاڑ کے پاس پہنچ کے اس پر چڑھنے لگے لیکن چٹان کے ڈھلواں ھونے کے باعث تینوں نیچے گر پڑے۔ پھر انہوں نے کسی پگڈنڈی کی تلاش میں چٹان کے پاس دھیرے دھیرے چلتے ھوئے چٹان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ رفتار کم کرکے انہوں نے پہلی غلطی کی کیونکہ اس طرح ولی بابا کی ٹیم ان لوگوں سے کچھ اور قریب ھو گئی اور اب گولیاں قیدیوں تک پہنچ سکتی تھیں۔

ولی بابا نے پگڈنڈی کو قیدیوں سے پہلے دیکھ لیا۔ وہ ایک ھموار پٹی سی نظر آ رھی تھی جو کسی طرف مڑے بغیر اوپر کی طرف جاتی تھی۔ ولی بابا نے سوچا کہ اس جگہ کھڑے ھوکر وہ پگڈنڈی پر چلنے والے قیدیوں کو صاف طور سے دیکھ سکے گا۔

اتنے میں اسے ایک اور پگڈنڈی دکھائی دی جو اب تک نگاھوں سے اوجھل رھی تھی۔ یہ پگڈنڈی بھی چٹان کی چوٹی ھی کو جاتی تھی۔

چوٹی نوکیلی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ ولی بابا نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر کیا۔ اسے چوٹی پر دو ھموار میدان نظر آئے جنہیں پتھر کا ایک تنگ پل پہاڑ سے ملاتا تھا۔

اب سب ٹھیک ھوگا۔ چٹان پر چڑھ کے قیدی ضرور پھندے میں پھنس جائیں گے۔ ٹیم کو دیکھ کر وہ پل پر سے گزر کے پہاڑ پر بھاگنے

کتے دراصل اس کی ٹیم سے پچاس میٹر دور تھے۔ ولی‌بابا اپنے ساتھیوں کی رھنمائی کرتا ھوا ٹیلے تک پہنچنے کے لئے رینگنے لگا۔ اتنے ھی میں ھوا کا رخ بدل گیا اور وہ اب کتوں کے منھ سے ٹکرانے لگی۔ ولی‌بابا نے سوچا کہ انہیں جلد از جلد ٹیلے پر چڑھ جانا چاھئے۔ سنتری اگر زیادہ تھک گئے ھوں‌گے تو وہ ٹیلے پر نہ چڑھیں‌گے اور اس کے پاس سے گزر جائیں‌گے۔ یہ بھی ممکن ھے کہ ریگستان میں طرح طرح کی بوئیں آنے کے باعث کتوں کی قوت شامہ کم ھو گئی ھو۔ اس کا مطلب یہ ھوگا کہ قلیوں کی موجودگی کا پتہ چل جانے کا خطرہ ٹل جائےگا اور ولی‌بابا کی ٹیم فرار قیدیوں کو خود ھی پکڑ لینے میں کامیاب ھو جائےگی۔

ان لوگوں نے حیرت‌انگیز تیزی کے ساتھ خود کو ریت میں گاڑ لیا اور کتوں کی توجہ ھٹانے کے لئے اپنے چہرے بدبودار گھاس سے ڈھک لئے۔ انہیں ریت میں لیٹے لیٹے پورا گھنٹہ گزر گیا۔ اس دوران ایک بار بھی نہ کتے بھونکے، نہ سنتری چیخے چلائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی چیز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرائی تھی اور وہ آگے بڑھ گئے۔

ھاں، وہ آگے چلے گئے۔ ولی‌بابا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اسے پسینے سے نم وردیوں میں سنتریوں کی پیٹھیں دکھائی دیں۔ وہ تنگ راستے کی چھان بین کرتے ھوئے باقی سنتریوں سے جا ملنے کے لئے تیزرفتاری سے چلے جا رھے تھے۔

شمال اور جنوب سے سنتری اس تنگ راستے پر پہنچ چکے تھے جس پر قیدی کسی طرف بھاگ کھڑے ھوئے تھے۔ ٹیم کے لئے ضروری تھا کہ انہیں پکڑنے میں جلدی کرے کیونکہ اگر وہ پہاڑ پر نہ پہنچ گئے ھوں‌گے تو جلد ھی سنتری اپنے گھیرے میں لے لیں‌گے۔۔۔

<

ارے، معلوم ھوتا ھے فراری نمودار ھو گئے!

دور سے تین آدمی نظر آئے۔ وہ جائے پناہ کی تلاش میں پہاڑ کی طرف بھاگ رھے تھے۔ تھکن سے اتنے چور تھے کہ بار بار گر گر

ان لوگوں کو دیکھ‌کے ولی‌بابا ایک لمحے کے لئے اپنے کام کو بھول‌کر سوچنے لگا کہ اسے صحیح معنوں میں کبھی بھی خوشی میسر نہیں ہوئی۔ نہ بچپن میں اور نہ ھی قلعے کی برجیوں پر پہرا دینے کے زمانے میں۔ وہ صرف فخر کے جذبے سے سرشار تھا کہ اپنے ساتھیوں اور قیدیوں پر حکم چلاتا ہے لیکن اقتدار ایسی چیز نہیں جو انسان کے لئے خوشی کا باعث بن سکے۔

فراری گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے لیکن کمزوری محسوس کرکے پتھروں پر لیٹ گئے۔ وہ سونا چاھتے لیکن ان کے دل اتنے زیادہ جذبات سے معمور تھے کہ نیند ھی نہیں آ رھی تھی اور وہ نیم‌خوابی کی حالت میں آھیں بھر رہے تھے۔

ولی‌بابا کی ٹیم اوپروالے میدان میں بیٹھی ان پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

قیدی تھکن اور ڈراؤنے خیالات کی وجہ سے دیر تک پریشان رہے۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے پتھروں پر رینگ رہے تھے جیسے کوئی آرام‌دہ جگہ تلاش کر رہے ہوں۔

آخرکار ان میں سے ہر ایک گرم گرم پتھروں سے چمٹ‌کے لیٹ گیا۔ ان کی آھوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور دھیرے دھیرے نیند نے تینوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

ولی‌بابا نے اس خیال سے کہ یہ لوگ سوکر تازہ دم نہ ہونے پائیں، ایک پتھر اٹھاکے نیچے میدان میں پھینکا جو ناٹے آدمی کے پاؤں کے قریب گرا اور لڑھک گیا۔

وہ چونک پڑا اور سر اٹھاکے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دونوں ساتھی سو رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ اس نے خواب میں کچھ دیکھا ہوگا اور دوبارہ لیٹ گیا۔

ولی‌بابا کا پھینکا ہوا دوسرا پتھر اس کے ھاتھ پر لگا۔

## ۸

اس بار یہ فراری چیخ اٹھا لیکن درد سے نہیں، خوف سے۔ وہ پتھر سے نہیں، اونچے میدان پر موجود لوگوں کی پرچھائیاں دیکھ‌کے

کی ہمت نہ کر سکیں گے۔ اور اگر بھاگیں گے تو ٹیم بھی پل کو پار کر کے انہیں پکڑ لے گی۔

"سنئے بھائیو، ہم لوگ انہیں چٹان پر چڑھ جانے دیں نا؟" ولی بابا نے دریافت کیا۔

ولی بابا کے ساتھی اس کی چال کو سمجھ گئے اور انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دئے۔

اس اثنا میں قیدی پگڈنڈی پر پہنچ چکے تھے۔ ناٹے آدمی کے لئے چلنا خاص طور سے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اپنے طویل قامت ساتھیوں کا سہارا لے کے لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

طویل قامت قیدی کسی عضے یا جھنجھلاھٹ کے بغیر اس کی مدد کر رہے تھے حالانکہ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی جائے پناہ یعنی پہاڑ پر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی وجہ سے ناٹے آدمی کے بہت احسان مند ہیں۔

ولی بابا کو اب ان لوگون کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اسے پتہ چلا کہ تینوں اپنے کپڑے بدل چکے ہیں۔ وہ ماھرین ارضیات جیسے پتلون اور جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔

اس نے ان لوگوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر اپنی ٹیم کو اس پگڈنڈی پر لے گیا جو بہ آسانی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ وہ لوگ اس پر چل کے قیدیوں سے کچھ پہلے ھی چٹان پر واقع میدان میں پہنچ جائیں گے۔ یہاں پہنچ کے وہ چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

اتنے میں وہ تینوں نیچے والے میدان پر دکھائی دئے۔ وہ تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے پگڈنڈی پر اور چٹان کے دامن میں پتھروں پر نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر کہ تعاقب کا خطرہ ختم ہو چکا ھے، ایک دوسرے کو گلے لگانے لگے۔ وہ آھیں بھر رہے تھے جیسے انہیں رونا آ رہا ہو اور چیخ رہے تھے جیسے ان کا جی ہنسنے کو چاھتا ہو۔

"آزادی! آزادی!.." چھوٹے قدوالے نے دھیرے سے کہا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ خوشی جھلکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چٹان کے میدان پر جھلسے ہوئے پتھروں اور عقابوں کے پروں کے درمیان نہیں بلکہ اپنے گھر میں افراد خاندان کے درمیان ہو۔

لیکن صرف اس وقت جبکہ سب لوگ نیچے پگڈنڈی پر پہنچ چکے تھے۔

ولی بابا کو توقع تھی کہ گرفتار کر لئے جانے کا قیدیوں پر بہت ہی سخت رد عمل ہوگا اور بدحواس ہوکے چیخنے چلانے لگیں گے لیکن قیدی ادھر ادھر مارے مارے پھرنے، بےخواب راتیں گزارنے اور بھوک اور تھکن برداشت کرنے سے اتنے بدحال ہو چکے تھے لیکن اپنے انجام پر خوف‌زدہ نہیں نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے سوچا تھا قیدخانے سے فرار ہوکر آزادی کے ساتھ چند گھنٹے گزاریں گے، کسی پہاڑی مقام پر سوئیں گے اور اس کے بعد قیدخانے میں واپس آکر باقی سزا کاٹیں گے۔

وہ لوگ ٹیم کے ارکان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ ہیں کون لوگ۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ سنتری ہیں، نہ میلیشیاوالے۔ دس عام افراد انہیں اپنی بندوقوں کی نگرانی میں پگڈنڈی پر لئے جا رہے تھے۔

آخر یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ والنٹیر؟ جھگڑا فساد کرنےوالے لوگ؟ کہیں وہ خود تو مجرم نہیں ہیں، ایسے ڈاکو تو نہیں ہیں جو ان کو رہا کرنے کے لئے رقم اینٹھنا چاہتے ہوں؟

ولی بابا چلتے چلتے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے قیدخانے میں ان لوگوں کو دیکھا تھا کہ نہیں۔ شاید وہ بھی ان ہزاروں قیدیوں میں سے ہوں جن سے ولی‌بابا قیدخانے میں ملا تھا؟

نہیں، اسے کوئی بھی قیدی یاد نہیں آ رہا تھا۔ سب کے سب ہمیشہ بھورے رنگ کے ایک ہجوم کی شکل میں اس کے ذہن میں آتے تھے۔ سب کے چہرے ایک جیسے معلوم ہوتے تھے۔ قیدی سر اٹھائے بغیر، اپنے پہریداروں کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے تھے۔ ان کا بھی اور ولی‌بابا کی ٹیم کے لوگوں کا بھی خیال تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پہلی بار ملے ہیں۔

خیر، یوں ہی سہی۔ اب سوال یہ ہے کہ قیدیوں کو لےکے ریگستان کو کس طرح پار کیا جائے کہ اصلی سنتری انہیں نہ دیکھ سکیں۔

ٹیم نے اپنی تمام قوت سے کام لےکے ان فراریوں کو پکڑا ہے۔ اصلی سنتریوں سے ملاقات ہو گئی تو کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ یہی

خوف‌زدہ ہو گیا تھا۔ اسے پہاڑوں کی رحم اور غدار خاموشی میں لوگوں اور بندوقوں کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"اب بیکار..." اس نے سوچا اور جیت جانےوالوں سے رحم کی التجا کے طور پر اپنے ھاتھ اوپر اٹھا دئے۔

اس نے اداسی کے ساتھ یہ بھی سوچا: "کیسی حماقت تھی..."

"دوسروں کو جگا دو!" ولی‌بابا نے اوپر سے حکم دیا۔

وہ پتھر پر گر پڑا اور رینگتا ہوا دوسرے دونوں ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ لیکن انہیں چھوتے ہوئے بھی اسے ڈر لگا۔ اس نے سوچا کہ انہیں جگانا بیکار ہوگا اور اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔ پھر وہ اپنے ھاتھ اوپر اٹھاکے بےحس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

"بہتر ہوگا کہ انہیں بیدار کرکے باندھا جائے" ولی‌بابا نے نیچےوالے میدان پر اترتے ہوئے کہا اور ناٹے آدمی کو دوبارہ حکم دیا: "زور سے آواز دو۔ اپنے ان دغابازوں سے کہو کہ جاگنے کا وقت ہو گیا۔"

چند لمحات کے اندر ھی ناٹے آدمی کا چہرہ اتنا متغیر ہو گیا تھا کہ وہ ولی‌بابا کو بالکل مختلف شخص معلوم ہوا۔ جیسے کوئی چوتھا فراری ہو۔

"ایسے موقعوں پر ٹھیک ھی کہا جاتا ھے: یہ آدمی ہوش‌وحواس کھو بیٹھا" ولی‌بابا نے دل ھی دل میں کہا۔

"تم خود اپنے ساتھیوں کے ھاتھ باندھ دو" قالی‌خان نے اسے حکم دیا اور سورج کی طرف دیکھا جو پہاڑ کے عقب میں غروب ہونے کو تھا۔ دھندلکا چھایا جا رہا تھا۔

ناٹے آدمی کی طرف رسی پھینک دی گئی لیکن وہ اس حکم کی بھی تعمیل نہ کر سکا اور پہلے ھی کی طرح ھاتھ اٹھاکے سیدھا کھڑا رہا۔

آخر قالی‌خان اور ٹیم کے دوسرے دو افراد نے سوئے ہوئے قیدیوں کے ھاتھ باندھ دئے۔

وہ دونوں اب بھی نہ جاگے اور سوتے ہوئے آھیں بھرتے رہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں۔ آخر پستہ‌قد قیدی کو نیچے کی طرف بھگایا اور خوابیدہ قیدیوں کو گھسیٹا گیا تو وہ جاگ اٹھے

خفیه دروازے کا کھلنا آسان تھوڑی تھا۔ ولی‌بابا اور اس کے ساتھی اسے کھولنے کے لئے دیر تک اس پر ٹھوکریں مارتے رہے۔ اس دوران قیدی ان بیرکوں کے آهنی دروازوں کو دیکھتے رهے جن میں ان کی بیرک نمبر چار بھی شامل تھی۔

آخرکار دروازہ کھل گیا اور سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کی ناکوں میں پھپھوندی اور بارود کی بو بھر گئی۔ خالی قیدخانے کے اندھے پہریدار یعنی چمگاڈر دروازے اور دوسرے شگافوں سے اڑکے باهر آ گئے۔

وہ لوگ زینے کے ذریعے اندر آئے۔ یہ پہریداروں کے آرام کرنے کی جگہ تھی جس میں ایک دوسرے سے ملحق تین کمرے تھے: ڈومینو کھیلنے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ اور بندوقیں رکھنے کا کمرہ۔

قیدی خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ قلعے میں پہنچ‌کے ان کی غنودگی اور افسردگی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رهے تھے جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رهے هوں کہ انہیں کہاں اور کیوں لایا گیا هے اور اب ان کا انجام کیا هوگا۔

ان میں سے کسی کو خیال بھی نہ آیا هوگا کہ اس سابق قیدخانے کو انہیں دوبارہ دیکھنے کا موقع ملےگا۔ انہوں نے سوچا بھی هوگا تو صرف یہ کہ رهائی کے بعد کبھی قلعے میں آنا هوا تبھی اسے دیکھ سکیں‌گے جس کا امکان بہت کم تھا۔

"اب یہاں زار کی طرح زندگی بسر کروگے" ولی‌بابا نے خالی کمروں میں گھومتے پھرتے اور ان کے فرش اور دیواروں کی مضبوطی کا نگاهوں هی نگاهوں میں اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ یہ کہنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ خاصی سنگین صورت‌حال سے دوچار هے اور اس نے سخت لہجے میں کہا: "آج تو خالی فرش هی پر رات بسر کرنی هوگی۔ بستر کل ملیں‌گے۔"

"همیں بیرک نمبر چار میں کیوں نہیں ٹھہرنے دیا گیا؟" پستہ‌قد قیدی نے پوچھا۔

"چپ رهو!" قالی‌خان نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کو پہلے کمرے میں اور طویل‌قامت قیدیوں کو باقی دونوں کمروں میں بند کر دیا گیا۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھی اپنا سابق کام پھر سے سنبھالنے

نا که وہ لوگ ٹیم کا شکریہ ادا کریں اور قیدیوں کو جیل واپس لے جائیں؟ اس طرح تو کامیابی کا سہرا سنتریوں ھی کے سر رھےگا، عزت انھی کو حاصل ھوگی۔

نھیں، ولی‌بابا کسی دوسرے مقام پر، کسی دوسرے موقعے پر قیدیوں کو سنتریوں کے حوالے کرےگا۔ اس وقت تو اھم بات یه ھے که گھر تک کا فاصله طے کیا جائے۔

"ان لوگوں کے ھاتھ کھول دو!" ولی‌بابا نے حکم دیا۔

قیدیوں کے ھاتھ کھول دئے گئے اور وہ بڑی فرمانبرداری کے ساتھ ٹیم کے آگے آگے چلنے لگے۔

ٹیم نے پتھریلے دامن کوہ کو پار کیا۔ پھر کھاری زمین کی تنگ پٹی سے گزرتی ھوئی آگے بڑھنے لگی۔ اسے پورے تین دنوں تک گرم ریت پر سفر کرنا تھا۔

بھاپ پھاڑی دروں سے ابھرکے چٹان کے اوپر منڈلا رھی تھی جیسے وہ قیدیوں کو آخری سلام کر رھی ھو...

## ۹

قلعے کا آھنی پھاٹک ایک بار پھر کھل گیا۔ تاریک اندرونی برآمدے میں ٹارچ سے روشنی ھوئی لیکن لوگ ایک دوسرے کو نھیں دیکھ پا رھے تھے۔ گیلی اور گرم دیواریں ساری روشنی کو اپنے اندر جذب کئے لے رھی تھیں۔ یھاں تو جالیوں کے اندر تمام بلبوں کے جل اٹھنے کے بعد بھی نیم‌تاریکی برقرار رھتی تھی۔

برآمدوں کے لمبے راستے کے وسط میں پھنچ‌کے انھیں روک دیا گیا۔ ولی‌بابا نے جیب سے کنجیوں کا گچھا نکال‌کے ایک کنجی منتخب کی اور ٹارچ دکھانے کا حکم دیا۔ روشنی میں وہ خفیه دروازہ نظر آیا جیسے بھت ھی کم استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے کھولنے کی ضرورت صرف نئے قیدیوں کی آمد پر پیدا ھوتی تھی۔ انھیں اس دروازے کے ذریعے کاغذات کی تیاری کے سلسلے میں قیدخانے کے دفتر میں پھنچایا جاتا تھا۔ روزمرہ کاموں کے لئے سیڑھیوں کے ذریعے کھڑکی کا استعمال ھوتا تھا۔

پہریدار تھے اور قلعے سے باھر رھنےوالوں کو ان لوگوں کی مدد کرنی ھوتی تھی۔ اب تقدیر نے ان کا کیسا مذاق اڑایا تھا۔ اب وہ خود سنتریوں کی مدد کر رھے تھے۔

صحن سے واپس آکے ولی‌بابا نے چوکیوں کا معائنہ کیا اور اپنے ساتھیوں سے پہرے کے متعلق تفصیلات پوچھیں۔ اس کے بعد اس نے خود سوراخ سے جھانک‌کے اندر دیکھا۔ پستہ‌قد قیدی بھی تھک‌کے اپنے ساتھیوں کی طرح سو گیا تھا۔

## ۱۰

اگلے روز انھوں نے قیدیوں سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے بڑے کمرے میں جہاں پہلے قیدخانے کا سربراہ بیٹھا کرتا تھا، دونوں طویل‌قامت قیدیوں میں سے ایک کو ولی‌بابا کے پاس لایا گیا۔ ولی‌بابا کے لئے کہیں سے ایک میز اور اسٹول کا انتظام کر دیا گیا تھا اور وہ کسی جج کے انداز میں بیٹھا ھوا تھا۔

"تمھارا نام کیا ھے؟"

"نوروف" قیدی نے جس طرح جواب دیا اس سے لگتا تھا کہ اسے ابھی تک صورت‌حال کی سنجیدگی کا احساس نہیں ھوا تھا۔

"تمھیں سزا کس جرم میں ھوئی تھی؟"

"کار چرانے کے سلسلے میں۔ تادیبی محنت کے لئے پانچ سال قید کی سزا ھوئی تھی۔ دو سال کاٹ چکا ھوں..."

"اب تو قید کی مدت میں اور بھی اضافہ ھو جائےگا" قالی‌خان بول پڑا۔

"جانتا ھوں" قیدی نے اداسی کے ساتھ جواب دیا۔ اچانک اس نے جلدی جلدی جیسے اسے اپنی بات کاٹ دئے جانے کا ڈر ھو، بعض الفاظ اور حتی‌کہ پورے کے پورے جملے نگلتے ھوئے کہا: "یہ اسی ناٹے آدمی کا کام تھا۔ اسی نے سرنگ کھودنے کی رھنمائی کی۔ ھم تو صرف اس کے منصوبے پر عمل کر رھے تھے..."

"آپ لوگ ھمیشہ ھی کسی کا منصوبہ پورا کرتے ھیں" ولی‌بابا

کو اتنے زیادہ بےتاب تھے کہ انہوں نے گھر نہ جانے اور ایک ساتھ پہرا دینے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے خود کو تین گروہوں میں بانٹ کے بند کمروں کے درمیانی تنگ برآمدوں میں پہرا دینا شروع کر دیا۔ ان کے جسموں سے پسینے اور سکساؤل کی بو آ رہی تھی۔

گرم لانگ بوٹوں کی وجہ سے ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور کھڑے ہونے کی سکت باقی نہ تھی۔ وہ بہت چاہتے تھے کہ جوتے اتارکے پیروں میں پھر سے پٹیاں باندھ لیں لیکن پہرے کے دوران بیٹھنا ممنوع ہونے کی بنا پر انہیں بیٹھنے کا خیال نہ آیا اور کندھوں پر بندوقیں رکھے ہوئے ٹہلتے رہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ دروازے کے پاس جاکے دیر تک سوراخ سے اندر جھانکتے رہتے تھے۔

دونوں طویل‌قامت قیدی ٹھنڈے فرش پر لیٹ کے سو گئے تھے لیکن چھوٹے قدوالا فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہریدار اس کی صرف پیٹھ دیکھ پاتے تھے اور انہیں اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

ولی‌بابا اوپر پہنچ‌کے صحن میں گھوم پھر رہا تھا، یہ سوچ‌کے خوش ہو رہا تھا کہ اس کی ٹیم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل کا دن، قلعے میں قیدیوں کے قیام کا دوسرا دن کیسے گزرےگا۔ اسے قیدخانے کے سربراہ کا خیال بھی آیا اور اس نے سوچا کہ قیدیوں کے پکڑ لئے جانے کی خبر سن‌کر اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ سب کا شکریہ ادا کرےگا، مبارک‌باد دےگا اور اسی طرح کی دوسری باتیں کرےگا۔

بکواس جیسی ہوں‌گی یہ ساری باتیں۔ ان کی اہمیت ہی کیا ہے۔ وہ لوگ نہ کسی سے انتقام لے رہے ہیں، نہ ہی کسی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ملازمت سے متعلق کسی فرض کا نہیں بلکہ شہریوں کی حیثیت سے اپنی ذمےداریاں نبھانے کا آئینہ‌دار ہے۔

"ہمیں اپنے کام میں عام شہریوں سے مدد لینی چاہئے" ولی‌بابا کو اس سلسلے میں قیدخانے کے سربراہ کی بات یاد آ گئی۔

یہ بات جب کہی گئی تھی اس وقت ولی‌بابا اور اس کے ساتھی

"پارپیئف۔ لیکن آپ چاھتے کیا ھیں؟ آپ ھیں کون؟"

"تمہیں کس جرم میں سزا ھوئی تھی؟"

"میں جواب دے چکا۔ بس۔"

"کس کو جواب دے چکے ھو؟"

"آپ کو دے چکا اور ان کو بھی۔ لیکن آخر آپ ھیں کون؟ آپ کو پوچھ گچھ کرنے کا حق بھی ھے؟"

"تمہارا جرم کیا تھا؟" ولی‌بابا نے پرسکون رهتے ھوئے سوال دوھرایا۔

"سکے بنا رھا تھا۔ جعلی سکے... تین سال کی قید جھیل چکا ھوں، بارہ سال اور باقی ھیں۔"

"سرنگ کس نے کھودی تھی؟"

"ارے چچا، پہلے ھی یہ سوال پوچھنا تھا! میں اور نوروف کھود رھے تھے اور وہ ناٹا کمینہ ھمیں اس کی ھدایت دے رھا تھا۔ مجھے افسوس ھے کہ ھم نے اسے ریگستان میں کیوں نہ چھوڑ دیا جب اس کے پیر میں چوٹ آ گئی تھی۔ چیلیں اسے نوچ کے کھا گئی ھوتیں!"

"اسے لے جاؤ!" ولی‌بابا نے تھکن سے چور ھوکے کہا۔

اسے لگ رھا تھا کہ ان تینوں کا جرم ثابت کرنا مشکل ھوگا کیونکہ وہ حیلے بہانے کریں گے، ھم‌کاروں اور رفیقوں کی طرح اس آدمی کا نام بھی نہ بتاتے ھوں گے جو دن رات سوچتا رھا کہ آزادی کا راستہ کس طرح تلاش کیا جائے۔ ولی بابا کا خیال تھا کہ ان کے راز کا پتہ لگانا سخت دشوار ثابت ھوگا۔

"جھگڑالو جعل‌ساز!" اس نے پارپیئف کو کمرے سے لے جانے کا حکم دیتے ھوئے سوچا۔

"کتیا کے بچے!" تیسرے قیدی کا انتظار کرتے ھوئے اس نے گالی دی۔

چھوٹے قدوالا کمرے میں آیا تو وہ غصے سے بےقابو ھو کر چیخ پڑا:

"تو تم ان لوگوں کے سرغنہ ھو نا؟"

قیدی نے آنکھ بھینچ لی جیسے اس کے منہ میں چوٹ لگ گئی ھو۔ پھر اس نے ولی‌بابا کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے پرسکون انداز میں کہا:

نے نفرت سے کہا۔ "برائی آپ کی نہیں، دوسروں کی ہوتی ہے نا؟ وہ کار تھی کس کی؟"

"میرا خیال تھا کہ وہ کسی کی ذاتی کار... پھر معلوم ہوا کہ وہ کسی دفتر کی تھی۔"

"یہ تمہارا پہلا جرم تھا نا؟"

"نہیں، دوسرا..."

"کیا پہلی بار بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں، اس بار وہ ناٹا آدمی میرے ساتھ نہیں تھا" قیدی نے ولی‌بابا کو توجہ کے ساتھ دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سوالات کرنے کا انداز پیشہ‌ور تفتیش افسر کے انداز سے بہت مختلف ہے۔ اسٹول پر بیٹھے ہوئے آدمی کو جو سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، دیکھ‌کر اور اس کے سیدھے سادے سوالات کو سن‌کر نوروف کو حیرت بھی ہوئی اور مزا بھی آیا۔

اسے اس سے قبل جن سوالات کا جواب دینا پڑا تھا وہ بہت مختصر ہوتے تھے اور جواب دینے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ دراصل یہ سوالات بڑی تیزی اور ہوشیاری سے پوچھے جاتے تھے تاکہ ملزم جھوٹ بولنا ترک کرکے سچ بولنے لگے خواہ یہ اس کے حق ہی میں کیوں نہ ہو۔ نوروف کے دل میں ولی‌بابا سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ اس کے دوسرے سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار ہو گیا لیکن ولی‌بابا نے اچانک اسے کمرے سے واپس لے جانے کا حکم دے‌کر کہا:

"جانچ سے پتہ چلے‌گا کہ تم نے سچ کہا ہے یا نہیں۔ اچھا، اب جاؤ۔"

"ہمیں قیدخانے میں واپس کب پہنچایا جائے‌گا؟" قیدی نے دریافت کیا۔ وہ کوئی خبر سننا چاھتا تھا لیکن قالی‌خان نے اسے دروازے کی طرف ڈھکیل دیا۔

اب دوسرا طویل‌قامت قیدی لایا گیا۔

"تمہارا نام؟"

یہ شخص کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ بار بار آنکھیں گھماتا اور تیوریاں چڑھاتا تھا جیسے ناراض ہو کہ اسے جاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

ہے، شہری موسائیف! تمہیں اس سلسلے میں کوئی بھی معاف نہ کرے گا!"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے" قیدی کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا اور وہ پہلے ہی کی طرح خوش‌اخلاقی سے مگر طنزیہ لہجے میں بات کرنے لگا: "سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے بھئی تفتیش کرنےوالے شہری کہ چھ مہینے کاٹ چکا تھا اور اب صرف چھ ہی مہینے باقی رہ گئے تھے۔ بہت ہی مختصر مدت... نہیں، میں غالباً زندگی بھر سرنگ، خندق اور زمین‌دوز راستے کھودنے کی خراب عادت سے چھٹکارا نہ پا سکوں‌گا۔ اس کے بغیر میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔"

ولی‌بابا خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ قیدخانے میں وہ برسوں کام کر چکا تھا لیکن کسی مجرم کے روبرو بیٹھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تفتیش کرنےوالوں کا کام کتنا دلچسپ ہوتا ہوگا" اس نے سوچا۔ "یہ تو قیدخانے کے تمام دوسرے کاموں سے دلچسپ معلوم ہوتا ہے..."

موسائیف کو دیکھتے ہوئے اسے تفتیش کرنےوالے کی حیثیت سے کسی معمے کو حل کرنے کا خیال آیا۔ کسی آسان سے معمے کا، مثلاً یہی کہ آدمی کو کس جرم میں ایک سال کی سزا مل سکتی ہے؟

گنڈہ‌گردی اور بدمعاشی کے لئے؟ نہیں۔ اس کے سامنے ایک لاابالی تعلیم‌یافتہ شخص بیٹھا ہوا ہے۔ گنڈہ‌گردی تو شرابی، طفیلی اور ان کے جیسے لوگ کرتے ہیں۔

تو پھر غالباً اس کے جرم کا تعلق اس کے کام سے ہوگا مثلاً یہ کہ سرنگ میں اوپر سے تودا گر پڑا مگر جانی نقصان نہیں ہوا۔ نہیں، نہیں، ایسے جرم میں بھی ایک سال کی نہیں، کم از کم تین سال کی سزا ملتی ہے۔

ولی‌بابا نے نفسیاتی طریقے سے موسائیف کے جرم کا اندازہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور دونوں کی نگاہیں چار ہو گئیں۔ ولی‌بابا سمٹ سا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ قیدی بھی اس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کون کس کو سمجھ لے گا؟

"نہیں، میں سرغنہ نہیں ہوں، بس ایک معمولی قیدی ہوں۔"
"سرنگ کھودنا تو تمہی نے سکھایا تھا؟ اقرار کر لو، ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

قیدی، تفتیش کرنےوالوں کے منہ سے متعدد بار "اقرار کر لو، ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے" سن چکا تھا اور اس جملے سے ڈرتا بھی تھا کیونکہ دراصل وہ کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"جی ہاں۔ اس کا میرے پیشے سے تعلق ہے۔ قید ہونے سے قبل میں سول انجینیر تھا اور سرنگ کھودنے کا کام کرتا تھا۔ میرا نام موسائیف ہے۔ عمر چالیس سال ہے۔ بخارا میں پیدا ہوا تھا" اس نے خوشی خوشی جواب دیا کیونکہ اسے بعد میں پوچھے جانےوالے سوالات کا بخوبی علم تھا۔

"تو تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو نا؟ ولی‌بابا نے تھکے تھکے سے انداز میں پوچھا۔

"کون سا جرم؟" موسائیف ولی‌بابا کے سوال کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

"سرنگ کھودنے کی رہنمائی کرنے کا۔ بھاڑ میں جاؤ!"

"جی ہاں، اقرار کرتا ہوں" موسائیف نے نرمی سے کہا۔

"پہلے کتنے سال کی سزا ملی تھی؟"

"ایک سال کی۔"

"صرف ایک سال کی؟" ولی‌بابا نے متعجب ہوکے پوچھا۔

"جی ہاں" موسائیف نے ولی‌بابا کو حیرت سے دیکھا۔ اسے ولی‌بابا کے لہجے میں ہمدردی کا احساس ہوا اور اس نے سوچا کہ اس انداز میں سوال یا تو کوئی ناتجربہ‌کار تفتیش‌کنندہ پوچھ سکتا ہے یا پھر عام زندگی کا دوست یا واقف‌کار۔

اس نے بڑی حیرت کے ساتھ سوچا کہ آخر یہ آدمی ہے کون جو تفتیش کے معاملے میں بالکل اناڑی ہے۔

"بکواس ہے! تم بھی کیسے بےوقوف ہو!" ولی‌بابا نے برھمی کے ساتھ کہا۔ "صرف ایک سال کی سزا ملی اور تم نے سکون سے بیٹھنے کے بجائے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اب مزید تین سال کی سزا بھگتنی پڑےگی؟... کیا حماقت

جانتا تھا کہ غوزاروالوں کو قیدیوں کی آمد کی بھنک لگ گئی تو جو افراد قیدخانے میں پہلے باورچی اور درزن کی حیثیت سے کام کرتے تھے وہ انہیں، دیکھنے کے لئے ضرور قلعے میں آ دھمکیں گے، الٹے سیدھے مشورے دیں گے اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑائیں گے۔

ولی‌بابا نے خوب سوچ سمجھکے فیصلہ کیا تھا کہ قیدیوں کا معاملہ صرف اس تک اور اس کی ٹیم ہی تک محدود رہےگا۔ ان لوگوں کو پوری طرح خیال رکھنا ہوگا کہ باھر کے لوگ اس معاملے پر اثرانداز نہ ہو سکیں اور اس کے متعلق افواھیں نہ پھیلیں۔ اسی لئے کھانے پینے کی چیزیں پڑوسی گاؤں سے لائی جاتی تھیں۔ قالی‌خان ہر روز شام کو وھاں چلا جاتا اور صبح کو قیدیوں کے لئے وھی کھانے تیار کرتا جو انہیں قیدخانے میں ملتے تھے۔ یہ کھانے انہیں مقررہ مقدار میں دئے جاتے تھے۔

قیدیوں کو مقررہ وقت پر صحن میں آکر ٹہلنے کی اجازت ملتی تھی۔ انہیں صبح کو چھ بجے جگایا جاتا اور رات میں بارہ بجے سونے کی اجازت دی جاتی۔

قیدیوں کی زندگی میں صرف ایک ھی بات نئی تھی اور وہ یہ کہ انہیں نہر کھودنے یا ریگستان میں کچھ تعمیر کرنے کے کام سے جو انہیں قیدخانے میں ہر روز کرنا پڑتا تھا، چھٹی ملی ہوئی تھی۔

ایک بار ٹیم کے لئے ایک الجھن اٹھ کھڑی ہوئی۔ برجی میں کھڑا ھوا پہریدار دوڑا دوڑا ولی‌بابا کے پاس آیا اور اطلاع دی کہ معمار دریا کو پار کرکے قلعے کے پھاٹک کی طرف آ رہے ھیں۔ شاید وہ ایک بار پھر قلعے کو دیکھنا چاھتے تھے۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھی اندرونی صحن میں کھڑے باھر کی آوازیں سن رہے تھے۔ معماروں نے پھاٹک کو ڈھکیلا، زور زور سے کھٹکھٹایا، قالی‌خان کو پکارا اور پھاٹک کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے باتیں کرتے رہے۔ آخر ناکام ھوکے کشتیوں میں بیٹھے اور واپس لوٹ گئے۔

قیدیوں کو باھر پھاٹک کے کھٹکھائے جانے کی آوازیں سنائی دیں تو وہ اپنے کمروں کے دروازوں پر مکے مارنے لگے جیسے آنےوالوں کو اپنی مدد کے لئے بلانا چاھتے ھوں۔

ہاں، گھبرائے ہوئے چہروں‌والے دبلے پتلے کمزور لوگ عموماً رشک کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور محبوبہ پر بلاوجہ شک کرتے ہیں جس کا سلسلہ آخرکار اس حد تک پہنچتا ہے کہ وہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

"ارے، یہ تو محبت کی کہانی معلوم ہوتی ہے، لعنت ہو مجھ پر!" ولی‌بابا نے دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے سوچا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تفتیش سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔

"تم پر رشک کے تحت نامناسب اقدامات کرنے کا الزام لگایا گیا تھا نا؟" ولی‌بابا نے پوچھ گچھ ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"رشک؟" موسائیف شرماتے ہوئے مسکرایا۔ "جی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں معقولیت‌پسند آدمی ہوں۔ میرے نزدیک رشک ایک ایسا جذبہ ہے جو زیادہ پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ صد افسوس!"

"افسوس کی بات کیا ہے؟ میں تم سے کچھ پوچھ تھوڑی رہا ہوں۔ یہ تو محض میری قیاس‌آرائی ہے۔"

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی!" قیدی نے حیرت ظاہر کی۔ "میں آپ کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ ہیں کون اور میں کہاں ہوں۔ دراصل یہ کام آپ کے لئے موزوں نہیں ہے۔"

"تم کو مجھے نہیں سمجھنا ہے بلکہ مجھے تمہیں سمجھنا ہے۔ تم ایک مفرور مجرم ہو۔ اچھا، اب جاؤ!" ولی‌بابا کو یہ اندازہ لگاکے کہ وہ خاصے ذہین آدمی سے بات چیت کر رہا ہے، غصہ آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے تو خاص طور سے تیاری کی ضرورت ہے ورنہ مجرم کو نہیں بلکہ خود اس کو مجرم کے سوالات کا جواب دینا ہوگا...

## ۱۱

غوزار ہی میں کیا، سارے علاقے میں کسی کو خبر نہ تھی کہ قلعے میں کیا ہو رہا ہے۔ ولی‌بابا نے قلعے میں تمام انتظامات کچھ اس طرح کئے تھے کہ باہر کسی کو خاک بھی پتہ نہ چل سکے۔ وہ

"تو تم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو نا؟" ولی‌بابا نے کھوئے ہوئے انداز میں یہ سوال دوھرایا۔

"جی ھاں، میں نے سرنگ کھودی تھی۔ میں جو بیان دے چکا ہوں اس سے انکار تھوڑی کروں‌گا۔"

"کتنے سال کی سزا ملی تھی؟"

"بتا تو چکا ہوں: ایک سال کی۔"

"سرنگ کتنے دن میں کھودی تھی؟"

"کتنے دن؟" قیدی کے ھونٹوں پر اداس مسکراھٹ بکھر گئی جیسے اسے ولی‌بابا پر ترس آ رھا ہو۔ "اگر دن... دراصل قیدخانے میں سرنگ کھودنے میں اتنا ھی وقت لگا جتنا باھر ایک چھوٹی سرنگ کھودنے میں لگتا ھے۔ تین مہینوں کا کام تھا حالانکہ ھماری سرنگ باھر کی عام سرنگوں کی لمبائی کے بیسویں حصے کے برابر ھی رھی ہوگی۔"

"اس کا سبب مشینوں سے محرومی تھا نا؟" ولی‌بابا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"بڑے تیزفہم ھیں آپ!" قیدی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

ولی‌بابا ذرا دیر تک خاموش رھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں مشتعل ہوکے قیدی کو ایسے انداز میں باتیں کرنے کی بنا پر گالی نہ دے بیٹھے۔ آخر اس نے کہا:

"پہلے دن تم نے بتایا تھا کہ قیدخانے میں چھ مہینے گزار چکے ہو۔ اس کا مطلب یہ ھوا کہ سزا کی نصف مدت پوری کر چکے ہو۔ ان چھ مہینوں میں سے تین مہینے تم نے سرنگ کھودنے پر صرف کئے۔ ٹھیک ھے نا؟ اچھا تو باقی تین مہینے کیسے گزارے؟ فرار ہونے کا منصوبہ تیار کرنے میں نا؟" ولی‌بابا نے دریافت کیا۔ اسے یہ محسوس نہ ھوا کہ اس کے سوالات ایک بار پھر غیرپیشہ‌ور تفتیش کرنے‌والے کے سوالات جیسے ھو گئے ھیں۔

لیکن موسائیف کو اس بات کا احساس ھو گیا اور اس نے خوشی خوشی جواب دیا:

"نہیں، نہیں، فرار کا منصوبہ تو صرف دو راتوں کے اندر ھی تیار کر لیا تھا۔ دن میں ھم لوگ کام پر جا رھے تھے تو میں نے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیا اور سرسری نگاھوں ھی سے پتہ لگا لیا

قالی‌خان نے ان کے پاس پہنچ کے ان کا جوش ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے طویل‌قامت قیدیوں کو پیچھے ڈھکیلا اور وہ کمزوری محسوس کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔

چھوٹے قدوالا جو ان دونوں سے زیادہ ہوشیار تھا، صبر کرکے خود ہی پرسکون ہو گیا۔ ولی‌بابا نے ان لوگوں کو سزا کے طور پر چوبیس گھنٹے کھانا نہ دیا۔

پارپیئف نے جو بہت جھگڑالو تھا، موسائیف پر الزام لگایا کہ اسی نے سمجھایا تھا کہ باہر پھاٹک کھٹکھٹائے جانے کی صورت میں اپنے کمروں کے دروازوں کو بھڑبھڑانا چاھئے تاکہ باھری دنیا کو ان کی حالت کا علم ہو سکے۔

اس نے ولی‌بابا سے کہا:

"میں جانتا ہوں کہ موسائیف نے آپ کے دماغ میں یہ خیال بٹھا دیا ہے کہ وہ بےقصور ہے۔ اسی لئے آپ اس کی باتوں کو دیر تک توجہ کے ساتھ سنتے رہتے ہیں۔"

"اس نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا" ولی‌بابا نے ناراض ہوکے کہا۔

"عجیب بات ہے" پارپیئف نے بےاعتمادی سے کہا۔ "اس سے پوچھئے۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ کوئی شخص اپنے جرم کا اعترات کرنے کے باوجود خود کو بےقصور تصور کرے؟"

"ارے، اسے لے جاؤ!" ولی‌بابا نے قالی‌خان کو حکم دیا۔

"وہ احمقانہ دستک کیوں دی جا رہی تھی؟" اس نے موسائیف سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیسی دستک؟ وہ جو باہر کوئی پھاٹک کھٹکھٹا رہا تھا؟"

"احمق بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم لوگ کیوں اپنے دروازے پیٹ رہے تھے؟"

"معاف کیجئےگا۔ اب آپ کی بات میری سمجھ میں آئی" قیدی نے معذرتی انداز میں کہا۔ "یہ عادت میرے پیشے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ معمار سرنگ کھودنے لگتے ہیں تو دستک دےکے معلوم کرتے رہتے ہیں کہ ان کے ساتھی دور ہیں یا قریب۔ وہاں تو کسی بھی وقت اوپر سے پتھر گر سکتے ہیں۔ دوسری ناگھانی مصیبتوں کا بھی ڈر رہتا ہے..."

دونوں دوسرے قیدیوں نے دروازے کے پیچھے قدموں کی آھٹیں سنیں اور دیکھا کہ موسائیف کو کہیں لے جایا جا رہا ھے تو پریشان ھوکے دیوار کو زور زور سے پیٹنے لگے۔ آخرکار قالی‌خان نے ایک بار پھر انھیں خاموش ھو جانے پر مجبور کر دیا۔

وہ خاموش نہیں ھونا چاھتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ موسائیف کی حالت پر فکرمند ھو رھے ھیں۔

"کتنے عجیب و غریب ھیں یہ مجرم بھی!" ولی‌بابا نے موسائیف کے پیچھے پیچھے چلتے ھوئے سوچا۔ "ان سے پوچھ گچھ کی جا رھی تھی تو وہ موسائیف پر کیچڑ اچھال رھے تھے اور اب دروازے کو پیٹ پیٹ کے اس سے اظہار ھمدردی کر رھے ھیں..."

موسائیف اٹکل پچو ایک بیرک کے دروازے پر پہنچ کے کھڑا ھو گیا۔ ولی‌بابا نے ٹارچ دکھائی تو سب کو پتہ چلا کہ یہ وھی بیرک نمبر چار ھے۔

"اسے کھولئے۔"

قالی‌خان نے کنجیوں کے گچھے سے ایک کنجی منتخب کی جس پر "۴" لکھا ھوا تھا اور دروازہ کھول دیا۔ سیلن اور بو کا بھپکا نکلا اور موسائیف نے گھبرائی ھوئی آواز میں کہا:

"حیرت کی بات ھے۔ ھم لوگوں کی بو آ رھی ھے... تازی ھوا کا گزر نہیں ھوتا اس لئے شاید یہ بو ھمیشہ باقی رھےگی۔"

کئی ٹارچوں سے بیرک میں روشنی کی گئی لیکن برآمدوں کی طرح بیرک بھی انھیں اپنے اندر جذب کئے لے رھی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ روشنی کہیں غائب ھوئی جا رھی ھے۔

قیدی نے فرش پر جڑے ھوئے پتھر کے چوکوں کا حساب لگانا شروع کیا اور دائیں کونے تک پہنچ کے ایک چوکے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ رھی وہ سرنگ..."

ٹیم کے چار افراد اس چوکے کو اٹھانے لگے جو دیکھنے میں دوسرے چوکوں سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ آخرکار اسے اس کی جگہ سے ھٹایا گیا تو نیچے سرنگ نظر آئی۔

که دیواریں کتنی موٹی ھیں۔ اس طرح دو راتوں کے غور و خوض کے بعد ھم نے فرار ھونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔"

"اس طرح..."

"اس طرح چھ مہینوں میں ھم نے ایک نہیں بلکه دو سرنگیں کھودیں!"

"دو کیوں؟ کیا اس سے قبل بھی کوئی ٹولی فرار ھو چکی ھے؟ تمھاری مدد سے؟ بتاؤ نا!"

"مجھے آپ کو مایوس کرنا پڑےگا۔ میں نے فرار ھونے میں کسی اور کی مدد نہیں کی۔ بدقسمتی سے وہ پہلی سرنگ ادھوری ھی رہ گئی۔ آپ جانتے ھی ھوں‌گے کہ ھمیں قلعے سے دوسرے قیدخانے میں منتقل کر دیا گیا تھا" یہ کہہ‌کے ولی‌بابا کے چہرے پر اپنے انکشاف کا ردعمل دیکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ ولی‌بابا کو قلعے میں پہلے قیدخانہ ھونے کا علم ھے کہ نہیں، ولی‌بابا کا اس قیدخانے سے کوئی تعلق تھا کہ نہیں۔

ولی‌بابا کا چہرہ فق ھو گیا اور قیدی نے سوچا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ اتنے میں قالی‌خان جو ولی‌بابا کے پاس کھڑا ھوا تھا، چیخ اٹھا:

"یہ جھوٹ ھے! قلعے میں کسی سرنگ کا نام و نشان تک نہیں۔ تمہیں معلوم ھے کہ یہاں کتنی سختی کے ساتھ پہرا دیا جاتا تھا؟"

"خیر، مجھے اجازت دیجئے کہ وہ نامکمل سرنگ آپ لوگوں کو دکھا دوں" موسائیف نے مسکراتے ھوئے کہا۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ اس وقت کن لوگوں کی نگرانی میں ھے۔ ان لوگوں کے کھردرے، لو سے جھلسے ھوئے ھاتھ، عجلت کے بغیر سیدھے قدموں سے چلنے کا انداز اور قیدخانے کے روزمرہ کاموں سے واقفیت – ساری باتیں شاھد تھیں کہ وہ قیدخانے کے سابق پہریدار تھے۔ اسی لئے ریگستان میں وہ فرار ھونےوالوں کے راستے پر بہ‌آسانی چل‌کے انہیں پکڑنے میں کامیاب ھو گئے تھے۔

"اچھی بات ھے!" ولی‌بابا اور اس کے ساتھی کھڑے ھو گئے۔ "چلو، دکھاؤ!"

قیدی بھی ستائش کا مستحق ہے۔ دو سرنگیں کھود لینا کوئی آسان کام تھوڑی ہے! ولی بابا کو اس خیال سے فخر کا احساس ہوا کہ وہ موسائیف سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا۔ اسے موسائیف جیسے مجرم کو پکڑنے کے صلے میں کوئی نیا عہدہ یا تمغہ تو بہرحال مل ہی سکتا ہے۔

"تمہارے شریک جرم کون لوگ تھے؟" اس نے مجرم سے پوچھا۔

"وہ لوگ اب قلعے میں بند ہیں۔"

"لیکن بیرک میں دوسرے قیدی بھی تو تھے؟"

"جی ہاں تھے، لیکن جن قیدیوں نے ہمیں جرم کرتے دیکھا تھا وہ سب اب رہا ہو چکے ہیں۔"

"لیکن انہوں نے تمہاری مدد کی تھی نا؟"

"نہیں، میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو۔"

"کیا وہ تمہارے جرم کو دیکھ کے خاموش رہتے تھے؟"

"نہیں، خاموش کیوں رہتے؟ وہ ہمیں سرنگ کھودنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس سے کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوگا۔"

"بڑے عقل‌مند تھے وہ لوگ! ٹھیک ہی تو کہتے تھے!"

"بالکل!"

"کیا تم کو اب بھی یقین ہے کہ سرنگ کھودنے کی ضرورت تھی؟"

"جی ہاں، یقیناً ضرورت تھی..."

"مگر کیوں؟"

"آئیے، بیرک سے باہر چلیں۔ میں تو سرنگ میں داخل ہو کے بھاگ سکتا ہوں۔ پھر آپ لوگوں کو مجھے پکڑنے میں سخت پریشانی ہوگی۔"

"لے چلو اسے!" ولی بابا نے غصے سے کہا۔

## ۱۳

قیدیوں کے لئے صرف ابتدائی دو دن ہی دلچسپ ثابت ہوئے۔ ان دنوں کے واقعات نے ان کے اندر زندگی سے دلچسپی پیدا کی۔ انہوں نے ان عجیب و غریب لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ان کو

"یہ رھی وہ!" موسائیف نے سرنگ کو جو اس کی محنت کا ثمر تھی، دکھاتے ھوئے کہا۔ "کون اترنا چاھتا ھے اس میں؟"

کسی نے جواب نہ دیا۔ ولی‌بابا اور اس کے ساتھی اپنی شکست محسوس کرکے بےحد متاثر ھوئے تھے اور چپ‌چاپ کھڑے تھے۔

پھر ان میں سے ھر ایک سرنگ کے قریب گیا اور ٹارچ کی روشنی ڈال‌کے اندر جھانکا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ لوگ کوئی خفیہ رسم ادا کر رھے ھوں۔

"مجھے اجازت ھے؟" موسائیف نے دونوں پیر سرنگ میں ڈالے اور قبل اس کے کہ قالی‌خان کو اسے روکنے کا موقع ملتا، وہ اندر اترکے نیم‌تاریکی میں غائب ھو گیا۔

اوپر کھڑے ھوئے لوگوں نے اپنی بندوقوں سے نشانہ لگایا لیکن موسائیف بندوقوں کو نظرانداز کرتے ھوئے انھیں سمجھانے لگا:

"دیکھئے، یہاں سرنگ دو میٹر کی گھرائی تک آکے دائیں جانب مڑتی اور دیوار کے نیچے سے گزرتی ھے۔ اس میں آپ جیسا موٹا تگڑا آدمی بھی سما سکتا ھے" اس نے ولی‌بابا کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن سرنگ کے ذریعے فرار صرف اسی صورت میں کامیاب ھو سکتا ھے جبکہ فرار کرنےوالے کے پھیپھڑے کافی طاقتور ھوں کیونکہ دس میٹر تک جانے کے بعد بھاپ سے دم گھٹنے لگتا ھے اور وہ بےھوش ھو سکتا ھے۔

"اچھا، اب باھر نکل آؤ!" ولی‌بابا نے حکم دیا۔ اسے محسوس ھو رھا تھا کہ موسائیف نے صورت‌حال پر حاوی ھو گیا ھے اور وہ اور اس کے ساتھی اس کی باتیں سنتے ھوئے منہ کھولے کھڑے ھیں جیسے وہ اس معاملے میں بالکل بےبس ھوں۔

موسائیف باھر نکلا تو قالی‌خان بڑبڑانے لگا:

"تمھارا یہ خیال غلط ھوگا کہ ھم تم کو فرار ھونے دیتے۔ ھم لوگ اس وقت بھی تم کو پکڑ لیتے۔"

"ھو سکتا ھے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ آپ لوگوں نے ھمیں پکڑکے بڑی مہارت دکھائی ھے۔"

ولی‌بابا کھڑے کھڑے قیدی کی اس بات پر سوچتا رھا۔ ھاں، ان لوگوں نے مجرموں کو پکڑنے میں واقعی مہارت دکھائی تھی۔ اسے اچھا لگا کہ موسائیف نے ان کی تعریف کی۔ اس نے سوچا کہ یہ

صرف ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ جب تک وہ قلعے میں مقیم تھے انہیں پل کی تعمیر میں کام کرنے کے لئے بھیجا جا سکتا تھا۔

گاؤں کے قریب دریا کے کنارے بہت سے خیمے نمودار ہو چکے تھے۔ ولی‌بابا اور اس کی ٹیم مفرور قیدیوں کے تعاقب میں مصروف تھی تو کوئی ایک سو معمار آ گئے تھے اور پل کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے ٹرک کنارے تک پہنچ کے دریا میں پتھر گراتے تو دور تک چھینٹے اڑتے اور پل کے ڈھانچے میں کیلیں ٹھونکتے ہوئے ہتھوڑوں کا شور ایک لمحے کے لئے بھی نہ تھمتا... لیکن نہیں، قیدیوں کو وہاں بھیجنا زبردست خطرہ مول لینے کے مرادف ہوگا۔ ناممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی توجہ ان کی طرف نہ مبذول ہو۔ مجرم آخر اسی لئے تو قیدخانوں میں بند کئے جاتے ہیں تا کہ دوسروں پر خراب اثر نہ ڈال سکیں۔

"انہیں بالٹیاں دی جائیں تاکہ قلعے کی صفائی کریں" ولی‌بابا نے حکم دیا۔

اس نے دیکھا کہ قیدی بڑی محنت اور مستعدی سے قلعے کے اندرونی برآمدوں اور احاطوں میں جھاڑو دے‌کے انہیں صاف کرنے لگے۔ اس نے سوچا کہ ان میں اور خود اس کی ٹیم کے لوگوں میں، آزاد اور قید لوگوں کا فرق ہے پھر بھی یہ لوگ اسی طرح کام کرنے کے بےحد خواہاں ہیں جس طرح ولی‌بابا اور اس کی ٹیم‌والے قیدخانے کے سنتریوں کا کام انجام دینے کو بےتاب ہیں۔

قلعے کی صفائی چوبیس گھنٹوں میں پوری ہو گئی۔ اب وہ صاف ہوکے کچھ یوں چمکنے لگا تھا جیسے وہاں مقیم لوگ کسی کمیشن کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔

اس کے بعد ولی‌بابا کو پھر فکر لاحق ہوئی کہ قیدیوں کے لئے دوسرے مفید کام کی صورت کیسے نکالی جائے۔

وہ اب تک اس سرنگ کو فراموش نہیں کر سکا تھا جو موسائیف نے دکھائی تھی۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ سرنگ قلعے کی نازک جگہ تھی بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ قیدیوں کی قوت اور عقل‌مندی اور قیدخانے کے پہریداروں کی کمزوری کی گواہ تھی۔

ہاں، ایک اور کام بھی تھا لیکن اس کے آغاز سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ مفید بھی ثابت ہوگا کہ نہیں۔

پکڑا تھا اور اپنی ان غلطیوں کے بارے میں جن کی بنا پر وہ پکڑ لئے گئے تھے، غور و خوض کیا۔ انہیں بعض دوسری چیزوں کا بھی خیال آتا رہا۔

لیکن جب انہیں معلوم ہو گیا کہ ولی‌بابا اور اس کے ساتھی کون ھیں تو ان کی دلچسپی ختم ہو گئی اور سستی اور قلعے کی روزمرہ زندگی کی وجہ سے ان کے مزاج میں بےکیفی پیدا ہو گئی۔

وہ ولی‌بابا کے ساتھیوں سے مختصر بات‌چیت کرتے اور صحن میں گھومنے پھرنے کے بعد اپنے کمروں میں واپس آ جاتے اور باقی تمام وقت پتھر کے فرش پر لیٹے لیٹے گزار دیتے۔ ان کی سستی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ھاتھوں کو جنبش دینے کا بھی جی نہ چاھتا۔ ان کے چہرے جو فرار کے دوران دھوپ میں سنولا گئے تھے، اب پھر بھورے سے نظر آنے لگے تھے۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی اور وہ لاپروائی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے رہتے تھے۔

قلعے کے حالات قیدخانے سے بہتر ہونے کے باوجود انہیں قلعہ پسند نہ آیا۔ دراصل ان کی اداسی کا سبب یہ تھا کہ یہاں وہ کام سے محروم تھے جو قیدخانے کی معمولی زندگی میں کچھ نیا رنگ پیدا کر دیتا تھا۔

وہ اپنے کڑے تجربے کی بنا پر جانتے تھے کہ ریگستان کی چلچلاتی دھوپ میں سخت محنت کرنا قلعے میں کاھلی کے ساتھ پڑے رہنے سے بہتر تھا۔

ولی‌بابا نفسیات سے اپنی عدم‌واقفیت کی بنا پر اس غلطفہمی میں مبتلا تھا کہ اس نے قیدیوں کو کام سے آزاد کرکے انہیں مسرت سے ھمکنار کر دیا ھے۔

اور جب تینوں نے ھم‌آواز ہوکے مطالبہ کیا کہ انہیں کام کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ دنگ رہ گیا۔ انہوں نے کام کا مطالبہ ھی نہیں کیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی کہ کام نہ ملا تو بھوک ھڑتال کر دیں گے۔

ولی‌بابا نے اس سلسلے میں قالی‌خان سے مشورہ کیا۔ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رھا تھا کہ مجرموں کو آخر کون سا کام دیا جا سکتا ھے۔

"تم یہ جاننا کیوں چاہتے ہو؟"

"ارے، یہ نہ سوچئےگا کہ میں ایک اور سرنگ کھودکے قلعے سے فرار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بات صرف یہ ہے کہ غیریقینی صورت‌حال میرے لئے عذاب جان بن گئی ہے..."

"اس معاملے میں تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔ قیدخانے سے کوئی آکے تمہیں لے جائےگا" ولی‌بابا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

بات‌چیت کے خاتمے پر موسائیف کو قلعے کے ایک ہال میں پہنچایا گیا جہاں پہلے قیدخانے کا دفتر قائم تھا۔ اس بڑے بیضوی ہال میں دو طاق تھے جن میں پہریدار اپنی وردیاں رکھتے تھے۔

موسائیف نے دیوار کو ٹھونکا پیٹا، اس پر اپنا کان لگایا اور اس سے تھوڑی سی سیمنٹ اکھاڑنے کی اجازت مانگی۔

ولی‌بابا نے جیب سے چاقو نکال‌کے کچھ کہے بغیر موسائیف کو تھما دیا۔

"ارے، یہ تو شیطان کا مرکب ہے!" اس نے دیوار سے سیمنٹ کا ذرا سا ٹکڑا نکالتے ہوئے کہا۔ "دیوار پر اتنی زیادہ سیمنٹ لگانے کی کیسے سوجھی تھی؟" یہ کہتے وقت وہ اپنی آواز کی صدائے بازگشت پر کان لگائے ہوئے تھا جس میں کچھ عجیب سی گونج تھی۔

"جلدی سے کچھ کہئے" اس نے ولی‌بابا سے کہا۔

"کیا مطلب؟" ولی‌بابا نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"شکریہ، بس اتنا ہی کافی ہے... آپ نے سنا نہیں کہ صدائے بازگشت کھنکتی ہوئی تھی۔ آپ سمجھ نہیں سکے کیا کہ دیوار پر سیمنٹ اتنی مضبوطی سے کیوں لپٹی ہوئی ہے؟.. اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم تصویروں کی موجودگی کے متعلق آپ کا خیال درست ہے... اور کیا؟.."

"اچھا تو تصویریں موجود ہیں نا؟"

میں تو واضح طور پر کہہ چکا ہوں... لیکن دیواری تصاویر سے سیمنٹ کو صاف کرنے کے لئے دماغی محنت کی، سنار کی سی محنت کی ضرورت ہوگی۔ سچ مچ سنار کی سی محنت کی!"

"تو تم یہ کام کر سکوگے نا" ولی‌بابا نے اس انکشاف سے متاثر ہوکے حکم کے بجائے درخواست کے لہجے میں پوچھا۔

ولی بابا نے سنا تھا کہ جب قلعے کو قیدخانے میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو معماروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اس کی دلکش تصاویر سے آراستہ دیواروں پر سیمنٹ لگا دیں تاکہ وہ عام قیدخانوں کی سادی دیواریں معلوم ہوں۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ اب کسی کے حکم کے بغیر دیواروں کو اس طرح صاف کیا جائے کہ تصاویر نظر آنے لگیں؟ وہ زمانہ تو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے جب قلعے میں قیدخانہ تھا۔ اور آخر اس کام کے لئے کسی کے حکم کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ولی بابا نے سوچا کہ دیواروں کی صفائی آسان نہ ثابت ہوگی لیکن یہ ضرور ہے کہ اس دشوار کام کے آغاز سے پتہ چل جائےگا کہ تصویروں کی موجودگی کی باتیں محض گپ تو نہ تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ تصویریں کبھی رہی ہی نہ ہوں یا انہیں کھودکے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہو۔ اس صورت میں کیا ہوگا؟ بہرحال موسائیف سے اس کے متعلق باتیں کرنا ضروری ہے۔ دیواروں، مٹی اور سیمنٹ کا کام اس کے پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔

پھر ولی بابا کے دل میں خیال آیا کہ موسائیف کے مشورے سے مستفید ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ قیدی کو خوش اور مغرور ہونے کا موقع دیا جائے لیکن اس نے سوچا کہ اس کے سوا کوئی اور صورت بھی تو نہیں ہے۔ دوسرے دونوں قیدی تو بالکل بدعقل ہیں لیکن یہ موسائیف — یہ تو اتنا قابل ہے کہ اس کے آگے سر جھکایا جا سکتا ہے۔ ولی بابا سمجھتا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی اتنے طاقتور ہیں کہ اس مجرم کو قاعدے قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض باتوں میں وہ ان لوگوں سے زیادہ قابل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے کچھ نہ کچھ آزادی بہرحال دینی ہوگی۔

"تمہارے لئے ایک کام ہے" اس نے موسائیف کو بلاکے کہا۔ "تمہیں یہ تعین کرنا ہے کہ قلعے کے تین ہالوں کی دیواروں پر سیمنٹ کے نیچے تصاویر موجود ہیں کہ نہیں۔ دیوار کی اوپری سیمنٹ کو توڑے بغیر صرف دیکھ‌کے پتہ چلانے کی کوشش کرو... آخر تم انجینیر ہو، کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہو..."

"مجھے یہ تو بتائیے کہ ہمیں قلعے کے اندر رہنا کب تک ہوگا؟"

اینٹ کو غور سے دیکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بیٹھکر تصاویر کے سائز اور ان کے خطوط اور بناوٹ کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"آپ قریب آ سکتے ھیں" اس نے ولی بابا سے کہا۔ "آپ تو قلعے کے قریب واقع گاؤں کے رھنےوالے ھیں۔ یقیناً آپ قلعے کے متعلق تفصیلات جاننا چاھتے ھوں‌گے؟ آپ خوش‌قسمت ھیں که اس قلعے کے قریب رھتے ھیں جو قوم کے لئے باعث فخر ھے۔ یقین کیجئے که یه تصاویر جن پر اتنی سیمنٹ تھوپی گئی ھے، سولھویں صدی کی بنی ھوئی ھیں۔ دراصل یه ھندسی شکل کے نقش و نگار ھیں۔ تاریخ سے واقفیت رکھنےوالے کسی شخص کو جسے قدیم قلعے اور مساجد کو دیکھنے کا شوق ھو اور جس نے انہیں دیکھا ھو، ھمارے دیواری نشانات کے سہارے صحیح شکل میں دکھائی نه دینےوالے ان نقوش کی بحالی میں دقت نه پیش آئےگی... میں نے جو نقشه بنایا ھے وه نقوش کو ھلکا سا بھی نقصان پہنچائے بغیر دیوار کو صاف کرنے میں اس کی مدد کرےگا... معاف کیجئے اگر کوئی نقصان ھوا تو محض اس لئے ھوگا که ان پر اتنی زیاده سیمنٹ تھوپی گئی ھے۔ اس سے ھمارا کوئی تعلق نه ھوگا... ٹھیک ھے نا؟ بہرحال کام شروع ھوگا تو صحیح صورت‌حال سامنے آ جائےگی۔ تو شروع کریں نا کام؟"

ولی بابا کو ایسا لگا جیسے موسائیف کے بارے میں وه دو طرح کی رائیں رکھتا ھے۔ ایک طرف تو وه اس آدمی کو روز به روز زیاده پسند کرتا جا رھا تھا اور اس کے اندر یه جذبه اس کے اس احساس کے باوجود تقویت پا رھا تھا که مجرم کو سراھنے کا کوئی سوال ھی نہیں اٹھتا۔ اور دوسری طرف اس کے دل میں اس شخص کو نیچا دکھانے اور اسے ذلیل کرنے کی خواھش کروٹیں لے رھی تھی۔ اسے محسوس ھو رھا تھا که وه موسائیف کی اندرونی آزادی سے کچلا جا رھا ھے اور اس کی اس کیفیت سے اس کے کم‌ھمت ھو جانے اور اپنی چوکسی کھو دینے کا خطره پیدا ھو گیا تھا۔

موسائیف کے تیار کئے ھوئے خاکے کی مدد سے قیدیوں نے دیوار کے ایک حصے کو پوری طرح صاف کر لیا تو ولی بابا نے محسوس کیا که یه صورت‌حال اس کے لئے ناقابل برداشت ھے۔ اس نے موسائیف سے صاف صاف بات‌چیت کرنے کے لئے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا۔

"ہونہہ، کیا سوال ہے! مجھے کسی کام سے انکار کا حق ہی کب حاصل ہے۔ ہاں، دماغی کام کے لئے اچھی غذا ضرور چاہئے۔ آپ زیادہ خرچ برداشت کرنے سے رہے۔ آپ کے پاس تو ہمارے لئے صرف شوربا پکانے ہی کے مصارف ہیں..."

"یہ بکواس بند کرو!" ولی‌بابا کو تناؤ کی یہ حالت بری لگی اور اس نے بات‌چیت ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "رونے دھونے اور تقدیر پر لعنت بھیجنے کا یہ سلسلہ ختم بھی کرو۔ تم اپنے جرم کی سزا بھگت رہے ہو!"

ولی‌بابا موسائیف کو ڈانٹ ڈانٹ کے وہاں سے چلا گیا۔

موسائیف نے اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھ‌کے سوچا:

"نیک آدمی ہے۔ مجھ پر یوں ناراض ہوا جیسے میرا باپ ہو۔ ہنساتا بھی ہے اور خوف‌زدہ بھی کرتا ہے..."

## ۱۴

دیواری تصاویر پر سے سیمنٹ صاف کرنے کا کام واقعی بہت ہی نازک اور پیچیدہ تھا۔

سیمنٹ کا پلاسٹر بہت مضبوط تھا اس لئے اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے تھے بلکہ دھیرے دھیرے کھرچنا پڑتا تھا۔ سب سے زیادہ دشواری یہ تھی کہ قیدیوں کو نہ یہ معلوم تھا کہ دیوار پر تصویریں کس جگہ بنی ہوئی ہیں اور نہ ہی یہ کہ وہ بڑی ہیں یا چھوٹی۔ ان کے پاس ان تصاویر کے خاکے یا نقلیں وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ ان سب دیواروں کے مدنظر تصاویر کی تلاش کے لئے سنار اور مصور دونوں کی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔

ولی‌بابا کو سخت حیرت ہوئی کہ موسائیف نے تصاویر کا پتہ لگانے کا طریقہ جلد ہی معلوم کر لیا۔ اس نے ہر دیوار پر برف کے ننھے ننھے گڈھوں جیسے دس پندرہ سوراخ کھودے جانے کی ہدایت کی جن سے تصاویر کے حاشیے نظر آنے لگے۔

موسائیف کے معاون چاقوؤں سے تصاویر کے اوپر کی سیمنٹ کھرچنے لگے۔ اس دوران خود اس نے ہال میں گھوم پھر‌کے ہر رنگین

موسائیف چلا گیا تو ولی بابا نے قالی‌خان کو بلاکے کہا کہ موسائیف کے کھانے کا راشن آدھا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو بے‌حد عقل‌مند تصور کرنا ترک کر دے۔

## ۱۵

ولی بابا اب اپنے رفیقوں کے ساتھ بہت ھی کم وقت گزارتا تھا۔ وہ اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا انتظار کرتا رھتا تھا کہ موسائیف ایسی زبردست دماغی محنت کے عوض اتنا کم کھانا حاصل کرنا برداشت نہ کر سکےگا، اپنی سرکشی چھوڑ دےگا اور اس کے پاس آکے منت سماجت کرےگا۔ ولی بابا سوچتا رھتا تھا کہ وہ موسائیف کو معاف کر دےگا اور اس طرح وہ ایک بار پھر اس کے قابو میں آ جائےگا۔

اس دوران تینوں قیدی بڑی لگن کے ساتھ بڑے ھال میں کام کر رھے تھے اور ان کی محنت سے صاف ھو جانےوالی دیوار پر قدیم مصوروں کی دلفریب تصاویر دکھائی دینے لگی تھیں۔

موسائیف نے ولی بابا کی غیرمنصفانہ کارروائی کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہا تھا اور وہ اب بھی مثالی نظم‌وضبط اور فرمانبرداری کا مظاھرہ کئے جا رھا تھا۔

اسے یہ بات نہ بری لگی، نہ اس پر غصہ آیا کہ ولی بابا جسے اس نے نیک اور ھنس‌مکھ بابا سمجھا تھا، اب اس سے چھوٹی سی چیز کا انتقام لے رھا ھے۔

پیٹ بھر کھانا نہ ملنے کا اثر اس پر ضرور پڑ رھا تھا اور دس گھنٹے کام کرنے کے بعد اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔ پھر بھی وہ سمجھتا تھا کہ جن دشوار حالات کا اسے اب سامنا کرنا پڑ رھا ھے ان میں اپنی اندرونی آزادی برقرار رکھنے کے لئے سب کچھ برداشت کرنا ھوگا۔

ولی بابا تقریباً ھر گھنٹے کے بعد قالی‌خان کو بلاکے پوچھتا کہ قیدی کیا کر رھے ھیں، خاص طور سے وہ پستہ‌قد آدمی؟

"کام کر رھے ھیں" قالی‌خان جواب دیتا۔

"دیکھو، خیال رکھنا کہ وہ تیزی سے کام کریں۔ ایک منٹ بھی آرام نہ کرنے دو۔ اور ھاں، اس عقل کے پورے پر خاص طور سے

"تمہیں کس جرم میں سزا ملی تھی؟" اس نے دریافت کیا۔ دراصل اب تک اس سے ولی‌بابا کو یہ سوال پوچھنے کا خیال ھی نہیں آیا تھا۔

قیدی کے ھونٹوں پر طنزیہ مسکراھٹ بکھر گئی اور اس نے کہا:
"آپ کے اس سوال کا سبب تجسس ھے یا؟.."

ولی‌بابا کو غصہ آ گیا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ھو گیا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارا اور چیخ اٹھا:
"یہ میرا کام ھے! فضول کی بحث مت کرو!"

اس نے دیکھا کہ موسائیف ذرا بھی نہ شرمایا، اس کے برعکس اس نے کچھ اس لہجے میں بولنا شروع کیا جیسے اسے اپنی باتوں پر افسوس ھو:

"دیکھئے سربراہ کا لہجہ تو اختیار کیجئے نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ھوں کہ آپ کون ھیں اور ھمیں پانچ دنوں سے قلعے میں کیوں بند رکھے ھوئے ھیں۔ آپ اپنا کردار بخوبی انجام دے رھے ھیں — اور کیا چاھئے؟ لیکن اگر آپ کام کی طرف سے میری توجہ نہ ھٹائیں تو آپ کو زیادہ فائدہ ھوگا..."

ولی‌بابا خاموش رھا۔ موسائیف نے اس کی تمام دلیلوں اور صورت‌حال پر قابو پانے کی تمام قوت کو ایک ھی وار میں ختم کر دیا تھا۔ اسے محسوس ھوا کہ اس آدمی پر اس کا غلبہ بھی ختم ھو چکا ھے۔

موسائیف جلدی جلدی بول رھا تھا جیسے اسے ڈر ھو کہ مزید باتوں سے روک دیا جائےگا:

"آپ کی کمزوری یہ ھے کہ آپ نہ اچھے تفتیش‌کنندہ ھیں اور نہ ھی اچھے جج۔ آپ کو جو کچھ سکھایا گیا وہ لوگوں کے درمیان روابط کے لئے موزوں نہیں۔"

ولی‌بابا اس بات کی تردید نہ کر سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ھوا اور قیدی کو کمرے سے لے جانے کا حکم دینے سے قبل کہا:
"یہ مت بھولو کہ تم ایک مجرم ھو۔ تمہیں بحث کرنے کا کوئی حق نہیں!"

"تو اب ایسا کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ اس کے قریب بیٹھ کے سرگوشی کرتے ہوئے کہو کہ ولی‌بابا ظالم اور غیرمنصف مزاج ہے۔ مجھے خوب برا بھلا کہو۔ اس سے یہ بھی کہو کہ تم اسے کم کھانا دئے جانے کے خلاف ہو۔ تم اس سے ہمدردی رکھتے ہو۔ اور اس پر وہ جو کچھ بھی جواباً کہے اسے یاد رکھو۔ ہر ممکن کوشش کرو کہ اسے سزا دی جا سکے..."

"کیوں؟ آخر اس چال کی ضرورت ہی کیا ہے؟" قالی‌خان نے ولی‌بابا کی باتوں پر شک ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان بھاگے ہوئے قیدیوں کو سزا دینے کا پورا حق ہے۔ قیدخانے کے ذمےداران ہماری مذمت نہ کریں گے۔ وہ تو ہماری تعریف ہی کریں گے کہ ہم نے قانون کی پابندی کی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، قالی‌خان" ولی‌بابا نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری مذمت کوئی نہ کرےگا لیکن تم بھول رہے ہو کہ ہم قیدخانے کے کوئی عہدیدار نہیں ہیں۔ اب تو ہم معمولی شہری اور پل کے معمار ہیں۔ ایسے لوگوں کو شائستہ اور تہذیب‌یافتہ ہونا چاہئے ورنہ زندگی ایک مصیبت بن جائےگی۔"

"کیا مجرموں کو بھی انسان تصور کیا جاتا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ موسائیف کا دماغ اتنا اچھا ہے جتنا ہر انسان کا نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے لیکن ہم لوگ تو انسان ہیں اور ہمیں اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہئے!"

یہ سن‌کر قالی‌خان کو سخت حیرت ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ ولی‌بابا مجرموں کے متعلق ایسا کبھی نہیں کہتا تھا۔ وہ ولی‌بابا کے پاس سے قیدیوں کی نگرانی کے لئے ہال میں آ گیا۔

"گیت گانے کی اجازت ہے" اس نے واپسی پر رکھائی سے کہا۔

لیکن اب موسائیف کو گانے سے دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ دونوں دوسرے قیدیوں کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور وہ جی لگاکر کام رہے تھے۔

قالی‌خان کے جانے کے بعد ولی‌بابا سوچنے لگا کہ اس نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ مجرموں سے انہیں تہذیب‌یافتہ لوگوں کی طرح پیش آنا چاہئے۔

نظر رکھنا۔۔ ذرا بھی سستی دکھائے تو خوب خبر لینا اور راشن سے بالکل محروم کر دینا۔"

قالی‌خان اداس ہوکے ہال میں واپس آتا اور موسائیف کو ٹکٹکی باندھکے دیکھنے لگتا۔ اسے اس کی ایک ایک بات کا پتہ رہتا تھا: کون سی چیز لی، کہاں رکھی اور کیا کہا۔

اس نگرانی سے بھی موسائیف گھبرا نہیں رہا تھا۔ وہ سب کچھ سوچ سمجھکر، توجہ کے ساتھ کر رہا تھا اور باتیں بہت ھی کم کرتا تھا۔ کیا مجال جو ایک بھی غیرضروری بات اس کے منھ سے نکل جاتی! صرف ایک بار جب سیمنٹ کا پلاسٹر ہٹنے کے بعد بہت ھی دلکش منظر کی تصویر دکھائی دی تو وہ بےقابو ہوکر گنگنانے لگا۔

"ارے ارے، گانے کی اجازت نہیں!" قالی‌خان نے فوراً ھی ٹوکا۔

"کیوں؟ قیدخانے میں عشقیہ گیت گانے کی ہمیشہ اجازت رھی ھے" موسائیف نے اعتراض کیا۔

"منع ھے!" قالی‌خان نے قطعی طور سے کہا۔

موسائیف اچانک خاموش ھو گیا۔ وہ بیکار باتیں نہیں کرنا چاھتا تھا لیکن دونوں دوسرے قیدی اس سے ناراض ھوکے شور مچانے لگے۔

"ارے چچا، یہ سب کچھ چھوڑ دو۔ قانون ھر جگہ ایک ھی ھے۔ سنا تم نے؟" وہ آگ بگولہ ھوکے قالی‌خان پر برس پڑے۔

وہ اٹھکے ولی‌بابا سے مشورہ کرنے گیا۔

"کیا ھوا؟ سزا دی انھیں؟" ولی‌بابا نے پوچھا۔

"وہ گیت گا رھا تھا۔ ان لوگوں کا کہنا ھے کہ گیت گانے کی اجازت ھے۔"

"کیسا تھا گیت؟ کاھے کے بارے میں تھا؟"

"گاؤں اور ماں کے بارے میں۔ اس نے کہا کہ یہ عشقیہ گیت ھے۔"

"اچھا، گیت گایا جا سکتا ھے" ولی‌بابا نے اجازت دے دی۔

"اس سے کام میں مدد ملتی ھے۔ اور بھی کچھ دیکھا؟ کوئی ضرررساں بات؟"

"نہیں۔ قانون کے خلاف کوئی بات نہیں۔"

"بس، اب اور اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ کھانے کا راشن بھی پورا کر دو۔ ویسے کوئی مروت نہ برتنا۔۔" ولی‌بابا نے نیا حکم جاری کیا۔

## ۱۶

دو دن بعد تینوں ہالوں کی دیواریں صاف ہو گئیں اور دیواری تصاویر کو دیکھنے کے لئے ولی‌بابا کو بلایا گیا۔

ایک ہال میں پہنچ‌کے وہ بہت متاثر ہوا۔ اس کی رنگینی اور قلعے کے باقی کمروں کی تاریکی میں کتنا بڑا فرق تھا!

اسے ایسا لگا کہ وہ ریگستان میں طویل سفر کے بعد کسی پرسکون اور سایہ‌دار باغ میں پہنچ گیا ہے۔ اتنے بڑے فرق کو دیکھ‌کے ولی‌بابا کو کچھ جھرجھری سی آ گئی۔

موسائیف نے اسے ان تصاویر کے متعلق کسی لفاظی کے بغیر سیدھے سادے انداز میں مختصراً بتایا۔

دراصل موسائیف کی اس وضاحت کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ تمام تصاویر میں ایک جیسے مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ ولی‌بابا اور اس کے ساتھی تصاویر کے غیرمعمولی رنگ سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ انہیں سبز پانی کے پس منظر میں گہرے سرخ رنگ کے درخت دکھائی دئے۔ مختلف رنگوں کا بڑا خوبصورت امتزاج ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

ولی‌بابا کو سخت حیرت ہوئی لیکن وہ موسائیف سے کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ اتنا تو بہرحال سمجھ رہا تھا کہ زمانہ قدیم کے مصوروں نے تصاویر کو ایسے رنگ محض اتفاقاً نہیں عطا کئے تھے۔ قالی‌خان البتہ اپنے آپ کو نہ روک سکا اور اس نے درختوں کے رنگ پر اعتراض کیا۔

"بات دراصل یہ تھی، میرے دوست" موسائیف اسے سمجھانے لگا، "ماضی کے مصور اسی لئے مشہور تھے کہ وہ چیزوں کو ان کے اصلی رنگ میں نہیں پیش کرنا چاہتے تھے۔۔۔ ان کا خیال تھا کہ چیزوں کو ان کے اصلی رنگ روپ سے مختلف انداز میں پیش کیا

مسئلے کے دو پہلو ھیں۔ مجرمین جن کو ان لوگوں نے پکڑا تھا، قیدخانے کے سنتریوں کی آمد کا انتظار کر رھے ھیں۔ انھیں قیدخانے کے تمام سخت ضوابطوں گی پابندی کرنی چاھئے۔ جہاں تک ولی بابا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق ھے، انھیں مجرموں کی زندگی سے متعلق ایسے انتظامات کرنے چاھئیں کہ وہ حد سے زیادہ آزادی نہ مخسوس کریں۔

سچ ھی تو ھے کہ ولی بابا نہ جج ھے اور نہ ھی مجرمین کو فرار ھونے کی سزا دے سکتا ھے۔ لیکن وہ لوگ ان فرار کرنےوالوں کے اس وقت سنتری ھیں اور ان کی باتوں کی پابندی کرنا مجرمین کے لئے قانون کی پابندی کے برابر ھے۔

ولی‌بابا نے یہ بھی سوچا کہ اس صورت میں جبکہ وہ نہ جج ھے، نہ تفتیش افسر، اگر وہ مجرمین کو اپنے سوالات کا جواب دینے پر مجبور کرتا ھے تو اس کا مطلب یہ ھوگا کہ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر رھا ھے۔ اسے موسائیف کے کھانے کا راشن بلاسبب کم کر دینے کا کوئی اختیار نہیں ھے۔

مجرم سے صرف تفتیش افسر ھی ایسے سوالات کر سکتا ھے جن کے جواب دیتے ھوئے مجرم اپنے دل کی باتیں بتا سکتا ھے۔ ولی‌بابا جیسے معمولی لوگ نہ اس پر دباؤ ڈال سکتے ھیں اور نہ ھی کوئی سخت کارروائی کر سکتے ھیں۔ مجرموں کے ساتھ تو ان لوگوں کے تعلقات رضاکاری اور باھمی رواداری پر مبنی ھونے چاھئیں... ولی بابا نے سوچا کہ اس نے موسائیف کے کھانے کے راشن میں جو ویسے بھی کم ھی تھا، مزید کمی کرکے اپنے اختیارات کا نہیں بلکہ اپنی طاقت کا استعمال کیا ھے۔ اس کارروائی کا مطلب یہ ھے کہ اس نے بےانصافی کی۔ اب اس کے ضمیر پر ایک سیاہ داغ لگ گیا ھے اور وہ وقت ضرور آئےگا جب اسے اس کا جواب دینا پڑےگا۔

قالی‌خان کے اندر داخل ھونے سے ولی‌بابا کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسے قالی‌خان کی آواز سنائی دی:

"وہ بدمعاش تو میری باتوں کو جیسے سنتا ھی نہیں۔ میں آپ کو برا بھلا کہتا رھتا ھوں لیکن وہ بالکل خاموش رھتا ھے۔ اپنا کام جاری رکھتا اور مسکراتا رھتا ھے۔ بےحد چالاک ھے!.."

"ارے، ریگستان میں گھوڑے پر ایک سو بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا کوئی مذاق تھوڑی ھے" موسائیف نے ولی بابا سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے اس پیغام رساں کو بیس کلومیٹر کا فاصلہ کشتی سے طے کرکے پکی سڑک پر پہنچنا چاھئے تھا۔ وھاں سے بس ملتی جو سیدھے اسٹیشن تک پہنچا دیتی۔ اس جگہ سے گھوڑے پر کوئی پانچ گھنٹوں میں قیدخانے پہنچ سکتا تھا۔"

"تمھارے لئے یہ سب کہنا آسان ھے" ولی بابا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں سب کچھ معلوم ھے۔ جہاں تک ھمارا تعلق ھے تو ھمیں تو قلعے اور دریا نے باھر کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ کر رکھا ھے۔ ھمیں کیا خبر کہ اسٹیشن کہاں واقع ھے اور قیدخانہ کہاں ھے... خیر تو اب کوئی اور کام نہیں۔ جا کے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دو..."

"نہیں، نہیں، مجھے یہ کہنے پر مجبور نہ کیجئے" قیدی نے درخواست کی۔ "یہ میرے بس سے باھر ھے۔ آخر ان سے میں یہ کس طرح کہہ سکوں‌گا جبکہ کام واحد چیز ھے جس سے قیدیوں کو اسیری کی زندگی کو بھول جانے کا موقع ملتا ھے۔"

"لیکن چارۂ کار ھی کیا ھے؟ اس صورت سے بچنے کا راستہ ھی کیا ھے؟ تم کو سمجھنا چاھئے کہ مجھے قیدخانے کے سربراہ اور تفتیش افسر کا کردار محض عارضی طور پر ادا کرنا ھے۔ دراصل میں تو ایک معمولی پہریدار ہوں۔ تم لوگ قیدخانے میں جس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اس کا آخر میں کس طرح انتظام کر سکتا ہوں؟"

موسائیف نے کچھ سوچ‌کے سر جھکا لیا جیسے اسے افسوس ہو رہا ہو کہ ولی بابا ان لوگوں کے لئے پہلی جیسی زندگی فراھم نہیں کر سکتا۔ پھر اس نے غیریقینی انداز میں دھیرے سے کہا:

"کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ ھمیں کام کے بدلے کچھ اور فراھم کر دیا جائے؟ بہتر ہوگا کہ ھم لوگ بند کمروں میں پڑے رھنے کے بجائے قلعے میں زیادہ دیر تک گھومیں پھریں۔"

"اچھی بات ھے۔ یہ ممکن ھے بشرطیکہ کوئی شخص اس آزادی کا غلط استعمال نہ کرے" ولی بابا نے موسائیف کی تجویز کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

جائے تو وہ زیادہ متاثر کرتی ھیں۔ دراصل ریگستان میں دریا کا رنگ سرخ اور درختوں کا ھرا ھوتا ھے۔ کوئی شخص معمولی چیزوں کو غیرمعمولی بنانے کی ھمت کرتا ھے تو یہ چیزیں پیچیدہ روپ میں سامنے آتی ھیں اور ان مصوروں کی تصاویر بھی ایسے ھی روپ میں سامنے آئیں۔"

ولی بابا موسائیف کی باتیں نہیں سن رھا تھا۔ وہ تو سوچ رھا تھا کہ قیدیوں نے اپنا کام خوش‌اسلوبی سے مکمل کر دیا، بہت اچھا کیا لیکن کل کیا ھوگا؟ ان کے لئے دوسرا مفید کام نہ فراھم کیا جا سکا تو وہ بھوک ھڑتال کر دیں‌گے اور وہ حق بجانب ھوں‌گے۔

ولی‌بابا کو خیال آیا کہ موسائیف سے مخلصانہ گفتکو ضروری ھے۔ اسے سب کچھ بتا دینا چاھئے۔

شام کو موسائیف کو ولی‌بابا کے کمرے میں لے جایا گیا۔

وہ ولی‌بابا کی باتیں حیرت کے ساتھ سننے لگا حالانکہ وہ اس بات چیت کا کئی روز سے منتظر تھا۔ دراصل اسے ولی بابا کے انتظامات کی ایک کمزور کڑی کا علم تھا: یہ لوگ قلعے کے اندر قیدیوں کو کوئی کام فراھم کرنے کے قابل نہ تھے۔

اس بات کا اندازہ اسے اسی روز ھو گیا تھا جس روز انہیں قلعے میں لایا گیا تھا۔ اس نےٌ سوچا تھا کہ ان لوگوں کا کام قلعے کی صفائی یا ایسے ھی کسی دوسری مصروفیت تک محدود رھےگا جو ان کے لئے نصف دن سے زائد کی نہ ھوگی۔

دیواری تصاویر کی موجودگی کا البتہ اسے علم نہ تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ انہیں ان تصاویر کی بحالی کا کام انجام دینا ھوگا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا لیکن خوش‌قسمتی سے ان لوگوں نے یہ کام بھی دو ڈھائی دنوں میں پورا کر لیا۔

"قلعے میں اب تم لوگوں کے لئے کوئی اور کام نہیں ھے" ولی بابا نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ آدمی جسے میں نے قیدخانے کو بھیجا تھا، آج صبح واپس آ جائےگا اور ھم تم لوگوں کو یہاں سے رخصت کر سکیں‌گے لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ اس کا گھوڑا ٹھیک نہیں ھے..."

موسائیف نے ولی‌بابا سے کہا:

"یہ تو آپ کو ماننا ھی پڑےگا کہ مجبور کر دینے کا یہ بہترین طریقہ نہ تھا۔ آپ کو یہ معلوم ھی نہ تھا کہ ضرورت پڑ جائے تو میں اونٹ کی طرح بہت کم غذا پر بھی کام چلا سکتا ھوں۔ اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ھوگی۔"

"مجھے تو کھانے کا بہت شوق ھے" ولی‌بابا نے شرماتے ھوئے اعتراف کیا۔ "میں گوشت اور آٹے کے مختلف کھانے بہت پسند کرتا ھوں، مرچ مسالے بھی مجھے بہت پسند ھیں۔"

"لوگ کہتے ھیں کہ زیادہ کھانا انسان کے لئے مضر ھوتا ھے۔ میں اس لئے کم کھاتا ھوں کہ کم کھانا انسان کے جذبات کو تیزی اور اس کی زندگی کو مزید توانائی دیتا ھے۔"

"مجھے اس کا خیال ھی نہیں آیا تھا" ولی‌بابا نے اس احساس سے خوش ھوکے کہا کہ راشن کم کرنے سے متعلق ان کی گفتگو نے ناخوشگوار رخ نہیں اختیار کیا تھا۔

لیکن موسائیف پرسکون ھونا نہیں چاھتا تھا۔ اس نے ایک اور واقعہ یاد دلایا:

"کیسی مضحکہ‌خیز بات تھی کہ آپ کی ھدایت پر ایک سنتری میرے پیچھے لگ گیا تھا اور آپ کی برائی کرکے مجھ سے بھی کچھ کہلوانے کی کوشش کر رھا تھا۔"

ولی‌بابا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے ھاتھ ھلایا۔

"اب اسے یاد نہ دلاؤ۔ بالکل مہمل بات تھی۔ میں نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرکے خود ھی اپنے ضمیر کو داغدار کر لیا..."

"اس کا سبب تو یہ تھا کہ اپنی قوت کا مظاھرہ کرنا چاھتے تھے۔"

"نہیں، یہ قوت کا مظاھرہ نہ تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاھتا تھا کہ تمھارے جیسے انسان سے آخر جرم کیسے سرزد ھوا" ولی‌بابا نے دھیرے دھیرے، پرامید لہجے میں کہا۔

"ارے، صرف یہی معلوم کرنا چاھتے آپ؟ کسی خراب مقصد کے لئے تو نہیں؟"

"نہیں، نہیں، کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ قسم کھاکے کہتا ھوں۔"

"اچھا تو سنئے، میں بتاتا ھوں!" قیدی نے سادگی سے کہا...

برجیوں میں بیٹھے ہوئے ان قیدیوں کو دیکھتے دیکھتے ولی‌بابا یہ بھولنے لگا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ وہ ان کا خیال رکھتے رکھتے بےحد تھک چکا تھا اور اسی لئے اس کی دلی خواہش تھی کہ قیدخانے کے سنتری جلد از جلد آکے ان لوگوں کو یہاں سے لے جائیں۔

لمبےوالے قیدی اب بھی اندر اندر برھم سے رھتے تھے، ولی بابا کی ٹیم کے خلاف جس نے انہیں آزادی سے محروم کر دیا تھا، اب بھی ان کے دلوں میں نفرت برقرار تھی۔

موسائیف البتہ ان لوگوں کو کبھی کا معاف کر چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تقدیر ھی ایسی تھی جو پھر پکڑ لئے گئے۔ ولی‌بابا کی ٹیم نہ پکڑتی تو قیدخانے کے سنتری تو بہرحال گرفتار ھی کر لیتے۔

اس نے سوچا کہ دراصل یہ لوگ فرمانبردار ھیں۔ قاعدے قانون کی پابندی کو قیدخانے کے ماحول سے قربت اور ان کی تربیت نے ان کی زندگی کا جزو بنا دیا ھے۔

ولی‌بابا کو اب بھی موسائیف کے جرم کا پتہ لگانے کی فکر تھی لیکن وہ اس سے پوچھنے کی ھمت نہیں کر پا رھا تھا۔ اسے توقع اور امید تھی کہ ممکن ھے موسائیف خود ھی بتا دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے راز کو سینے میں چھپائے ہوئے قیدخانے کو واپس چلا جائے۔

ھر انسان کا اپنا ایک راز ھوتا ھے اور تمام رازوں کا پتہ کیسے چلایا جا سکتا ھے؟ ولی‌بابا بہت سے لوگوں سے مل چکا ھے۔ وہ جانتا ھے کہ بعض لوگ اپنے بوجھ کو ھلکا کرنے کے لئے اپنے دل کا دروازہ آسانی سے کھول دیتے ھیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ھوتے ھیں جو خود کچھ نہیں بتاتے۔ بتانے پر مجبور ھو جاتے ھیں تب بھی صرف وھی بات بتاتے ھیں جس سے انہیں فائدہ پہنچ سکے۔ ایسے لوگوں کو سمجھنا بہت مشکل ثابت ھوتا ھے...

تو یوں موسائیف کے جرم سے ولی بابا کی دلچسپی کم ھونے لگی۔ لیکن اچانک موسائیف نے اسے خود ھی وہ سب بتا دیا جسے بتانے کا پہلے ارادہ نہیں رکھتا تھا اور جس پر ولی‌بابا کی سختی بھی اسے مجبور نہیں کر سکی تھی۔

جب موسائیف نے اس بات کا ذکر کیا کہ اس کے کھانے کا راشن کس طرح کم کیا گیا تھا تو وہ دونوں ھنسنے لگے۔

"بہت خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بور نہ کریں گے۔"

اور ہوا بھی یہی۔ ہم بار کے خنک ماحول سے باہر نکلے۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سڑک پر شدید گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

شام کی گرمی انسان کی فطرت کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور اس کا ہم پر بھی ردعمل ہوا۔ بار سے باہر نکلے ہوئے دس ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم نے خود کو اپنے قابو سے باہر محسوس کیا۔ دونوں زور زور سے قہقہے لگانے لگے اور ہمارا رویہ قدر جارحانہ ہو گیا۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ ہم دونوں نے خود کو خالی اسٹیڈیم میں پایا۔

واصلیئف نے گھاس پر بیٹھ کے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں بڑے مقابلے جیتنے والے کھلاڑیوں کو دئے جانے والے کئی نقرئی اور نیم طلائی کپ رکھے ہوئے تھے۔

"میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ کس تیزی سے دوڑتا ہوں۔ اچھا بتاؤ، تمہیں کبھی اور بھی ایسا تماشا دیکھنے کا موقع ملا ہے؟" واصلیئف نے پوچھا۔ اس کی نظریں کپوں پہ جم کے رہ گئیں اور ان سے پریشانی جھلکنے لگی۔

"کبھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ میں اسپورٹس سے ہمیشہ ہی دور رہا ہوں" میں نے اعتراف کیا۔

اتنے میں جانے کیوں واصلیئف مضطرب سا ہو گیا۔ کبھی ایک کپ باہر نکالتا، کبھی دوسرا جیسے جانتا ہی نہ ہو کہ کون سا کپ تلاش کر رہا ہے۔

آخرکار اس نے ایک کپ منتخب کرکے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"جاکے دوڑ ختم ہونے کی جگہ پر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کپ اپنے ہاتھوں میں لئے میرا انتظار کرتے رہو..."

مجھے یہ بہت پسند آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ دوڑتا کیسے ہے۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ میں ریفری کا کردار ادا کروں گا۔ واصلیئف کے پاس اسٹاپ واچ بھی تھی۔

## ۱۸

"میرے معاملے کی قیمت گندے انڈے کی قیمت سے بھی کم ہے" موسائیف نے کہنا شروع کیا۔ "ایسے معمولی اور پٹے ہوئے معاملے کی عدالت میں اور کوئی مثال نہ ملےگی۔ آپ کو یہ معاملہ ناقابل یقین معلوم ہوگا۔

انسٹی‌ٹیوٹ میں تعلیم کے زمانے میں میرا ایک دوست تھا۔ وہ بھی انجینیر ہی تھا۔ فرض کر لیجئے کہ اس کا نام واصلیئف تھا۔ وہ شہر میں انجینیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ لمبی دوڑ کے اسپورٹس‌مین کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میرا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا اور ہلکی شراب پینے کے لئے ایک چھوٹے سے بار چلا گیا۔ وہاں جانے کا ایک سبب اور بھی تھا، وہ یہ کہ اس کے اندر ٹھنڈک رہتی تھی۔

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ‌کے ہلکی شراب پینے سے نشہ وشہ کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن باہر نکلنے پر تیز دھوپ اتنا زیادہ متاثر کرتی ہے کہ دماغ چل جاتا ہے...

اسی وجہ سے میں باہر نکلتے ہوئے ڈر رہا تھا اور بار میں بیٹھا شام ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میرا وہ دوست بھی وہیں آ گیا۔ اس سے آخری ملاقات پانچ چھ سال قبل ہوئی تھی لیکن اخبارات سے کھیل کے میدان میں اس کی کامیابیوں کی اطلاعات ملتی رہی تھیں۔

وہ کھلاڑیوں کا چھوٹا سا سوٹ‌کیس لئے اندر آیا۔ اور بیٹھ‌کے ہلکی شراب منگائی۔ وہ بھی میری ہی طرح بجھا بجھا اور اداس سا نظر آ رہا تھا اور اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہونے کے باوجود ہم دونوں زیادہ‌تر وقت خاموش ہی بیٹھے رہے۔

"کیا تم مجھے گھر تک پہنچا سکتے ہو؟ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے..." واصلیئف نے اچانک کہا۔

"میں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں" میں نے نیم‌مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔

ان کپوں کو ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑتے ہوئے ڈر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد جب میں نے محسوس کیا کہ میری طبیعت سنبھل چکی ہے، میں پانی سے باہر نکل آیا لیکن اس وقت تک واصلیئف اپنی جگہ پر سو چکا تھا۔

میں اسے جگانے ہی والا تھا لیکن سوتے ہوئے آدمی کو دیکھ‌کر مجھے بھی سونے کا خیال آیا اور اپنے دوست کے پاس بیٹھ‌کے اونگھ گیا۔

ہم دونوں بیک وقت بیدار ہوئے۔ شراب کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ گرمی بھی کم ہو چکی تھی۔

"میں گھر واپس جانا نہیں چاھتا" واصلیئف نے اداسی سے کہا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت اب بھی خراب ہے اور میں نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس وقت میرا گھر خالی تھا کیونکہ میری بیوی بچی کو ساتھ لے‌کے کسی رشتے‌دار کے یہاں جا چکی تھیں۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ہمیں پتہ چلا کہ ہم نے سوٹ‌کیس کو کہیں کھو دیا ہے۔ اس واقعے سے ہم اتنے زیادہ اداس اور بدحواس ہو گئے کہ کسی طرح یاد ہی نہ کر سکے کہ سوٹ‌کیس کو کہاں چھوڑ آئے ہیں۔

بعد میں عدالت میں ایک گواہ نے بتایا کہ جس وقت میں جھیل میں نہا رہا تھا اسی وقت واصلئیف نے تمام کپ پانی میں پھینک دئے تھے لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی نہ تھی۔ غوطہ‌خوروں نے جھیل کی تہ چھان ڈالی مگر ایک کپ بھی ان کے ھاتھ نہ لگا۔

یوں وہ سوٹ‌کیس کھو گیا۔ میں نے اس نقصان کو آسانی سے برداشت کر لیا ہوتا اگر واصلیئف اچانک اعتراف نہ کرتا کہ وہ کپ دراصل ایک مشہور اسپورٹس‌مین کے تھے جن کو واصلیئف نے اسی روز صبح کو ایک ضیافت کے دوران چرا لیا تھا۔

"اوہ میرے خدا! آخر تم نے یہ کیا کیا؟" میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"مسئلے پر کافی غور وخوض کیا جائے تو پتہ چلےگا کہ مجھے ان کپوں کو رکھنے کا پورا حق ہے" واصلیئف نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

میں کپ کو ھاتھ میں لئے ہوئے دوڑ ختم ہونے کے خط کے پاس کھڑا ہو گیا اور واصلیئف نے اسٹیڈیم کے دوسرے کنارے پر پہنچ کے دوڑنا شروع کیا۔ اس نے شدید گرمی کے باوجود پانچ سو میٹر دوڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جہاں تک میرا تعلق تھا، چند سکنڈ کے بعد ہی اپنے دوست کی اس دوڑ سے میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گرمی نے مجھے بالکل بدحواس کر دیا تھا۔ اسی لئے مجھے ایسا لگا کہ واصلیئف دوڑ پوری کرنے میں زیادہ وقت لگا رہا ہے۔

بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ اس نے پانچ سو میٹر کا فاصلہ چند سکنڈوں ہی میں پورا کرکے اپنے دیرینہ حریف سعاکوف کا جو ان دنوں اس دوڑ میں جمہوریہ کا چمپین تھا، ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے مقدمے کے باعث اس کی اس کامیابی کو نظرانداز کر دیا گیا۔

دوڑ کے خاتمے کے نشان پر پہنچتے ہی واصلیئف نے کپ کو میرے ھاتھوں سے کچھ ایسی تیزی کے ساتھ چھین لیا جیسے وہ کسی پر اپنا غصہ اتارنا چاھتا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ گھاس پر ڈھیر ہو گیا اور زور زور سے ھانپنے لگا جیسے بہت زیادہ محنت کی ہو۔

"بھاڑ میں جائے! سب کچھ اتفاق سے ہوتا ہے!.. اتفاق سے اس وقت ہو گیا!" واصلیئف نے جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا، لیٹے لیٹے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میں نے سوچا کہ اس کی یہ حیرت‌انگیز حالت شدید گرمی، شراب اور خراب موڈ کا نتیجہ ہے۔

اس خیال سے کہ میری اور خود اس کی بھی طبیعت خراب ہو رہی تھی، میں نے اس سے کہا کہ آؤ، پارک میں چل کے جھیل میں نہائیں۔

"تمھیں میری دوڑ اچھی نہیں لگی کیا؟ خیر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دوسروں کی بھی تو یہی رائے ہے..." اس نے کہا۔

پارک پہنچ کے میں تو جھیل میں نہانے لگا اور وہ اپنے کپوں‌والے سوٹ‌کیس کے ساتھ کنارے پر بیٹھا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے

لیکن میں اسے چور نہیں سمجھتا جیسا کہ جج نے سمجھا۔
میں واصلیئف کے جذبات و احساسات کا اسی طرح جائزہ لینا چاھتا تھا جس طرح خود اس نے سعاکوف کا جائزہ لیا تھا۔ دراصل واصلیئف کے اچھے جذبات کو اس کے برے جذبات سے الگ کرنے کے لئے یہ جائزہ ضروری تھا۔ میں اسے کچھ سمجھانے بجھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ھی ھے نیک کام کے لئے قول معجزہ ثابت ھو سکتا ھے۔ آپ کو یہ کہاوت تو یاد ھی ھوگی کہ "پہلے قول پیدا ھوا پھر..."

میں نے واصلیئف سے کہا کہ جو شخص کمال حاصل کرنا چاھتا ھے اسے سب سے پہلے برے جذبات و احساسات سے نجات حاصل کرنی چاھئے۔

جہاں تک میرے دوست کا تعلق ھے تو وہ زیادہ‌تر ایسے ھی جذبات و احساسات کا حامل تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مقابلوں میں اپنے حریف پر فتح پانے کی اس کی کوششیں دراصل حسد اور خودغرضی کی آئینہ‌دار ھیں اور اس قسم کے جذبات تنگ‌نظر لوگوں ھی میں پائے جاتے ھیں۔

میں نے واصلیئف کے اتفاق کے نظریے کے متعلق بھی اظہارخیال کیا اور اس سے کہا کہ ھر اتفاق کا کوئی جواز بھی ھوتا ھے۔ اسے محض اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ایک آدمی، خاص طور سے ایک اسپورٹس‌مین نے اسے متعدد بار شکست دی۔ اس صورت میں تو اتفاق کی بات سراسر غلطفہمی اور اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کے سوا اور کچھ بھی نہیں ھو سکتی۔

"اچھا تو بتاؤ نا کہ آخر اسے مجھ پر سبقت کیوں حاصل ھے؟" واصلیئف چیخ اٹھا۔ "تم بڑے ایماندار ھو لیکن کیا تم سعاکوف کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کر سکتے ھو؟ یا پھر یہ کہ جیتنےوالوں کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا؟"

"کیوں نہیں۔ ان لوگوں کے متعلق اندازہ لگانا بہت دشوار ھوتا ھے۔ لیکن میں سعاکوف کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی تو معلوم نہیں۔"

میں بیٹھا اسی طرح واصلیئف کے ھوش درست کرنے کی کوشش

وہ رات ھمارے لئے بڑی بھیانک ثابت ھوئی۔

واصلیئف کی باتوں سے مجھے اندازہ ھوا کہ وہ عرصے سے اس کھلاڑی سے نفرت کرتا تھا اور اس کے ایک ایک اقدام کا گھری نگاھوں سے جائزہ لیتا رھا تھا۔

یہ کھلاڑی جس کا نام میں نے سعاکوف بتایا ھے، واصلیئف کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے گزشتہ پانچ مقابلے جیتے تھے۔ ان میں اول آیا تھا اور کپ حاصل کئے تھے۔

یہ سب آخر تھا کیا؟

واصلیئف نے سعاکوف کی جسمانی خصوصیات، دوڑنے کی مشقوں کے طریقوں، قوت برداشت، قوت ارادی، وزن کی تبدیلی، حالات زندگی، مشاغل اور اس کی شخصیت کی ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک کا مطالعہ کیا تھا جن میں والدین سے ملنےوالی بیماریاں بھی شامل تھیں۔ اس سب کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ سعاکوف سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ھے اور جہاں تک بیماریوں کا تعلق تھا سعاکوف کو دو بیماریاں اس سے زائد ھی ھوئی تھیں۔

کہا جا سکتا ھے کہ اس نے سعاکوف کو جیسے خوردبین سے دیکھ لیا ھو۔ اس کے باوجود مقابلوں میں کامیابی اسے نہیں، سعاکوف کو حاصل ھوتی تھی، محض حسن اتفاق تھا یا اتفاقات کا سلسلہ؟

آخر وہ کہاں پھنس کے رہ گیا تھا؟ نمبر ایک اسپورٹس‌مین بن جانے کے لئے آخر اسے اب اور کیا کرنا چاھئے تھا؟

اس واقعے سے ایک روز قبل سعاکوف نے دارالحکومت سے آکے ایک اور مقابلہ جیتا، ایک اور کپ حاصل کیا۔ اس کی عادت تھی کہ جہاں بھی جاتا اپنے سارے کپ ساتھ رکھتا۔ چنانچہ اس کی کامیابی پر جو اعزازی ضیافت منعقد ھوئی اس میں بھی وہ اپنے کپوں کو سوٹ‌کیس میں رکھ‌کے ساتھ لایا۔

واصلیئف اس کے پاس بیٹھا ھوا اس کمبخت سوٹ‌کیس کو دیکھ رھا تھا۔ سعاکوف ذرا دیر کے لئے کمرے سے باھر نکلا تو میرے دوست نے سوٹ‌کیس اٹھایا اور وھاں سے چل دیا۔ وہ اپنے حریف کو ان اعزازوں سے محروم کرکے انتقام لینا چاھتا تھا۔

میں اپنے دوست کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رھا تھا پھر بھی مجھے اس کا یہ اقدام اچھا نہ لگا اور وہ نگاھوں سے گر گیا۔

بےشک یہ میری غلطی تھی کہ اس رات کو مجھے اس بات کا خیال ھی نہ آیا۔

میلیشیا کے لوگ نہ آ گئے ھوتے تو صبح کو جانے میں کیا کرتا۔ ممکن تھا کہ ھماری گفتگو جاری رھتی یا پھر یہ کہ مجھے گفتگو کے لاحاصل ھونے کا احساس ھو جاتا اور میں واصلیئف کو رخصت کر دیتا... لیکن مجھے پورا یقین ھے کہ گفتگو لاحاصل نہ ثابت ھوتی۔ جلد یا بہ‌دیر وہ میری باتوں کو مان ھی لیتا۔ آخر ولی‌بابا، آپ نے تو میری قوت برداشت اور ثابت‌قدمی ھی کی بدولت یہ تسلیم کیا نا کہ کھانے کا راشن کم کرنے اور مجھے مشتعل کرنے کے لئے میرے پیچھے اپنا ایک آدمی لگانے سے متعلق آپ کی کارروائی جائز نہیں تھی؟..

میرا خیال ھے کہ ھم لوگ ایک دوسرے سے دلچسپی نہ رکھیں تو بہت جلد نیک جذبات سے محروم ھو جائیں۔ آپ اس خیال سے متعق ھیں نا، ولی‌بابا؟.."

## ۱۹

ولی‌بابا خاموشی سے اٹھکر باھر چلا آیا۔ دیر تک قلعے کے اندرونی برآمدوں میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا رھا، خاموش صحن کو دیکھتا رھا۔

ھاں، قیدی سے متعلق اس کا رویہ اب ایک نیا، زیادہ ڈرامائی رخ اختیار کرتا جا رھا تھا۔ کیا یہ ممکن ھے کہ وہ موسائیف کی ان باتوں پر اعتماد کر لے؟ بھول جائے کہ اس نے قیدخانے سے فرار کیا تھا؟ اگر اس نے سب کچھ سچ سچ بتایا ھے، کسی ایسی بات کو راز میں نہیں رکھا جو اس کے خلاف جا سکے تو یہی نتیجہ برآمد ھوتا ھے کہ اسے بلاوجہ سزا دی گئی تھی۔

لیکن ولی‌بابا کر ھی کیا سکتا ھے جبکہ خود جج نے موسائیف کو مجرم قرار دیا تھا؟ بہت ممکن ھے جج نے اس حقیقت کو نظرانداز کرکے فیصلہ سنایا ھو کہ موسائیف نے کپ چرانےوالے اس کھلاڑی کو نیک کام کی خاطر پناہ دی تھی؟

ولی‌بابا ھمیشہ اس خیال پر قائم رھا تھا کہ عدالت کی عظمت اور

کرتا رہا۔ میں تلخ حقائق کا تذکرہ کر رہا تھا تاکہ وہ اپنے اقدام پر کچھ غور و خوض کر سکے۔

اتنے میں پو پھٹی۔ دروازے پر دستک سنائی دی اور میلیشیا کے لوگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کمرے میں داخل ہو گئے۔

عدالت میں ہمیں پتہ چلا کہ جس وقت ہم کپوں کو لئے اسٹیڈیم میں دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے، جھیل میں آرام سے تیر رہے تھے اس وقت شہر میں، اچھی خاصی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دن دھاڑے ممتاز کھلاڑی کی کامیابیوں کے کپ چرا لینا کوئی مذاق تھوڑی تھا!

آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام مشہور شخصیتوں، خاص طور سے اداکاروں اور کھلاڑیوں کے شیدائیوں کا حلقہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان شیدائیوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں، غصے کا اظہار کیا اور ان باتوں سے جج بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ نہ ہوا ہوتا تو واصلیئف کو ایک سال قید سے زائد کی سزا نہ ملتی اور مجھے تو قیدخانے میں بند کیا ہی نہ گیا ہوتا۔

لیکن چاروں طرف لوگ مطالبہ کر رہے تھے کہ چور اور اسے پناہ دینےوالے کو قانون کے تحت سخت سزا دی جائے۔ ہمارا مقامی اخبار تو اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اس نے مقدمے کی سماعت کے آغاز سے قبل ہی ایک مضمون شائع کرکے ہم پر الزامات لگائے اور کھلاڑیوں اور ان کے مداحوں کی طرف سے مطالبہ کیا کہ شرابی گنڈوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں واصلیئف کو چور نہیں تصور کر رہا تھا۔ میں اسے ایک ایسا شخص تصور کر رہا تھا جس کا دل الجھے ہوئے جذبات سے بھرا ہوا تھا اور جسے ان جذبات سے نجات حاصل کرنے میں مدد کی ضرورت تھی۔

ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی سادگی کی بنا پر واصلیئف کے متعلق یہ رائے قائم کی ہو۔

مجھے کیا خبر تھی کہ مجرم واصلیئف سے باتیں کرنے کے بجائے جیسا کہ عدالت میں جج نے کہا تھا، اسے میلیشیا کے قریب‌ترین دفتر میں پہنچا دینا چاہئے تھا نیز یہ کہ اسے سمجھانے بجھانے کا کام میرا نہیں بلکہ اخلاقی اصلاح کی محنت کے قیدخانے کے کارکنوں کا ہے۔

"لعنت ہو اس دن پر!" ولی‌بابا کو پہلی بار اس خیال سے مایوسی ہوئی کہ ان لوگوں نے مفرور قیدیوں کو پہاڑ پر پکڑ لیا تھا۔ اس دن کے یاد آتے ہی وہ اداس ہو گیا۔

پہلے سب کچھ آسان تھا، کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جو ولی‌بابا کی پریشانی کا باعث ہوتی: وہ نگراں چوکی پر پہرا دیتا تھا، رات کو ڈومینو کھیلتا تھا اور وقت گزر رہا تھا۔ قیدخانہ دوسری جگہ منتقل ہو گیا اور پل کی تعمیر سے متعلق کام شروع ہوا تب بھی ایسی کوئی پریشانی نہ تھی جیسی پریشانی میں اب وہ مبتلا تھا۔

ولی‌بابا چپ چاپ برجی کے قریب گیا جہاں بیٹھا ہوا موسائیف دریا کو جھانک رہا تھا... وہ دیر تک خاموشی سے اسی جگہ کے چکر کاٹتا رہا، پھر اس نے کہا:

"میں نے تمہاری ساری باتیں سنیں... مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے میں تم بےقصور تھے۔"

ولی‌بابا نے جو کچھ کہا اس سے خود ہی خوف‌زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس میں موسائیف کی نگاہوں کی تاب لانے کی سکت باقی نہ تھی۔ آخرکار وہ مڑکے سیڑھی سے نیچے اترنے لگا۔

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چھپا بیٹھا رہا۔ نہ اپنے ساتھیوں سے ملنے کی کوشش کی، نہ قیدیوں سے۔ کم‌گو ولی‌بابا اداس خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

قالی‌خان نے جسے اس نے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دی تھی، دیکھا کہ وہ ایک ہی دن کے اندر جیسے کیسے دبلا سا ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ قیدیوں کے چہروں کی طرح بھورا ہو گیا تھا۔

"آخر بات کیا ہے؟" صادق قالی‌خان نے اپنے دوست سے اس کی اس حالت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ولی‌بابا نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے چلے جانے کی ہدایت کی۔

ایسا لگتا تھا کہ سنتریوں کے سربراہ نے اپنی مرضی سے خود کو کمرے کے اندر بند کر لیا ہے جبکہ مجرم آزادی کے ساتھ قلعے میں ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔

دراصل ولی‌بابا، موسائیف کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کیونکہ اس نے موسائیف کو بےقصور قرار دیا تھا جس کے بعد اب اسے رہا

اس کے ججوں کا وقار غیرمتنازع ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا خیال ہوتا بھی تو کیسے کیونکہ قیدخانے میں اس کے کام کے تیس سال عدالت اور قانون ہی سے تو وابستہ تھے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جج غلط فیصلہ کر سکتا ہے اور قانون جس کا سہارا جج لیتا ہے، انسان کی فطری پیچیدگیوں اور ملزم کے دل کی واضح اور پوشیدہ خواہشوں کا خیال ہمیشہ نہیں رکھ سکتا۔

اچانک اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی تھی جس کے اقدام کو قانونی طور پر تو جرم قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اسے دل کی گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقدام اخلاق اور انسان‌دوستی پر مبنی تھا۔ یہ کیسی متضاد بات ہے! ان خیالات نے ولی‌بابا کو مغموم کر دیا۔

پھر اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ شاید موسائیف کی باتیں سچ نہیں تھیں لیکن اسے خیال آیا کہ قیدی کو جھوٹ بول‌کے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ ولی‌بابا نہ جج ہے، نہ قیدخانے کا سربراہ۔ ظاہر ہے کہ وہ انصاف کو بحال نہیں کر سکتا۔ ولی‌بابا تو ایک سیدھا سادا آدمی ہے، پل کا معمار جس نے حالات کے تقاضے سے مجبور ہوکر موسائیف کو قلعے میں بند کیا ہے اور اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ قیدی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ولی‌بابا اس کی سزا کم کر دےگا یا اسے معاف کر دےگا کیونکہ اسے بخوبی علم ہے کہ وہ ایک غیرسرکاری فرد ہے۔ پھر ولی‌بابا نے یاد کرنا شروع کیا: "اس نے مجھے اپنا رازدار بنانے میں خاصی تاخیر برتی۔ صرف اس وقت مجھے سب کچھ بتایا جب اسے معلوم ہو گیا کہ دراصل میں ہوں کون۔ میں ٹھہرا ایک عام آدمی۔ اس کے لئے کر ہی کیا سکتا ہوں؟ موسائیف کی سزا منسوخ کرنے کا کون سا اختیار یا ذریعہ بھلا میرے پاس ہے؟.. اب یہ واضح ہو گیا کہ وہ اتنی ثابت‌قدمی کے ساتھ فرار ہونے کی تیاری کیوں کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے آزادی کا حق حاصل ہے۔ جنونی کہیں کا!.."

کیا جواب دینا چاہئے؟ ولی‌بابا جانتا تھا کہ موسائیف اس کے جواب کا منتظر ہے۔ اسی لئے اس نے یہ سارا قصہ سنایا تھا۔

ریگستان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس کی طاقت نے طوفان کی شکل اختیار کرکے انسانوں اور جانوروں کو خوف‌زدہ کر دیا۔

تیز ہواؤں نے معماروں کے زیادہ‌تر خیمے اکھاڑ دئے۔ کشتیوں کو حرکت میں لائیں اور دریا کے دھارے میں بہا لے گئیں۔ دریا نے ریت اور سطح پر تیرتے ہوئے تیل کے دائروں کو اپنے دامن میں سمیٹا اور باڑھ کا پانی کناروں سے باھر پھوٹ نکلا۔ صرف زیر تعمیر پل کے آھنی ستون ھی اتنے مضبوط ثابت ھوئے کہ طوفان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

کنارے پر زیادہ‌تر چیزوں کو تباہ و برباد کرکے طوفان قلعے تک پہنچا۔ اس کی طاقت سے قلعے کی فصیل کے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا جو بہار کی بارش سے پھول گیا تھا، اکھڑکے نیچے گر پڑا اور فصیل کے پتھر اور چھپکلیوں کے بل دکھائی دینے لگے۔

خالی برجیوں کے قریب پہنچ‌کے طوفان آھنی سلاخوں سے کھیلنے لگا جیسے یہ سلاخیں ارگن باجے ھوں۔ پھر اپنا کھیل ختم کرتے ھوئے اس نے ھر شے کو زرد ریت سے ڈھک دیا۔

برجیوں سے ریت نیچے آکے سیڑھیوں، احاطوں اور اندرونی برآمدوں پر پھیل گئی۔ دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں، ھواؤں کے جھونکے چھت پر پہنچنے کے دروازے سے تاریک برآمدے میں آئے اور قیدخانے کی بیرکوں کی بو اپنے ساتھ لےکر باھر نکل گئے۔

قدرت کا یہ کھیل چند لمحات تک جاری رھا۔ پھر طوفان زمین سے درختوں کی پتیوں، ککروندے کے پھولوں کے روئیں اور خاردار گھاس کو آسمان تک اڑاتا ھوا کسی دوسری سمت بھاگ کھڑا ھوا۔

سنتری اور قیدی جو قلعے کے وسطی حصے میں بیٹھے ھوئے تھے، طوفان سے محفوظ رھے۔

وہ باھر نکلے تو قلعے کو پہچان ھی نہ سکے۔ ھر جگہ ریت ھی ریت تھی، پتھر ھی پتھر۔ انھیں قلعہ عجب بےڈھنگا اور ننگا سا نظر آیا، ایسا لگتا تھا جیسے وہ غائب ھو جانےوالے کسی قدیم شہر کا کوئی حصہ ھو جسے ریت نے کھنڈر میں تبدیل کر دیا ھے۔

"کیا ان لوگوں کو قلعے کی صفائی پر مجبور کریں؟" قالی‌خان نے ولی‌بابا کے پاس آکے پوچھا۔

کر دینا چاھئے تھا۔ اس کا مطلب تو بہرحال یہی تھا کہ اسے رھا کر دیا جائے اور جہاں اس کا جی چاھے چلا جائے۔

لیکن کیا ایسا کرنا ضروری ھے؟

اگر وہ صحیح معنوں میں رھائی کا مستحق ھی ھے تو اسے ولی‌بابا نہیں بلکہ وہ جج رھا کر سکتا ھے جس نے قید کی سزا دی تھی۔

"میں کوئی عہدیدار تھوڑی ھوں۔ مجھے نہ کسی کو سزا دینے کا حق ھے، نہ ھی کسی کی سزا کو منسوخ کرنے کا۔ میں تو بس پل کا ایک معمار ھوں..."

یہ سارے خیالات اس کے دل میں آتے تھے لیکن وہ موسائیف کا سامنا کرنے کی ھمت نہیں کر پا رھا تھا۔ اسے ایسا لگ رھا تھا کہ موسائیف اسے سمجھ نہ سکے گا۔

لیکن موسائیف سب کچھ سمجھ رھا تھا۔ اسے ولی بابا کا کردار اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا اس کے بس میں ھے اور کیا نہیں۔ اسی لئے وہ ولی بابا کے فیصلے کا انتظار نہیں کر رھا تھا۔ ولی‌بابا کو اس نے اپنے متعلق ساری تفصیلات محض اس لئے بتائی تھیں کہ اسے انہیں جاننے کی فکر تھی۔ موسائیف نے سوچا تک نہیں تھا کہ ولی‌بابا اسے بےقصور تسلیم کر لے گا۔

ولی‌بابا نے جب اس سے کہا تھا کہ تم بےقصور معلوم ھوتے ھو تو موسائیف پر اس کا صرف اتنا سا رد عمل ھوا تھا کہ اس کی آنکھیں شکرگزار معلوم ھونے لگی تھیں۔ ولی‌بابا نے اگر یہ فیصلہ کیا ھوتا کہ موسائیف کو قیدخانے کے سنتریوں کے حوالے کرنے کے بجائے رھا کر دیا جائے تو موسائیف اس قسم کی آزادی کو قبول کرنے پر کبھی بھی تیار نہ ھوتا کیونکہ اس کے نتیجے میں بوڑھے کے لئے مشکلات اٹھ کھڑی ھوتیں...

## ۲۰

اس آخری صبح کو اچانک ھوائیں چلنے لگیں۔ روشن دن زرد سا پڑ گیا، ایسا لگتا تھا جیسے ریت کے بادلوں نے سورج کو ڈھک لیا ھو۔



16 1493

ولی‌بابا اپنی ٹیم کے لوگوں کے ساتھ سنتریوں سے ملنے آیا کیونکہ وہ نہیں چاھتا تھا کہ قیدیوں کو واپس کرنے میں تاخیر ھو جائے۔

قیدخانے کے سربراہ نے اسے دیکھا تو مصافحے کے لئے ھاتھ بڑھاتے ھوئے کہا:

"ارے، آپ کہاں غائب ھو گئے تھے، ولی بابا؟" پھر اس نے ولی بابا کے ساتھیوں کی طرف دیکھ‌کے پوچھا: "ارے، قیدی کہاں ھیں؟"

ولی‌بابا نے یہ محسوس کرکے کہ سربراہ ریت سے ڈھکے ھوئے قلعے سے جلد از جلد چلے جانے کا ارادہ رکھتا ھے، قالی‌خان کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لایا جائے۔

سربراہ نے جیب سے کاغذ نکال‌کے پوچھا:

"تینوں کے تینوں ھیں نا؟ نوروف، موسائیف، پارپیئف..."

"جی ھاں، تینوں یہیں ھیں" ولی‌بابا نے کہا اور برجیوں کی طرف دیکھا۔

سربراہ نے بھی برجیوں کی طرف دیکھا اور اسے سنتری کی نگرانی میں لائے جانےوالے قیدی دکھائی دئے۔

"یہ رھے وہ لوگ، ولی‌بابا۔ نیچے... انہیں ھیلی‌کاپٹر میں بٹھا دو" اس نے سنتریوں کو حکم دیا۔

پھر وہ جلدی جلدی بکس سے تحفے نکالنے لگا۔

"یہ آپ کے لئے ھیں: دس گھڑیاں۔ دسوں پر الگ الگ آپ لوگوں کے نام لکھے ھیں۔ یہ تحفے آپ لوگوں کی مثالی خدمت کے سلسلے میں ھیں..."

ولی‌بابا کے پاس اور بھی چار تحفے تھے جو اس سے قبل مثالی خدمت کے سلسلے میں ملے تھے۔ اس دوران قیدی ھیلی‌کاپٹر میں بیٹھ گئے اور اس کا دروازہ بند ھو گیا۔

سربراہ نے رک‌کے کہا:

"اچھا تو سب کچھ کر چکا نا میں؟ کچھ بھولا تو نہیں؟ قیدیوں کو دیکھا، تحفے دے دئے... اور کیا؟ ھاں، یاد آ گیا!"

وہ ولی بابا کے پاس گیا اور اس کا ھاتھ تھامتے ھوئے کہا:

"سنئے ولی بابا، کیا آپ قیدخانے میں اپنے کام پر واپس آنا چاھتے ھیں؟ میں آپ کی مدد کر سکتا ھوں..."

"ابھی نہیں" ولی‌بابا نے ھاتھ ھلاتے ھوئے کہا۔ پھر اس نے قالی‌خان کے دھول سے اٹے ھوئے چھرے کو دیکھتے ھوئے اس سے کہا:
"ذرا اپنی حالت تو ٹھیک کر لو۔ آج تو قیدخانے کے عہدیدار ضرور ھی آئیں گے۔"

اس کی پیشین‌گوئی اس بار بھی صحیح ثابت ھوئی۔ سنتریوں اور قیدیوں کے اپنے کپڑے جھاڑکے صاف کرتے اور منھ ھاتھ دھوتے ھی دریا کی طرف سے ھیلی‌کاپٹر کا شور سنائی دیا۔

معماروں نے جو خیموں کی مرمت میں مصروف تھے، سوچا کہ شہری عہدیدار طوفان کے نقصانات کا جائزہ لینے کے لئے آئے ھیں، اپنے خود اتار اتارکے ھلانے اور ھاتھوں سے اشارے کرنے لگے تاکہ ھیلی‌کاپٹر کو اترنے کی جگہ معلوم ھو سکے۔

لیکن ھیلی‌کاپٹر کچھ نیچے آکے پراسرار قعلے کی طرف اڑ گیا۔ اس نے برجیوں کے اوپر ایک چکر لگایا اور پھر قلعے کے احاطے میں نرم ریت پر اتر گیا۔ ولی بابا نے کھڑکی سے جھانک‌کے دیکھا کہ ھیلی‌کاپٹر کا دروازہ کھلا اور دو مسلح سنتری اور ان کا سربراہ جو پستول لئے ھوئے تھا، باھر نکلے۔

قیدخانے کا سربراہ خاموش قلعے کو حیرت سے دیکھ رھا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رھا ھو کہ ولی بابا ان لوگوں کا استقبال کیوں نہیں کر رھا ھے۔

سربراہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے ایک سنتری کو ولی بابا کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔

ولی بابا کو اس وقت صرف ایک بات کی فکر تھی اور وہ یہ کہ اس کی ٹیم کا رکن نوری جسے اس نے ھفتہ بھر پہلے قیدخانے کو بھیجا تھا، آخر کہاں ھے۔

اتنے میں نوری لڑکھڑاتے قدموں سے ھیلی‌کاپٹر سے باھر نکل آیا۔ پرواز کے دوران اس کی طبیعت خراب ھو گئی تھی اور وہ کمزوری محسوس کرکے ریت پر بیٹھ گیا تاکہ ذرا دم لے سکے۔

سربراہ نے اس کے قریب پہنچ‌کے کچھ کہا۔ شاید وہ چاھتا تھا کہ نوری بھی ولی‌بابا کو تلاش کرنے کے لئے سنتری کے ساتھ جائے لیکن نوری کے پیروں میں کھڑے ھونے کی سکت نہیں تھی اور اس نے ھاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ نہیں جا سکتا۔

ولی‌بابا اور اس کے ساتھی دیر تک اسی طرح کھڑے دیکھتے رہے اور جب ہیلی‌کاپٹر ان کی نگاھوں سے اوجھل ھو گیا تو وہ نیچے اترے۔

"قلعے کی صفائی کر دینا" اس نے اپنے ساتھیوں کو رخصت کرتے وقت ھدایت کی۔

شام کو جب قلعہ صاف ھو چکا تھا تو وہ لوگ اپنے نئے کام پر واپس جانے کے لئے تاریک برآمدوں سے گزرے۔

پھاٹک سے باھر نکل‌کر انھوں نے تین کنجیوں سے اس کے قفل بند کر دئے۔

ولی‌بابا نے مڑکے قلعے کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری جیسے وہ اسے آخری بار دیکھ رھا ھو۔ پھر اس نے کہا:

"چلو، قصہ ختم..."

جی ھاں، وہ سب ختم ھو گیا۔ قلعے کی نئی زندگی شروع ھو گئی۔ قلعے کی تقدیر میں اگر یہی لکھا ھے کہ وہ اپنی برجیوں سمیت زمین کے اندر جاکے غائب ھو جائے تو یوں ھی سہی۔ غائب ھو جانے کے بعد بھی برسوں تک اس کی یاد زندہ رھےگی!..

یہ سوال بالکل اچانک کیا گیا تھا پھر بھی ولی‌بابا شش و پنج میں نہیں پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے اس لئے اس نے فوراً ہی جواب دے دیا:

"جی نہیں، شکریہ کامریڈ سربراہ۔ ہم اب پل کے معمار ہیں۔ ماضی بیت چکا ہے..."

ولی‌بابا نے یہ کہنے کے بعد سوچا کہ اب وہ پہلے جیسا سنتری نہیں بن سکتا۔ اس کا جوش ختم ہو چکا ہے اور اس کام کے لئے جوش کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

"خیر، جیسی آپ کی مرضی" سربراہ نے اداسی کے ساتھ کہا۔ "لیکن ہمارے یہاں آپ کو ہر وقت جگہ مل سکتی ہے۔ آپ تو بہت ہی اچھے پہریدار ہیں!"

"شکریہ" ولی‌بابا نے اس اعتماد کے لئے جس کا اظہار سربراہ نے کیا تھا، اظہار تشکر کے طور پر کہا۔ سربراہ ہیلی‌کاپٹر کے پاس جا رہا تھا اور ولی‌بابا سوچ رہا تھا کہ اسے سربراہ کو یہ سمجھانے کے لئے کہ موسائیف پہلے والے معاملے میں مجرم نہیں تھا، کیا کہنا چاھئے۔

ولی‌بابا یہ دیکھ‌کر کہ ہیلی‌کاپٹر کی کھڑکی سے موسائیف اور دونوں دوسرے قیدی اسے جھانک رہے ہیں، ٹھہر گیا اور سربراہ کو ذرا تاخیر کے ساتھ مخاطب کیا:

"آپ سے التماس ہے..." ہیلی‌کاپٹر شور مچانے لگا اور اسے باقی باتیں چیخ چیخ‌کے کہنی پڑیں۔ "مجھے کچھ ایسا لگا ہے کہ ان میں سے ایک قیدی کو بلاوجہ سزا مل گئی ہے۔ سن رہے ہیں نا آپ؟ اس کا کوئی قصور نہیں تھا!.."

"کون سا قیدی؟" اسے سربراہ کی آواز سنائی دی۔

"موسائیف۔ وہ بہت ہی ذی‌علم انجینیر ہے۔ گزارش ہے کہ اس کے معاملے کی جانچ کرا لیجئے..."

"اچھا، دیکھیں گے۔ ضرور تمام باتوں کی جانچ کریں گے۔ اسے فکرمند نہ ہونا چاھئے!" سربراہ نے وعدہ کیا۔

سربراہ کی اس گفتگو سے خوش ہوکے ولی‌بابا سیڑھی پر چڑھا اور اوپر جاکے دیکھنے لگا۔ ہیلی‌کاپٹر برجیوں کے اوپر بلند ہوکے بے‌آب صحرا کی طرف پرواز کر رہا تھا، قلعے سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

## پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔

براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

دارالاشاعت ترقی کی شاخ
۳۰۔ نوائی اسٹریٹ
تاشقند۔ سوویت یونین

Progress Publishers Branch
30, Navoi Street
Tashkent, USSR

اس کتاب میں تیمور پولاتوف کے تین ناولٹ شامل ہیں۔ پہلے ناولٹ کا ہیرو، سات ساله لڑکا مغدی نفرت کے ساتھ، جوش و خروش اور سادگی کے ساتھ پیچیده انسانی تعلقات پر غور کرتا ہے۔ وه ان میں سے بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں پاتا لیکن ان کے متعلق اپنے دلی احساسات سے صحیح اندازه لگا لیتا ہے۔ دوسرا ناولٹ قاری کو معمر مچھیرے قائپ سے متعارف کراتا ہے جو کشتی میں بیٹھکر طوفانی بحیرۂ آرال پر بھٹکتا رہتا ہے۔ تیسرا اور آخری ناولٹ ریگستان میں رہنےوالے ولی بابا کی رومانی سرگزشت ہے۔
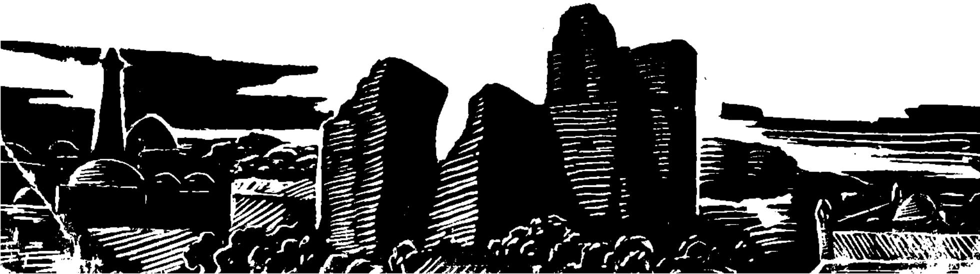
ان ناولٹوں کا مصنف منفرد قسم کا رومانیت‌پسند ہے۔ اس کی تصانیف گہرے ڈرامائی واقعات اور تصادموں سے بھرپور ہیں۔ ان کے ہیرو لوگوں میں اور زندگی میں ایمانداری، توانائی، پاکیزگی اور خوبصورتی کے علمبردار ہیں۔